سہ ماہی **مجلہ بحث ونظر** حیدرآباد

شمارہ نمبر : ۱۰۱—۱۰۳ / ۱—۳	جولائی ۲۰۱۵ — مارچ ۲۰۱۶ء	رمضان — جمادی الاول ۱۴۳۷ھ

مدیر

خالد سیف اللہ رحمانی

زرِ تعاون

اندرون ملک

ایک شمارہ:40روپے

سالانہ:150، بذریعہ رجسٹری:200

سہ سالہ:450، بذریعہ رجسٹری:550

بیرونِ ملک

ایشیائی ممالک کیلئے سالانہ:20امریکی ڈالر

یورپ، امریکہ، افریقہ کے لئے :

سالانہ:30امریکی ڈالر

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

Khalid Saifullah Rahmani, Baitul Hamd, H.No:16-182/1, Quba Colony, Po:Pahadi Shareef, Hyd. A.P 500005, Ph: 9989709240 E-mail: ksrahmani@yahoo.com

چیک / ڈرافٹ پر صرف:"Khalid Saifullah" لکھیں

کمپیوٹر کتابت: محمد نصیر عالم سبیلی ''العالم'' اُردو کمپیوٹرس، حیدرآباد، فون نمبر:9959897621 91+

فہرست مضامین

◆ افتتاحیہ	مدیر	۳
◆ دُعائیہ کلمات	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۵
◆ پیغامِ مسرت	حضرت مولانا محمد سالم قاسمی	٦
◆ تجاویز: سہ روزہ بین الاقوامی سیرت نبوی سیمینار		۷
◆ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے!	خالد سیف اللہ رحمانی	۱۰
◆ کلیدی خطبہ	خالد سیف اللہ رحمانی	۲۳
◆ کیا رسول اللہ ﷺ نے اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا ہے؟	مولانا محمد کلیم صدیقی	۴۰
◆ اسلام کی پُرامن اشاعت — ایک مختصر جائزہ	مولانا محمد عبید اختر رحمانی	۵٦
◆ عہد نبوی ﷺ میں جہاد کا پس منظر	ڈاکٹر اسلام الدین مجاہد	۸۸
◆ جہاد میں رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ	مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی	۱۰۱
◆ پیغمبر اسلام ﷺ اور علماء اہل کتاب	خالد سیف اللہ رحمانی	۱۰۸
◆ پیغمبر اسلام ﷺ اور یہود	خالد سیف اللہ رحمانی	۱۱۸
◆ بتوں کا انہدام اور مذہبی تقدسات کا احترام	مولانا محمد مصطفیٰ عبد القدوس ندوی	۱۵۰
◆ پیغمبر اسلام ﷺ اور کثرتِ ازدواج	مولانا نور الحق رحمانی	۱٦۰
◆ حضرت زینبؓ سے نکاح اور اعدائے اسلام کے بے جا اعتراضات	مفتی شوکت ثنا قاسمی	۱۷۴
◆ حضرت زینبؓ کا نکاح، اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب	مولانا محی الدین غازی	۱۹۳
◆ حضرت عائشہؓ سے کم سنی کے باوجود رسول اکرم ﷺ کا نکاح	مولانا اشرف عباس قاسمی	۲۲۱
◆ خواتین سے متعلق بعض تعلیماتِ نبوی اور غلط فہمیاں	مولانا ولی اللہ مجید قاسمی	۲۳۴
◆ خواتین سے متعلق بعض ارشاداتِ نبوی ﷺ	ڈاکٹر فہیم اختر ندوی	۲۴۷
◆ رُوداد: بین الاقوامی سیرتِ نبوی سیمینار	مولانا محمد عبید اختر رحمانی	۲۵۵

افتتاحیہ

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو اسلام میں بنیادی اہمیت حاصل ہے، آپ ہی کے ذریعہ ہمیں اللہ کی معرفت حاصل ہوئی ہے، آپ ہی کے ذریعہ ہم تک اللہ کی کتاب پہنچی ہے، آپ ہی کے ذریعہ ہم نے آخرت کی حقیقت کو جانا ہے، دنیا میں جو طبقات ہمیشہ سے تذلیل وتحقیر کا شکار تھے، آپ نے ان کو عزت واحترام کا مقام عطا فرمایا، انسانیت کو ذات پات، رنگ ونسل، زبان اور علاقہ کے خانوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور اونچ نیچ کے خود ساختہ معیارات قائم کر لئے گئے تھے، آپ نے اِن غیر منصفانہ تصورات کے بُت کو پاش پاش کر دیا، علم کی شمعیں روشن کیں، بتایا کہ کائنات انسان کی معبود نہیں ہے؛ بلکہ اس کی خادم ہے، اس طرح کائنات کے میں تحقیق وجستجو کا باب کھلا اور سائنس نے ترقی کی؛ اس لئے آپ کی ذات والا صفات نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ پوری انسانیت کے لئے ایک عظیم نعمت اور متاعِ گراں مایہ ہے!

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریکیوں کو روشنی گوارا نہیں ہوتی، اگر تاریکی کا بس چلے تو سورج اور چاند کے چراغ کو بھی بجھا دے؛ اسی لئے ہمیشہ اہل باطل حق کے خلاف سرگرم رہے ہیں اور جھوٹ بولنے والوں نے سچائی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر بھی حق اور سچائی کے دشمنوں کی طرف سے ہمیشہ ہی بے جا پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا ہے اور اس مقصد کے لئے ایسی ایسی جھوٹی باتیں کہی گئی ہیں، جنھیں سن کر شیطان بھی شرم سار ہو جائے، مستشرقین نے یہاں تک لکھ دیا کہ محمد ﷺ نے لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دی، کعبہ میں ایک بُت تھا —— نعوذ باللہ —— آپ اس کی پرستش کرتے تھے اور اس کا پھیرا لگاتے تھے، آپ جنون کے مریض تھے، وغیرہ وغیرہ، پھر جیسے جیسے علم کی روشنی پھیلتی گئی، دروغ گوئی کے پردے چاک ہوتے گئے، جذبۂ عناد کی آگ تو ٹھنڈی نہیں ہوئی؛ لیکن اعتراضات کے انداز بدل گئے اور آج بھی یہ نامسعود کوششیں جاری ہیں۔

پہلے اس قسم کے اعتراضات مستشرقین کی یا ان سے متأثر لوگوں کی کتابوں یا پی، ایچ، ڈی کے مقالات میں ہوتے تھے اور چند پڑھے لکھے لوگوں تک ان کی رسائی ہوتی تھی؛ لیکن اب سوشل میڈیا کی تیز رفتاری اور وسعت نے اس کو گھر گھر پہنچا دیا ہے اور ہر کچے پکے گھر میں جھوٹ کے یہ بول سُنے جا رہے ہیں، ہندوستان کا مزاج ہمیشہ سے

مقدس مذہبی شخصیتوں کے احترام کا رہا ہے؛ لیکن اب فرقہ پرست عناصر کی دریدہ دہنی نے ہندوستان کی اس روایت کو مجروح کر دیا ہے اور یہاں بھی اس طرح کی باتیں کی جارہی ہیں —— اس پس منظر میں المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد نے مؤرخہ: ۱۱ تا ۱۳ ربجمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ، مطابق: ۲۱ تا ۲۳ رفروری ۲۰۱۶ء کو ایک سہ روزہ بین الاقوامی سیرت نبوی سیمینار منعقد کیا، جس میں چار مرکزی عنوانات کے تحت مقالات پیش کئے گئے، سیمینار کی بنیادی فکر یہ تھی کہ سیرت نبوی کی عصری معنویت کو واضح کیا جائے، سیرتِ طیبہ پر کئے جانے والے اُن اعتراضات کا جواب دیا جائے، جن کو آج کل زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے، اور آپ ﷺ کی عظمت کے تئیں غیر مسلم بھائیوں نے جو اعترافات کئے ہیں ان کو پیش کیا جائے، ان مختلف موضوعات کے احاطہ کے لئے چار مرکزی عناوین کا انتخاب کیا گیا، ان میں پہلا عنوان تھا: ''حیاتِ طیبہ اور معاندین کے اعتراضات'' اس عنوان کے تحت تیرہ مقالات پیش کئے گئے، سہ ماہی 'مجلہ بحث ونظر' کا یہ شمارہ ان ہی مقالات کا مجموعہ ہے۔

مجلہ بحث ونظر بعض قانونی کارروائیوں کی وجہ سے تسلسل کے ساتھ شائع نہیں ہو پا رہا تھا، اللہ کا شکر ہے کہ یہ کارروائی تکمیل کو پہنچی ہے، اب انشاء اللہ تسلسل کے ساتھ اس کی اشاعت عمل میں آئے گی، مناسب سمجھا گیا کہ اس سلسلہ کا آغاز مضامینِ سیرت کے مبارک مجموعہ سے کیا جائے، انشاء اللہ آئندہ شمارہ میں سیرت سیمینار کے بقیہ موضوعات شامل ہوں گے، اس مجموعہ میں افتتاحی اجلاس کا کلیدی خطبہ اور بزرگوں کے پیغامات بھی شامل اشاعت ہیں، اس سیمینار کی ایک اور مناسبت یہ تھی کہ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے قیام پر پندرہ بلکہ سولہ سال مکمل ہو چکے، اس مناسبت سے سیمینار میں فضلاء معہد کو بھی دعوت دی گئی تھی؛ تاکہ ان کی خدمات کا جائزہ لیا جائے، ان کے مسائل کو سنا جائے اور ان کو مستقبل کے لئے مشورے دیئے جائیں؛ چنانچہ ۲۰ رفروری ۲۰۱۶ء کو معہد کے ابناء قدیم کے لئے خصوصی نشست ہوئی، اس نشست میں راقم الحروف نے ان عزیزوں کے لئے اپنے کچھ مشورے پیش کئے، یہ ''میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے!'' کے عنوان سے شائع ہوا، وہ تحریر بھی اس میں شامل رکھی گئی ہے۔

سیمینار کی تیاری، مہمانوں کی ضیافت اور نظم ونسق کو برقرار رکھنے میں معہد کے تمام اساتذہ، طلبہ؛ بلکہ شریک پروگرام ہونے والے فضلاء نے بھی بڑی محنتیں کیں، اللہ تعالیٰ ان سب کو اس کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے، نیز اس مجموعہ کی ترتیب کا فریضہ عزیزی مولانا عبید اختر رحمانی (ڈائریکٹر: شعبۂ تحقیق) نے انجام دیا اور نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ اس کام کو پورا کیا، راقم الحروف ان کا شکر گزار ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اس کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے۔

خالد سیف اللہ رحمانی

۲۹ رمحرم ۱۴۳۸ھ، م: ۳۱ راکتوبر ۲۰۱۶ء

• • •

دُعائیہ کلمات

اللہ تعالیٰ انسانیت کے خالق بھی ہیں، اس کے رب اور پروردگار بھی ہیں، اور اپنی مخلوق کے ساتھ بے حد رحیم وکریم بھی، اس کی رحمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ہدایت اور رہنمائی کا انتظام بھی کیا؛ کیوں کہ انسان خود اپنے نفع ونقصان سے پوری طرح واقف نہیں ہوتا، اور نہ وہ اس بات سے واقف ہے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے جو چیزیں پیدا کی ہیں، وہ ان کو کس طرح استعمال کرے؛ اس لئے پہلے انسان ابوالبشر حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام پہلے پیغمبر بھی تھے، پھر ہر عہد میں ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو بھیجتے رہے، اور ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی شریعت بھی اُتاری جاتی رہی، ان کتابوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے احکام کو انسانی ملاوٹوں سے پاک بھی کیا گیا اور تمدنی ترقی کے اعتبار سے نئے احکام بھی دیئے گئے۔

یہ سلسلۃ الذہب نبی عربی محمد عربی ﷺ پر مکمل ہوگیا، آپ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا؛ چوں کہ آپ کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے؛ اس لئے نہ صرف آپ پر اُترنے والی کتاب ہمیشہ کے لئے محفوظ کردی گئی؛ بلکہ آپ کی سیرت طیبہ اور اُسوۂ حسنہ کی حفاظت کا بھی مِن جانب اللہ ایسا انتظام کیا گیا کہ آج آپ کی پوری زندگی روشنی میں ہے، اور زندگی کے تمام مسائل میں آپ کے اُسوہ سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے، علم اور ٹکنالوجی کے میدان میں جتنی ترقی ہوگی، دنیا میں نئے اسباب ووسائل پیدا ہوں گے، اسی درجہ سیرت محمدی کی ضرورت بڑھتی جائے گی، اور اس کی معنویت لوگوں پر واضح ہوتی جائے گی۔

اس لئے سیرت ایک ایسا موضوع ہے جو ہمیشہ سے تازہ رہا ہے، اور تازہ رہے گا؛ اسی لئے ہر دور میں سیرت کے موضوع پر لکھا جاتا رہا ہے اور قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا، علماء کی ذمہ داری ہے کہ ہر عہد میں جو انسانی مسائل پیدا ہوں، سیرت طیبہ کی روشنی میں ان کا حل پیش کریں، اور حیات محمدی کے روشن نقوش سے پوری انسانیت کو باخبر کریں، میرے لئے بے حد مسرت کی بات ہے کہ ملک کا ایک نوخیز؛ لیکن ممتاز اور تیزی سے اُبھرتا ہوا تعلیمی اور تحقیقی، نیز افراد سازی کے میدان میں خوش آئند خدمت انجام دینے والا ادارہ ''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' سیرت نبوی پر ایک عالمی سیمینار منعقد کر رہا ہے، جس میں عصر حاضر میں اُسوۂ نبوی کی معنویت کو واضح کیا جائے گا، نیز ناواقفیت یا دانستہ عناد کی وجہ سے پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جارہی ہیں، علمی وفکری سطح پر ان کو دُور کرنے کی کوشش کی جائے گی، اور رسول اللہ ﷺ کی انسانیت نوازی کے پہلو کو برادرانِ وطن تک پہنچانے کی تدبیر اختیار کی جائے گی۔

میں اس موقع پر عزیز مکرم جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی سلمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے رفقاء کی خدمت میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں، مجھ کو عزیز موصوف سے بڑی مناسبت اور ان کے کاموں سے خصوصی دلچسپی ہے، ان کی فکر مثبت اور تعمیری ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے دین وملت کی اچھی خدمت لے رہے ہیں، اس مبارک اور پُرسعادت اجلاس میں اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو پانے کے متبادل کے طور پر یہ سطریں شرکاء سیمینار کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں، میں نے اس سیمینار کے لئے بہت پہلے سے وقت دیا تھا، اور شرکت کا پورا پورا ارادہ تھا؛ لیکن اپنی علالت کی وجہ سے حاضر نہ ہوسکا، دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پروگرام کو کامیاب بنائے، نہ صرف ملتِ اسلامیہ؛ بلکہ پوری انسانیت کے لئے نفع کا ذریعہ بنائے، اور ہم سب کو سنت رسول کی اتباع اور آپ کے پیغام کو انسانیت تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

سید محمد رابع حسنی ندوی
(صدر: آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ)

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ
۴ فروری ۲۰۱۶ء

پیغامِ مسرت

المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے زیرانتظام منعقد ہونے والی اس عظیم اور بامقصد کانفرنس کے انعقاد پر سب سے پہلے میں مجلس منتظمین وشرکائے کار کو بصمیمِ قلب مبارکباد پیش کرتا ہوں، اگرچہ پیرانہ سالی اور ضعفِ طبعی کے سبب باوجود خواہش کے اس میں شرکت ممکن نہیں ہوسکی؛ تاہم دل کی گہرائیوں سے اس کانفرنس کے نتائج خیر کے لئے دُعاگو ہوں، حق تعالیٰ اس کے مثبت نتائج سے اُمت کو بہرہ ور فرمائیں —— مادیت کے اس طوفان بلاخیز کے دور میں نہایت ضروری ہے کہ مختلف عنوانات کے تحت خاص طور پر نوجوان نسل کے سامنے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ کے ہمہ جہت پہلوؤں کا تذکرہ ہوتا رہنا چاہئے؛ کیوں کہ سرورِ کونین علیہ السلام کا ذکر گرامی اس کائنات کا وہ حسین ترین تذکرہ نغمۂ حیات افزاء ہے کہ اس کی اتباع کے بغیر ہم نجاح وفلاح تک نہیں پہنچ سکتے، آپ کی تمام عاداتِ مبارکہ، مشاغل، شب وروز کے معمولات، عبادات، محافل، غزوات ومعاملات غرض کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس سے اُمت کے لئے ہدایت کی راہیں نہ نکلتی ہوں؛ کیوں کہ تمام انبیاء مرسلین علیہم السلام کا کمال اسی سرچشمۂ کمالات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہاؤ کا ایک مولود ہے اور ہر بابرکت کی برکت اس سرچشمۂ برکات علیہ السلام کی روانی کی نمود ہے۔

اس وقت جب کہ اسلام کی بیخ کنی کے لئے کفر والحاد کی تمام قوتیں تیروتبر کے ساتھ متحد ہیں اور ان کی مختلف النوع قسم کی سازشوں کا اس دین حق کا سامنا ہے، ہمارے نوجوانوں کے ذہن میں یہ حقیقت راسخ ہونی چاہئے کہ اصل طاقت، طاقتِ ایمانی ہے، ہم اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے جملہ علوم وفنون کے فکری وعملی حصول میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں؛ بلکہ ہمارا جذبۂ تحقیق دوسروں کے لئے راہ نما ہو؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو ہرگز فراموش نہ کریں کہ علم درحقیقت ایک نور ہے جو کہ اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُسوۂ نبوی سے مربوط ہوکر ہی ہماری ذات کے لئے بھی اور اُمت کے لئے بھی حیات بخش بن سکتا ہے، جس کا مختصر الفاظ میں حاصل یہ ہے کہ توحید عملی بنیاد اسلام بھی اور روحِ اسلام بھی، اس پر قائم رہتے ہوئے اپنے اپنے علوم وفنون کو ترقی دیتے ہوئے ان کی صداقتِ باطنی کی حفاظت کو عین ایمان جانیں اور ہمارے قلوب بھی کلمۂ طیبہ کی ضوفشانیوں سے اسی وقت منور ہوں گے، جب کہ فکری وعملی توحید پر خود بھی کاربند ہوں اور فرمانِ نبوی علیہ والسلام: ''فلیبلغ الشاهد الغائب'' کی جو اہم ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بوقت خطبہ حجۃ الوداع اُمت کے سپرد فرمائی، اس کو: ''ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة'' کے زریں اُصول کی روشنی میں پورا کرنے کو مقصدِ حیات قرار دیں، اسی مقصدیت میں اُمت کی سربلندی کے راز بھی مضمر ہیں اور اسی میں پیش آمدہ آزمائشوں وپریشانیوں کے حل بھی مستور ہیں: ''وأوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا'' اور اسی ایفائے عہد کے ذریعے ہماری دنیوی واُخروی فلاح ونجات بھی ممکن ہے، حق تعالیٰ ہم سب کو حسن عمل کی توفیق عمل کی ارزانی سے سرفراز فرمائیں۔ آمین

محمد سالم قاسمی
(صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند)

۲۴ / ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ
۴ / فروری ۲۰۱۶ء

تجاویز: سہ روزہ سیرتِ نبوی سیمینار

منعقدہ : ۲۱، ۲۲، ۲۳ رفروری ۲۰۱۶ء

زیرانتظام : المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

مسلمانوں کے لئے ایمانی اعتبار سے محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے؛ کیوں کہ مخلوق پرستی کے بجائے خالق پرستی، انسانوں کے درمیان اونچ نیچ کے بجائے مساوات وبرابری، انفرادی اور قومی غلامی کے بجائے آزادی، مادیت کی جگہ روحانیت اور بے حیائی کی جگہ شرم وحیا اور پاکیزگیٔ اخلاق کا نہ صرف آپ نے درس دیا؛ بلکہ دنیا میں ان ہی اقدار پر مبنی عظیم الشان انقلاب آپ کے ذریعہ وجود میں آیا، مگر افسوس کہ بعض لوگ آپ کی ذات اقدس کے بارے میں ہتک آمیز کارٹون اور غلط بیانی سے کام لے کر ناواقف برادرانِ انسانیت کو غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہیں اور مذہبی رواداری کے بجائے مذہبی دل آزاری کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔

اس پس منظر میں ملک کے ایک اہم تعلیمی، تحقیقی اور تربیتی ادارہ ''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' میں پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت طیبہ کے موضوع پر ۲۱، ۲۲، ۲۳ رفروری ۲۰۱۶ء کو سہ روزہ سیمینار منعقد ہوا، جس میں ہندوستان کے تمام علاقوں اور حلقوں نیز بیرون ملک سے بھی مختلف علماء شریک ہوئے اور بحیثیت مجموعی ۴۰ رسے زائد مقالات پیش کئے گئے، ان میں مغربی مصنفین کی طرف سے پیدا کی جانے والی غلط فہمیوں پر بحث کی گئی، دلائل اور حوالوں کے ساتھ اس بات کو پیش کیا گیا کہ دیگر مذہبی مقدس کتابوں میں بھی آپ ﷺ کی آمد کی پیشین گوئیوں کے اشارے موجود ہیں، مغرب کے یا ہندوستان کے دانشوروں، مذہبی لیڈران اور غیر مسلم شعراء اور ادباء نے آپ ﷺ کی شان میں تعریف وتوصیف کی جو باتیں کہی ہیں، ان پر روشنی ڈالی گئی اور موجودہ دور میں پیدا ہونے والے مسائل —— تکثیری سماج، ماحولیات کا تحفظ، موجودہ جمہوری نظام، بنیادی انسانی حقوق وغیرہ —— سے متعلق پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات پیش کی گئیں، خاص کر اس بات پر زور دیا گیا کہ آپ ﷺ نے ذات پات کی تقسیم کو غلط ٹھہراتے ہوئے انسانی وحدت کی تعلیم دی ہے، دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کے احترام کا حکم دیا ہے، تمام انسانیت کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دیتے ہوئے انھیں رشتۂ اُخوت سے جوڑا ہے اور خاص کر ایک تکثیری اور ہمہ

مذہبی سماج میں ایک دوسرے کے جذبات کا احترام ورواداری اور باہمی تعاون کے ذریعہ امن وآشتی کو قائم رکھنے کی ہدایت دی ہے۔

سیمینار میں تقریباً تین سو اسکالرس نے شرکت کی اور بہ اتفاق رائے جو تجاویز منظور کی گئیں، وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) برادران انسانیت سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ غیر معتبر پروپیگنڈوں اور معاندانہ، بے بنیاد تبصروں سے متاثر نہ ہوں؛ بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کو مستند ومعتبر کتابوں کے ذریعہ پڑھیں اور آپ ﷺ کی انقلاب انگیز تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کریں، اس طرح وہ محسوس کرلیں گے کہ آپ ﷺ امن اور مساوات کے داعی تھے اور آپ ﷺ کا اُسوہ ہمارے لئے موجودہ حالات میں بہترین رہنما ہے۔

(۲) مسلمانوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اخلاق نبوی کا آئینہ بنائیں اور اسلام نے سماج کے تمام طبقات کے ساتھ جس حسنِ سلوک اور انسانی بنیادوں پر برادرانہ برتاؤ کی تعلیم دی ہے، اس کا نمونہ بنیں۔

(۳) ہندوستان کی تمام قومی اور ریاستی زبانوں میں پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت پر معتبر لٹریچر شائع کیا جائے اور اسے برادرانِ وطن تک پہنچایا جائے؛ تاکہ آپ ﷺ کی تعلیمات سے پوری انسانیت فائدہ اُٹھائے۔

(۴) یہ بات بے حد افسوس ناک ہے کہ گنگا جمنی تہذیب کے مقابلہ ہمارے ملک میں تاریخ پر ایسی کتابیں لکھی جارہی ہیں، جن کا مواد تعصب وتنگ نظری اور افترا پردازی پر مبنی ہے، اور بعض اوقات نصاب تعلیم میں بھی پیغمبر اسلام، صحابہ کرامؓ، مسلم سلاطین اور بزرگوں کے بارے میں بالکل بے بنیاد باتیں شامل کردی گئیں ہیں، جن کا مقصد مذہبی ہم آہنگی کو متاثر کرنا اور سماج میں بسنے والی مختلف قوموں کے درمیان نفرت کی دیوار اُٹھانا ہے؛ اس لئے حکومت کو چاہئے کہ جن مضامین سے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے جذبات وابستہ ہیں، ان کے بارے میں وہی بات لکھی جائے، جس کو اس مذہب کے معتبر شارحین تسلیم کرتے ہوں۔

(۵) مختلف مذاہب کی مقدس شخصیات کے احترام کو ملحوظ رکھا جائے اور حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسے مؤثر قوانین بنائے، جو مذہبی دل آزاری کا ارتکاب کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچائے، خواہ ایسی دل آزاری نصابی کتابوں کے ذریعہ ہو یا الیکٹرانک، پرنٹ اور سوشل میڈیا کی نصابی کتابوں کے ذریعہ، کارٹون کی شکل میں، یا مضمون کی شکل میں، اس کو ہرگز اظہار رائے کی آزادی کا نام نہیں دیا جاسکتا، یہ حق اظہار کی آزادی نہیں ہے؛ بلکہ غیر اخلاقی حرکت اور دل آزاری ہے۔

(۶) یہ اجلاس اقوام متحدہ سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ عالمی سطح پر ایسا قانون بنائے، جو تمام مذاہب کے

احترام کو یقینی بنائے ، افسوس کہ کسی گروہ کے مذہبی جذبات مجروح کئے جاتے ہیں ، اس کی مذمت نہیں کی جاتی ، اور جب اس پر جوابی ردعمل سامنے آتا ہے تو اس کی مذمت کی جاتی ہے، اس کی وجہ سے دنیا میں تشدد اور نفرت میں اضافہ ہوتا ہے، تشدد کا حل طاقت کا استعمال نہیں ہے ؛ بلکہ ناانصافی ، زیادتی ، دل آزاری ، ظلم کو روکنا اور تمام مذہبی لسانی اور نسلی گروہوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کو یقینی بنانا ہے۔

(۷) شریعت اسلامی کسی بے قصور مسلمان یا غیر مسلم کے قتل کی اجازت نہیں دیتی ؛ بلکہ ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیتی ہے، مسلمانوں اور غیر مسلموں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے یکساں احترام کا حکم دیتی ہے اور نہ اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ کوئی گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور تشدد و طاقت کا ہتھیار استعمال کیا جائے ؛ اس لئے داعش کے نام سے جس گروہ کا ذرائع ابلاغ میں ذکر آرہا ہے، اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا طرز عمل پوری طرح غیر اسلامی اور غیر انسانی ہے اور یہ امریکہ، اسرائیل اور ان مغربی طاقتوں کی پیداوار ہے، جو اپنے مفادات کے لئے ہمیشہ مشرقی ملکوں میں عدم استحکام پیدا کررہے ہیں اور جنھوں نے ہندوستان کے بشمول ایشیاء اور افریقہ کے بہت سے ملکوں کو جبراً اپنا غلام بنائے رکھا تھا اور آج بھی مختلف بہانوں سے ان کی مداخلت کا سلسلہ جاری ہے۔

• • •

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے!

الحمد للہ رب العالمین ، والصلاۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین وعلیٰ آلہ وأصحابہ اجمعین ، أما بعد ۔

عزیزان گرامی ! معہد کے قیام پر پندرہ بلکہ سولہ سال کا عرصہ گذر چکا ہے، جیسے افراد کا ایک خاندان اور کنبہ ہوتا ہے، ایک دوسرے سے ملاقات کی خواہش ہوتی ہے اور مل کر خوشی ومسرت کا احساس ہوتا ہے، ایک دوسرے کے حالات سننے، ان کے تجربات سے فائدہ اُٹھانے اور یاد ماضی کو کُریدتے ہوئے حالِ امروز سنانے کا موقع بہم پہنچتا ہے، اسی طرح اداروں کی حیثیت بھی ایک خاندان اور کنبہ کی ہوتی ہے، اس خاندان کی بنیاد نسبی رشتہ کی بجائے دینی وعلمی رشتہ پر ہوتی ہے اور یہی رشتہ ایک مسلمان اور عالم دین کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب ہونا چاہئے ، اسی پس منظر میں یہ سیمینار رکھا گیا ہے ؛ تا کہ آپ حضرات سے باہم ملاقات کا موقع میسر ہو، ہم ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اُٹھائیں اور آپ ایک نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ یہاں سے واپس جائیں۔

عزیزان گرامی ! اس موقع پر میں چند ضروری باتوں کی طرف جو موجودہ حالات میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں، آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں :

برادرانِ وطن سے ربط وتعلق

ان میں پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُخوت و بھائی چارہ کے مختلف دائرے مقرر فرمائے ہیں، ایک رشتۂ اُخوت وہ ہے، جو اُخوت و بھائی چارہ کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، ایک وہ ہے جس کی بنیاد دین و مذہب ہے، اس رشتہ کے لحاظ سے تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ'' (الحجرات:۱۰) اسی طرح ایک اور رشتہ انسانی بنیادوں پر اُخوت و بھائی چارہ کا ہے کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں، خواہ وہ کسی مذہب کے ماننے والے، کسی علاقے کے رہنے والے اور کسی زبان کے بولنے والے ہوں، اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: تم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہو: ''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا'' (النساء:۱) نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے تمام

بندے بھائی بھائی ہیں: ''ان العباد کلھم اخوۃ'' (ابوداؤد، کتاب الوتر، حدیث نمبر: ۱۵۰۸) اسلام کا یہ تصور ہمیں اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ برادرانِ وطن کے ساتھ ہمارا تعلق برادرانہ اور دوستانہ ہونا چاہئے۔

ہمیں غیر مسلم بھائیوں سے نفرت کرنا نہیں سکھایا گیا ہے؛ بلکہ ہمیں ان کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے، گذشتہ زمانہ میں علماء اور بالخصوص صوفیاء کے یہاں بہت سی مثالیں ملتی ہیں، تذکرہ نگاروں نے نقل کیا ہے کہ امام ابوالعلاء کبھی کبھی ہمدان سے اپنے وطن جمعہ پڑھنے جایا کرتے تھے، جب وہ تشریف لے جاتے تو اہل شہران کو چھوڑنے کے لئے شہر سے باہر جاتے، ان میں جہاں مسلمان ہوتے، وہیں یہودی بھی ہوتے تھے اوران کو دُعا دیا کرتے تھے، (تذکرۃ الحفاظ: ۴/۸۲۰) غیر مسلم بھائیوں کے مسلمان علماء سے تعلق کا حال یہ تھا کہ جب ایک تابعی عالم امام منصور کا جنازہ اُٹھایا گیا تو مسلمانوں کے علاوہ یہودیوں اور عیسائیوں کے گروہ بھی ان کے جنازہ میں شامل تھے، (تذکرۃ الحفاظ: ۴/۱۸۷) عام علماء کے مقابلہ صوفیاء کو اس سلسلہ میں خصوصی امتیاز حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اور اس جیسے ممالک میں اسلام کی اشاعت میں ان کا نمایاں کردار رہا ہے، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ جن لوگوں کو مسلمانوں سے سخت نفرت اور اسلام کے نام سے الرجی ہے، وہ بھی ان صوفیاء کے مزارات پر کمال عقیدت اور غایت احترام کے ساتھ پہنچتے ہیں اور اپنے تصور کے مطابق نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں، خود ماضی قریب کے علماء شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ وغیرہ کا اپنے ہم عصر ہندو سیاسی ومذہبی قائدین سے قریبی تعلق رہا ہے۔

آج پھر اس بات کی ضرورت ہے کہ آپ جہاں کہیں بھی ہوں، اپنے گرد وپیش رہنے والے اہل وطن بھائیوں کے ساتھ برادارانہ تعلق استوار کریں اور ایک دوسرے کے یہاں مختلف مناسبتوں سے آمد ورفت رکھیں، یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلم کی عیادت بھی کی ہے، ان کو مدعو بھی کیا ہے اوران کی دعوت بھی قبول فرمائی ہے، ان کے تعلیمی اداروں کا معائنہ بھی فرمایا ہے، انھیں مسجد میں ٹھہرایا ہے اوران کی ضیافت بھی کی ہے، حضرت ابوطالب کے جلوس جنازہ میں شرکت فرمائی ہے، جب مکہ کے لوگ شدید قحط میں مبتلا تھے تو ان کے لئے قحط سے نجات کی دُعا بھی کی ہے اوران کا خطیر مالی تعاون بھی فرمایا ہے، اسی طرح آپ ﷺ نے پڑوسیوں اور بڑی عمر کے لوگوں کے احترام اوران کے ساتھ حسن سلوک کا مطلق حکم دیا ہے اوراس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے، اسی طرح آپ نے ابوجہل کو 'ابوالحکم' اور بادشاہ روم کو 'عظیم الروم' سے خطاب فرمایا ہے، جس میں ان کی توقیر کا پورا پورا لحاظ ہے۔

غرض کہ آپ کا اُسوہ یہی ہے کہ غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم رکھنے کی کوشش کی جائے،

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگر مسلمان سیاسی قائدین برادران وطن سے اپنے رابطے استوار کریں تو بجا طور پر انھیں خیال ہوگا کہ یہ رواداری سیاسی مفادات کے لئے ہے، اگر مسلمان تجاران سے کاروباری رابطہ بہتر بنائیں تو خیال ہوگا کہ یہ ربط وتعلق مالی مفادات کے پس منظر میں ہے؛ لیکن اگر علماء ومشائخ بے لوث طریقہ پر غیر مسلم بھائیوں سے اپنے رابطے استوار کریں تو وہ محسوس کریں گے کہ انسانیت نوازی مذہب اسلام کی تعلیم ہے، اوران کا دین انھیں انسانی بنیادوں پر حسن سلوک کی تعلیم دیتا ہے؛ اس لئے آپ کے برادران وطن سے تعلقات کو بہتر بنانے اور برادارانہ ماحول کو وجود میں لانے سے ایک طرف ان کے اندر مسلمانوں کے تئیں نفرت دُور ہوگی اور دوسری طرف ان کے دلوں میں اسلام کی عظمت قائم ہوگی؛ اس لئے آپ اس پر خوب توجہ دیں۔

خدمتِ خلق

حضرات ! ماحول کو موافق بنانے اور مسلمان ہوں یا غیر مسلم، ان کو قریب کرنے کا ایک بڑا ذریعہ خدمتِ خلق ہے، رسول اللہ ﷺ کو من جانب اللہ نبوت کے پہلے ہی سے اعلیٰ اخلاق اور خدمت خلق کے غیر معمولی جذبات سے نوازا گیا؛ اسی لئے جب آپ ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی، آپ ﷺ اُم المومنین حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے اوراس وقت آپ ﷺ پر گھبراہٹ کی کیفیت تھی تو اس وقت اُم المومنین نے جن پانچ اوصاف کا ذکر فرمایا — رشتوں کا لحاظ، لوگوں کے بوجھ کو اُٹھانا، ناداروں کی دستگیری، مہمان نوازی اور مصیبت کے وقت مدد — ان سب کا تعلق خدمت خلق ہی سے ہے: ''**إنک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق**'' (بخاری، عن عائشہؓ، حدیث نمبر: ۳) پھر جب آپ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے بنو ہاشم کو کھانے پر مدعو کیا اور کھانا کھلانے کے بعد ان پر اسلام کی دعوت پیش فرمائی۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۴۰/۳)

خدمت خلق ایسی چیز ہے جو انسان کو اللہ کی نظر میں بھی محبوب بناتی ہے اور اس کی مخلوق کی نظر میں بھی؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہیں، اور اللہ کے نزدیک مخلوق میں سب سے پسندیدہ شخص وہ ہے، جو اس کے کنبہ کے لئے نفع بخش ہو: ''**الخلق کلھم عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ انفعھم لعیالہ**'' (المعجم الکبیر للطبرانی، عن عبداللہ بن مسعود، حدیث نمبر: ۱۰۰۳۳) دوسری طرف خدمت خلق سے انسان مخلوق کے درمیان بھی محبوب بنتا ہے، یہ انسانی فطرت اور شب وروز کا مشاہدہ ہے، نیز رسول اللہ ﷺ کے ارشاد: ''**تھادوا تحابوا**'' (مؤطا امام مالک، باب ماجاء فی المہاجرۃ، حدیث نمبر: ۱۶) میں بھی اس کا اشارہ موجود ہے، لوگوں کا متاثر اور گرویدہ ہونا مخلوق کی خدمت کا ایک فطری اور طبعی اثر ہے، جیسے آگ میں گرم کرنے اور برف میں ٹھنڈا کرنے

کی صلاحیت ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے خدمت اور حسن سلوک میں قلوب کو گرمانے اور نرمانے کی صلاحیت رکھی ہے، یہ کام نہ صرف انفرادی طور پر کرنا چاہئے ؛ بلکہ ضرورت ہے کہ مدارس اور مساجد میں بھی ایک شعبہ، خدمتِ خلق کے کاموں کا ہونا چاہئے ، جو بلاتفریق مذہب انسانیت کی خدمت کا فریضہ انجام دیتا ہو۔

دعوتِ دین

عزیزانِ من ! برادرانِ وطن سے تعلق اور خدمت خلق مقصود بھی ہے اور وسیلہ بھی ، منزل بھی ہے اور راستہ بھی ، خود اجر وثواب کا کام ہے اور اس سے بڑے اجر وثواب تک مسلمان کو پہنچا تا ہے، اور وہ ہے دعوت واصلاح کا کام ، جو ہر مسلمان کا فریضۂ منصبی اور مقصد حیات ہے : ''کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ '' (آل عمران: ۱۱۰) اس وقت مسلمان مختلف ملکوں اور خاص کر ہندوستان میں جس صورت حال سے دو چار ہیں، اس کا واحد حل اسلام کی تبلیغ واشاعت ہے، رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمائی تھی کہ اگر تم کو دین کی ایک بات معلوم ہو تو اسے بھی دوسروں تک پہنچاؤ: ''بلغوا عنی و لو آیة'' (بخاری، کتاب الانبیاء، حدیث نمبر: ۳۲۷۴) اور آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں صحابہؓ سے شہادت لی کہ ہم نے تم تک اللہ کا پیغام پہنچادیا ، پھر حکم فرمایا کہ ہر شخص جو موجود ہو، وہ غائب شخص تک تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دے: ''فليبلغ الشاهد الغائب'' (بخاری، کتاب الحج، حدیث نمبر: ۱۶۵۲) ہر شخص جو دامن اسلام میں آچکا ہے، وہ گویا شاہدین میں شامل ہے ؛ کیوں کہ اس نے کلمہ اسلام کی شہادت دی ہے اور ہر شخص جو اسلام سے محروم ہے، وہ غائبین میں شامل ہے ؛ اس لئے ہر مسلمان کی اور بالخصوص علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ برادرانِ وطن تک اسلام کی امانت کو پہنچائیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: ''اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ کسی ایک فرد کو بھی ہدایت دے دیں، تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹ سے بہتر ہے'' (بخاری، باب مناقب علی، حدیث نمبر: ۳۰۰۹) سوچئے ، کیا ہمیں حضور ﷺ کی ضمانت پر اعتماد نہیں ہے یا کیا ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے؟

اللہ تعالیٰ کا غیبی نظام یہ ہے کہ جب کوئی گروہ دعوت اسلام کا فریضہ انجام دیتا ہے تو اس پر دنیا میں تین قسم کے نتائج مرتب ہوتے ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنے مدعوئین کے شر سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی تحفظ حاصل ہوتا ہے ؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا: ''بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ '' (المائدة: ۶۷) گویا عصمت من الناس کا غیبی ذریعہ تبلیغ دین ہے، دوسرا اثر یہ ہے کہ اس سے نفرت کی آگ بجھتی ہے، محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جاتی ہے، قرآن مجید نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ '' (حم السجدة: ۳۴)

تیسرا اثر یہ ہے کہ مدعوئین اگر دعوت حق کو قبول کرنے سے انکار کردیں اور ظلم وتعدی پر کمر بستہ ہوں تو اللہ تعالیٰ اس قوم پر عذاب بھیجتے ہیں اوران کے مقابلہ میں اہل ایمان کی نصرت فرماتے ہیں، قرآن مجید میں جن مُعذَّب اقوام کا ذکر آیا ہے، ان کی تاریخ دیکھ لیجئے، ان تک اللہ کا پیغام پہنچ گیا؛ بلکہ پہنچانے کا حق ادا کردیا گیا، اس کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے اورانھوں نے ظلم وتعدی کا راستہ اختیار کیا، تب جاکر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کی پکڑ ہوئی، جن تک اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو، وہ منکرین اور معاندین نہیں ہیں، وہ غافلین ہیں اور ایسے لوگوں پر اللہ کی طرف سے دنیا میں عذاب نہیں آتا: ''وَ اِنْ کُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ ''۔(یوسف:۳)

ہندوستان کی صورت حال یہی ہے؛ اس لئے سیاسی تدبیریں وقتی طور پر تو مسئلہ کو حل کرسکتی ہیں، یا دشواری میں کمی کا سبب بن سکتی ہیں؛ لیکن یہ مستقل حل نہیں ہے، اصل حل دعوت الی اللہ ہے اور اُمت میں کوئی کام اسی وقت مقبول ہوتا ہے، جب علماء اس کام سے جڑ جائیں؛ اس لئے آپ تمام عزیزوں سے میری التجا ہے کہ آپ اس کام کو اپنے لئے اوڑھنا بچھونا بنالیں، آپ کا یہ عمل اخلاص، انسانیت کی خیرخواہی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور خالص دینی جذبہ کے تحت ہو تو آپ کو دیکھ کر اُمت کے وہ لوگ بھی اس میں شریک ہوجائیں گے، جو آپ سے متاثر اور مانوس ہیں، اس طرح چراغ سے چراغ جلتا جائے گا اور روشنی بڑھتی جائے گی۔

دفاعِ اسلام

برادرانِ عزیز ! موجودہ حالات میں ایک اہم کام غلط فہمیوں کو دُور کرنا ہے، جو اسلام کے بارے میں پھیلائی جارہی ہیں، پہلے اسلام مخالف پروپیگنڈہ تاریخی اورفکری کتابوں میں اور مغربی یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے طلبہ کے پی ایچ ڈی مقالات میں ہوا کرتے تھے؛ لیکن اب الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کی وجہ سے بے بنیاد اور بے سروپا باتیں گھر گھر پہنچائی جارہی ہیں، اور سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان ذرائع ابلاغ کی الزام تراشیوں کی نہ کوئی سرحد ہے اور نہ ان سے کوئی حساب لینے والا، اس پس منظر میں علماء کا فریضہ ہے کہ وہ اس اہم کام کی طرف متوجہ ہوں، ہندوستان میں اکابر علماء شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ وغیرہم نے اس کام پر خصوصی توجہ دی اور موثر انداز میں معاندین کے سوالات کے جواب دیئے، گذشتہ زمانہ میں غلط فہمیوں کو پھیلانے کے ذرائع محدود تھے اور ان کی رسائی بھی محدود تھی؛ اس لئے ایک دو اشخاص کی کوششیں کافی ہوجاتی تھیں؛ لیکن اب ذرائع ابلاغ کی تیز رفتاری اور اس کی وسیع تر رسائی، نیز اس کے بہت زیادہ غلط استعمال کی وجہ سے چند اشخاص کی توجہ کافی نہیں ہے، اب پورے طبقہ علماء کو اس کے لئے تیار ہونا چاہئے۔

قرآن مجید نے اسی فریضہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے: ''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ'' (النحل: ۱۲۵) ایک اور موقع پر فرمایا: ''وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ'' (حم السجدۃ: ۳۴) یہ'جدال بالاحسن' اور'دفاع بالاحسن' کا حاصل یہی ہے کہ بہتر طور پر اسلامی افکار، اسلامی شریعت، اسلامی تعلیمات، اسلامی علوم و معارف اور اسلامی شخصیات ومقدسات کا دفاع کیا جائے، یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے یہاں اسم تفضیل کا صیغہ استعمال کیا ہے اور''احسن'' کہا ہے، اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ اصلاح وموعظت، تزکیہ وتربیت اور تعلیم وتدریس کے لئے تو اچھا طریقہ کافی ہے، جیسا کہ فرمایا گیا: ''اَلْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ'' لیکن اسلام کے دفاع اور معاندین کے رد کے لئے وہ طریقہ مطلوب ہے، جو سب سے زیادہ بہتر اور موثر ہو، جو صرف اچھا نہ ہو سب سے اچھا ہو اور جو صرف بہتر نہ ہو بہترین ہو، اور یہ بات اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے، جب آپ کے اندر تین باتیں جمع ہوں :

(۱) بصیرت: یعنی آپ کو جو بات پیش کرنی ہے، اس کے بارے میں گہری معلومات اور وسیع مطالعہ: ''اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ''۔ (یوسف: ۱۰۸)

(۲) زبان وقلم میں نرمی ودل نوازی: جس کو قرآن نے'قول لیّن' سے تعبیر کیا ہے، (طٰہٰ: ۴۴) اچھی سے اچھی بات اگر تندی اور تلخی کے ساتھ کہی جائے یا لکھی جائے تو وہ بے فائدہ ہوجاتی ہے، مخاطب کو لاجواب کرنا مقصود نہیں ہونا چاہئے، مقصود یہ ہے کہ اس کے دل پر دستک دی جائے۔

(۳) موقع شناسی: وقت اور مخاطب کی نفسیات کا شعور، جیسے آپ ﷺ نے اہل مکہ کے مزاج کو دیکھتے ہوئے فرمایا: اگر تم اسلام قبول کرلو گے تو عرب وعجم تمہارے تحت آجائیں گے، (الدر المنثور: ۳۳۹/۳) یہ بات پوری طرح قریش کے مزاج کے مطابق تھی؛ کیوں کہ انھیں عربوں میں قیادت کا مقام حاصل تھا اور وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتے تھے۔

اسی طرح ہمیں ہر سطح پر اسلام کی مدافعت کی خدمت انجام دینی چاہئے، کتابوں کے ذریعہ، اخبارات کے ذریعہ، سوشل میڈیا کے ذریعہ، مذاکرات کے ذریعہ، انفرادی ملاقاتوں اور اجتماعی ملاقاتوں کے ذریعہ۔

مقامی زبانوں سے واقفیت

عزیزو! زبان جو ہمارے منھ میں ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے اور وہ زبان جو حروف والفاظ سے مرکب ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی مخلوقات میں ہے اور اظہار کا ایک اہم ذریعہ ہے، زبان کا خود کوئی مذہب نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ دوسرے مضامین کی طرح مذہبی تصورات کے لئے ذریعہ ووسیلہ بنتی ہے، افسوس کہ ادھر ایک

دوصدیوں سے مسلمانوں میں کچھ ایسی سوچ قائم ہوگئی کہ گویا زبانوں کا بھی ایک مذہب ہوتا ہے، فلاں زبان اسلامی ہے اور فلاں غیر اسلامی ؛ حالاں کہ اسلام میں عربی زبان کو یقیناً خصوصی اہمیت حاصل ہے ؛ کیوں کہ وہ قرآن وحدیث کی زبان ہے، بقیہ تمام زبانیں برابر ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ ادھر تقریباً بیس پچیس سال سے اس سوچ میں کسی قدر مثبت تبدیلی آئی ہے اور دینی مدارس میں بھی انگریزی زبان کی طرف توجہ دی جارہی ہے، یا اس کے لئے خصوصی شعبہ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے ؛ لیکن مقامی زبانوں سے غفلت ؛ بلکہ بے اعتنائی و بے نیازی ؛ بلکہ شاید اس سے بھی آگے بڑھ کر بے زاری کا سلسلہ آج بھی قائم ہے، اس ملک میں شمال کی بیشتر ریاستوں کی زبان ہندی ہے ؛ لیکن مدارس میں اس زبان کا گذر نہیں، جنوبی ہند کی ریاستوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں ؛ لیکن اکثر و بیشتر اس ریاست میں پیدا ہونے اور بسنے والے مسلمان اس زبان سے نابلد ہیں ؛ بلکہ اسے ناقابل توجہ سمجھتے ہیں۔

اس رویہ نے برادرانِ وطن کے اور ہمارے درمیان فاصلے بڑھا دیئے ہیں، فرقہ پرست عناصر چاہتے ہی تھے کہ مسلمانوں کو تنہا کر دیا جائے، ان کو اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی، سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہم برادران وطن کے درمیان نہ اسلام کا تعارف کرا سکے، نہ ان کے درمیان دعوت کا کام کر سکے، اور نہ اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں، انھیں دُور کرنے میں کامیاب ہو پائے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا ؛ تا کہ یہودیوں کی کتابیں سمجھی جاسکیں اور انھوں نے صرف دو ہفتوں میں یہ زبان سیکھ لی، (ترمذی، باب ماجاء فی تعلیم السریانیہ، حدیث نمبر: ۲۷۱۵) اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک مقصد یہودیوں کی تحریف وتصحیف سے بچنا بھی تھا، (مسند عبد بن حمید: ۱۰۸، حدیث نمبر: ۲۴۳) اسی طرح حضرت سلمان فارسی کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے فارسی زبان میں سورۂ فاتحہ کا ترجمہ کیا، (کشف الخفاء: ۲/۲۹۶) غالباً خلافت راشدہ ہی کے عہد میں ہندوستان کے ایک راجہ کے لئے ایک عرب سیاح نے قرآن کریم کا ہندی میں ترجمہ کیا، مسلمانوں نے ہمیشہ زبان کے معاملہ میں بے تعصبی برتی، انھوں نے یونانیوں کے پورے کتب خانہ کو عربی زبان میں منتقل کیا، فارسی زبان کی اتنی خدمت کی کہ آج فارسی کا جو کچھ لٹریچر موجود ہے، خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں، مسلمانوں کی ہی دَین ہے، ہندوستان میں اس کی واضح مثال 'کلیلہ ودمنہ' ہے، اس کی اصل کتاب کا تو شاید کوئی سراغ نہ ملے ؛ لیکن عربی زبان میں ان کہانیوں کو منتقل کر کے عربوں نے اسے ایک طرح کا دوام عطا کر دیا۔

اس لئے یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ مسلمان بالخصوص علماء مقامی زبانوں پر توجہ دیں اور اسے دعوتِ اسلام کا ذریعہ بنائیں، قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم نے ہر قوم میں ان ہی کی زبان میں اپنا کلام اُتارا ہے اور ان کے ہم زبان شخص کو پیغمبر کی حیثیت سے بھیجا ہے: ''وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن

رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ''(ابراہیم:۴)اس لئے صرف کسبِ معاش، تجارت وکاروبار اور سیاسی مہم جوئی کے لئے نہیں ؛ بلکہ اسلام کا تعارف اور اس کی اشاعت کے لئے دعوتی مقصد کے تحت مقامی زبانوں کو سیکھنا اور اس میں اسلامی لٹریچر کو پیش کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔

اس لئے میں آپ حضرات سے دردمندانہ گذارش کرتا ہوں کہ آپ داعیانہ کردار ادا کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں، اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے مقامی زبانوں کو ذریعۂ اظہار بنانے کی کوشش کریں، بے حد ضروری ہے، قرآن مجید کے مذکورہ ارشاد (ابراہیم:۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان کے معاملہ میں داعی کو مدعو کی سطح پر اُتر کر دعوت کا فریضہ انجام دینا چاہئے، اگر ہم نے مخاطب تک ان کی زبان میں اسلام کی دعوت نہیں پہنچائی تو ہم اپنے فریضہ سے سبکدوش نہیں ہوئے اور عنداللہ ہمیں جواب دہ ہونا پڑے گا۔

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!

برادرانِ عزیز ! یہ ساری باتیں جو آپ سے عرض کی گئیں: غیر مسلم ہمسایوں سے بہتر تعلق، خدمتِ خلق، دعوتِ دین، دفاعِ اسلام اور مقامی زبانوں کی واقفیت، ان ساری باتوں کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلام کا غلبہ واظہار ہے؛ لیکن جیسے گاڑی کا ڈھانچہ کتنا بھی اچھا ہو، اگر اس کے اندر پٹرول نہ ہو تو وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی، اسی طرح ان اعمال میں قوت وتاثیر اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب انسان کے دل کی دنیا خدا کی محبت سے لبریز ہو اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی اس کا مطلوب ومقصود بن جائے ؛ کیوں کہ جب انسان کے دل میں ایمان ویقین اور حبِ الٰہی کا نور پیدا ہوتا ہے تو اس کی روشنی سے اس کا پورا وجود جگمگا اُٹھتا ہے اور اس کی تابناکی ماحول کو روشن کرتی ہے ؛ اس لئے ہمیں ہمیشہ اس جانب متوجہ رہنا چاہئے کہ جہاں مخلوق کے ساتھ ہمارا تعلق بہتر ہو، وہیں خالق کے ساتھ بھی ہمارا رشتہ استوار ہو، ہم اپنے عمل کو رِیا، ناموری، شہرت وعوامی مقبولیت کے جذبہ اور دنیاوی اغراض ومفادات سے بچا کر رکھنے کی بھرپور کوشش کریں ؛ کیوں کہ شیطان بڑا عیار ہے، وہ اچھے اچھے لوگوں کے اعمال کو بے اخلاصی میں مبتلا کر کے ضائع کر دیتا ہے اور اس سے نہ صرف یہ کہ انسان آخرت کے اجر سے محروم ہو جاتا ہے؛ بلکہ دنیا میں بھی اس کے اعمال کی تاثیر ختم یا کم ہو جاتی ہے؛ اس لئے اصلاحِ باطن کی طرف سے غافل ہو جانا ایسا ہی ہے، جیسے کوئی دل کا مریض اپنی ظاہری شکل وصورت کی تازگی کو دیکھ کر خیال کرنے لگے کہ اس کو کسی علاج کی ضرورت نہیں ہے ؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے کہ اس کی صحت سے پورے وجود کی صحت اور اس کے بگاڑ سے پورے وجود کا بگاڑ متعلق ہے: ''ان فی الجسد لمضغة اذا صلحت صلح الجسد كله و إذا فسدت فسد الجسد كله الا و هی القلب''۔ (بخاری، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۵۲)

قلب کی اصلاح اورامراض قلب کے علاج کا نسخہ بھی قرآن وحدیث میں بتایا گیا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا: ''اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ'' (الرعد:۲۸) انسان بار بار جس چیز کا ذکر کرتا ہے، اس کا تصور ذہن میں تازہ ہوجاتا ہے، اگر آپ اپنے گھر سے دُور ہوں اور آپ کے والدین اور بال بچوں کا ذکر آجائے تو آپ کی تڑپ میں اضافہ ہوجاتا ہے، شوقِ ملاقات بڑھتا ہے اور اپنے اہل تعلق کی تصویر آپ کے ذہن کی اسکرین پر گشت کرنے لگتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اللہ کی یاد تازہ ہوتی ہے اور اللہ کی محبت بڑھتی ہے؛ اس لئے اپنی انفرادی زندگی میں کچھ وقت ضرور قلب وروح کی تازگی کے لئے بھی رکھنا چاہئے، غور کیجئے! انسان اپنی بیوی کے ساتھ وقت دیتا ہے، اپنے بال بچوں کے ساتھ وقت گذارتا ہے، ماں باپ کے ساتھ وقت لگاتا ہے، دوستوں سے ملاقات کے لئے وقت کا ایک حصہ خرچ کرتا ہے، اپنے کاروبار اور معاشی تگ ودو کے لئے تو وقت کا سب سے زیادہ حصہ لگاتا ہے؛ لیکن ہمارے پاس کیا کوئی ایسا وقت بھی ہے، جس میں ہم ہوں اور ہمارا خالق ہو، خدائے مالک الملک ہو اور اس کا غلام بے دام ہو، اس کے درمیان کوئی اور نہ ہو، وہ محبت اور درد کے ساتھ اپنے خالق کے نام کو دوہرائے، اپنی آنکھوں کو اشکہائے ندامت سے وضو کرائے، اپنے خدا کی چوکھٹ پر پیشانی رکھ دے، روئے اور بلبلائے، دستِ سوال پھیلائے، مانگے اور اس یقین کے ساتھ مانگے کہ اس در کے سوا کوئی در نہیں ہے، جہاں سے ہماری ضرورتیں پوری ہوں گی، بقول علامہ اقبالؒ:

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا، بے آہِ سحر گاہی

اس کے بغیر نہ زبان میں یہ قوت پیدا ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں پر دستک دے سکے، نہ قلم میں ایسی طاقت آتی ہے، جو دماغ کو فتح کرلے، نہ اس کا علمی فیضان کما حقہ جاری ہوتا ہے اور نہ لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت اور عظمت پیدا ہوتی ہے؛ اس لئے اس بات کا ضرور اہتمام کیجئے کہ آپ کے شب وروز کے اوقات میں کچھ وقت خالصتاً اللہ کے لئے ہو، جب کوئی ضرورت پیش آئے یا کسی آزمائش سے دوچار ہوں، یا کوئی باعث رنج امر درپیش ہو تو ظاہری اسباب ووسائل کی طرف توجہ کرنے سے پہلے نماز حاجت کا اور دُعا کا اہتمام کریں اور خالق کے سامنے دستِ سوال دراز کریں، علم اور دین کے معاملہ میں ہمیشہ اپنے آپ کو محتاج سمجھیں، اس راہ میں کامل وہی ہے، جو اپنے آپ کو ناقص سمجھے اور اس سے زیادہ کوئی محروم وکم نصیب نہیں، جس کو اپنے کامل ومکمل ہونے کا خیال پیدا ہوجائے، دنیا کے معاملہ میں قناعت متاعِ کامیابی ہے اور دین کے معاملہ میں قناعت سے بڑھ کر کوئی محرومی نہیں۔

تواضع اور اکابر نیز معاصرین کا احترام

جب انسان کے باطن کی اصلاح ہوتی ہے، تو جہاں اس کا تعلق اپنے خالق سے مضبوط ہوتا ہے، وہیں اس

کے اندر اللہ کے بندوں کے لئے بھی تواضع وانکساری اور توقیر واحترام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جب تک انسان میں یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی ہے، اس کے ذریعہ دعوت واصلاح کی خدمت انجام نہیں پاتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے ارشاد فرمایا گیا: ''وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ'' (آل عمران: ۱۵۹) اس کا لحاظ قدم قدم پر ہونا چاہئے، لوگوں کے ساتھ آپ کی گفتگو میں شبنم کی ٹھنڈک، گلاب کی خوشبو اور قند ونبات کی مٹھاس ہونی چاہئے؛ کیوں کہ نرم خوئی اور نرم گفتاری انسان پر جو اثر چھوڑتی ہے، تند گوئی اور تلخ نوائی ہرگز وہ اثر پیدا نہیں کرسکتی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان الله رفيق يحب الرفق و يعطي على الرفق مالا يعطي على العنف'' (مسلم، کتاب البر والصلۃ، حدیث نمبر: ۲۵۹۳) اسی تواضع اور انکساری کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ جس تنظیم میں، ادارہ میں یا آبادی میں کام کررہے ہوں، وہاں جو لوگ آپ سے عمر میں، عہدہ میں بڑے ہوں، ان کو مقدم رکھیں، ان کو بڑا بنا کر کام کریں، ان کی عزت وتوقیر کو قائم رکھیں، جو آدمی چھوٹا بننا گوارہ کرتا ہے، اللہ اسی کو بڑا بناتے ہیں، نیچے کی سیڑھی ہی انسان کو اوپر تک پہنچاتی ہے، جو انسان جھکنا نہ جانتا ہو، اسے گرادیا جاتا ہے اور جس کو اپنے بڑوں کے ساتھ جھکنے میں عار نہ ہو، اللہ اس کو بلندی سے نوازتے ہیں: ''من تواضع لله رفعه الله'' (مسلم، کتاب البر والصلۃ، حدیث نمبر: ۲۵۸۸) اکثر اوقات اس معاملہ میں نوجوان فضلاء کی بے اعتدالی انتشار کا باعث بنتی ہے، عوام میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ علماء ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرسکتے، کوشش کرکے اگر کوئی عہدہ حاصل کرلیا جائے تو بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ اس نے عزت حاصل کرلی ہے؛ لیکن حقیقت میں وہ لوگوں کی نظر سے گرجاتا ہے اور سب سے بڑا خسارہ یہ ہے کہ اللہ کی مدد اس سے اُٹھ جاتی ہے۔

سلف صالحین کو دیکھئے، وہ کس خلوص اور محبت کے ساتھ اپنے معاصرین کا اعتراف کیا کرتے تھے، حماد ابن زید کے علم حدیث میں مقام ومرتبہ سے کون واقف نہ ہوگا؟ وہ اپنے ہم عصر مشہور محدث شعبہ کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ جب میرے اور شعبہ کے درمیان روایت کے سلسلہ میں اختلاف رائے ہوجاتا ہے تو میں اپنی رائے چھوڑ کر شعبہ کی رائے اختیار کرلیتا ہوں؛ کیوں کہ ان کے اندر علم کی ایسی پیاس تھی کہ وہ ایک ہی حدیث کو اپنے شیخ سے بیس دفعہ سن لینے کے بعد بھی سیر نہیں ہوتے تھے، (تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۷۵) امام شعبہ اور سفیان دونوں ایک ہی زمانے کے تھے اور اپنی اپنی جگہ مہر و ماہ کا درجہ رکھتے تھے؛ لیکن شعبہ نے سفیان بن عیینہ کے بارے میں کہا: ''سفيان احفظ منی'' (تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۸۴) یہاں تک کہ علماء اپنے چھوٹوں کے اعتراف میں بھی کوئی تکلف نہیں کرتے تھے، امام عطاءؒ اپنے زمانہ کے امام الائمہ تھے، امام ابوحنیفہ مدح وتوصیف میں بہت محتاط تھے، پھر بھی عطاء کے بارے میں رطب اللسان نظر آتے ہیں، قاضی ابن ابی لیلیٰؒ کا پایہ بمقابلہ ان کے کم سمجھا جاتا ہے؛ لیکن عطاء بعض مسائل ابن ابی لیلیٰ سے دریافت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ابن ابی لیلیٰ مجھ سے بڑے عالم ہیں، (تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۵۴)

امام ابوحنیفہؒ عبداللہ بن ابن مسعودؓ کی درسگاہ فقہ وحدیث کے استاذ الاساتذہ تھے اور اس سلسلہ میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا، ؛لیکن جب سفیان ابن عیینہؒ کوفہ تشریف لائے تو آپ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا: تمہارے شہر میں وہ شخص آیا ہے جو عمرو ابن دینارؒ کے علوم کا حافظ ہے، امام صاحب کی اس تلقین کا یہ اثر ہوا کہ لوگ سفیان ابن عیینہ کے پاس اُمنڈ آئے ؛ حالاں کہ اس وقت ان کی عمر صرف بیس سال تھی؛ اسی لئے سفیان ابن عیینہ کہتے تھے کہ مجھ کو سب سے پہلے جس شخص نے محدث بنایا، وہ امام ابوحنیفہؒ ہیں۔(ابن خلکان:۱/۲۱۱)

تعلق مع اللہ — محبوبیت کا سبب!

جب انسان کے اندر تعلق مع اللہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، تو جہاں اس میں تواضع پیدا ہوتی ہے، وہیں عوام کے دل میں من جانب اللہ اس کی محبت پیدا ہوجاتی ہے، رسول اللہ ﷺ کے بعض ارشادات میں بھی اس کا اشارہ موجود ہے کہ جب اللہ کسی سے محبت کرتے ہیں تو لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دیتے ہیں، اسلام کی تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی، کہ عام مسلمان بادشاہوں سے بھی زیادہ اپنے علماء ومشائخ کی قدر کرتے تھے، امام بخاریؒ جب نیساپور تشریف لائے تو بہت دور آگے بڑھ کر لوگوں نے ان کا استقبال کیا، امام مسلم کا بیان ہے کہ امام بخاری جس شان کے ساتھ نیساپور میں داخل ہوئے، میں نے کسی حاکم، یا کسی اور عالم کی یہ کیفیت نہیں دیکھی، (مقدمہ فتح الباری:۴۷۸) عباسی خلیفہ ہارون رشید کے اقتدار کا حال یہ تھا کہ ایشیاء، یورپ اور افریقہ میں ان کا جھنڈا لہراتا تھا، ایک بار ہارون رشید کا لشکر رقہ میں مقیم تھا، اتفاق سے اس وقت امام عبداللہ بن مبارک کا بھی وہاں سے گذر ہوا، لوگ ان کے استقبال کو اس طرح اُمنڈ پڑے کہ سارے اُفق پر غبار چھا گیا، اور ابن مبارک کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ایسی کشمکش ہوئی کہ لوگوں کی جوتیاں ٹکڑے ٹکڑے ہوگئیں، خلیفہ کی ایک باندی نے جب حیرت زدہ ہوکر یہ منظر دیکھا اور معلوم ہوا کہ اتنا بڑا مجمع اپنے آپ خراسان کے ایک بڑے عالم کے لئے جمع ہوا ہے تو بے ساختہ کہہ پڑی: بادشاہت تو اسے کہتے ہیں، ہارون کی بادشاہت بھی کوئی بادشاہت ہے جس کے لئے لوگ سرکاری افسروں کے تحت جمع ہوتے ہیں، (ابن خلکان:۲۴۸) ہندوستان میں سلاطین ومشائخ کے باہمی تعلقات کی تاریخ پڑھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین کی حکومت زروزمین پر تھی اور علماء مشائخ کی لوگوں کے دلوں پر۔

عـــزیمت کی راہ

عـــزیز بھائیو ! دین کے راستہ میں علماء کو بہت سی دفعہ آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے اور ان کو عزیمت کی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے، یہ راہ بہت مشکل ہوتی ہے، یہ کانٹوں کا راستہ ہے، پھولوں کی سیج نہیں ہے! جن کے قلوب اللہ کی محبت اور اللہ کی خشیت سے لبریز ہوں اور جن لوگوں نے اپنے مالک سے اپنا تعلق مضبوط کرلیا ہو، وہی اس

راستہ پر آبلہ پائی کر سکتے ہیں، سلف کے یہاں اس کی روشن تاریخ موجود ہے، یزید کی طرف سے عمران بن ہبیرہ عراق اور خراسان کا والی مقرر ہوا، اس نے مختلف علماء کو اپنے دربار میں طلب کر کے ان کو حکم دیا کہ وہ یزید کے احکام کی تابعداری کرے، اس موقع پر حضرت حسن بصریؒ نے اس جرأت سے کام لیا کہ فرمایا: یزید کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، اللہ کے معاملہ میں یزید سے خوف نہ کھاؤ، اللہ تعالیٰ تم کو یزید کے شر سے بچا سکتے ہیں؛ لیکن یزید تم کو اللہ کے قہر سے نہیں بچا سکتا۔ (ابن خلکان: ۱/ ۱۲۸)

امام ابوحنیفہؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ خلیفۂ عباسی منصور نے آپ کو عہدۂ قضاء کی پیشکش کی، امام صاحب نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، اس نے قسم کھائی کہ تم کو یہ عہدہ قبول کرنا ہی پڑے گا، امام صاحب نے بھی قسم کھائی کہ میں یہ عہدہ قبول نہیں کروں گا، ایک درباری شخص نے امام صاحب سے اصرار کیا کہ امیر نے قسم کھالی ہے، آپ نے فرمایا: خلیفہ کے لئے کفارہ ادا کرنا میرے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے، آخر قید کر دیئے گئے، اور اسی حالت میں آپ کی وفات ہوئی، امام مالکؒ کو ایک دفعہ حکومت کے منشاء کے خلاف فتویٰ دینے کی پاداش میں ستر دُرّے مارے گئے، (ابن خلکان: ۲/ ۱۶۴) امام احمد ابن حنبلؒ جس ابتلاء سے گذرے، وہ معروف ہے، امام شافعیؒ کی جان بھی دربار خلافت عباسی میں جاتے جاتے بچی، علماء کے یہاں عزیمت اور ثابت قدمی کی یہ کیفیت بعد کے ادوار میں بھی باقی تھی، مولانا شمس الدین رومیؒ اپنے عہد کے قاضی بھی تھے، ان کی عدالت میں مشہور فرمانروا سلطان بایزید نے شہادت دی، تو انھوں نے یہ کہہ کر کہ سلطان جماعت کے پابند نہیں ہیں، اور تارک جماعت کی شہادت مقبول نہیں، گواہی رد کر دی، (شقائق نعمانیہ: ۱/ ۲۸) سلف صالحین کی عزیمت و استقامت کے ایسے واقعات کے لئے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانیؒ کے ''علماء سلف'' اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا مطالعہ کرنا چاہئے اور اس سے روشنی حاصل کرنی چاہئے۔

عزیزانِ گرامی! ہمیں ہمیشہ اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ہم انبیاء کے وارث ہیں اور ہماری زندگی صرف ہمارے لئے نہیں ہے؛ بلکہ پوری انسانیت کے لئے ہے؛ کیوں کہ آپ انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء کی شان یہی ہے: ''اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' (الانعام: ۱۶۲) آپ نے سنا ہوگا کہ امام محمدؒ باوجود بیماری، ضعف اور پیرانہ سالی کے مطالعہ اور تحقیق وتالیف میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ ان کی راتیں بھی بیداری میں گزرتی تھیں، جب ان سے ان کے بعض تلامذہ اور محبین نے درخواست کی کہ وہ اپنے آپ کو ایسی مشقت میں مبتلا نہ کریں اور کم سے کم رات میں تو کچھ سو جایا کریں، تو انھوں نے ایک ایسا جملہ کہا، جس کا طغریٰ بنا کر ہر عالم دین کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے، انھوں نے فرمایا: ''اُمت یہ سمجھ کر سوتی ہے کہ ان کے مسائل کے لئے محمدؒ جاگ رہا ہے، اگر محمدؒ بھی سو جائے تو ان کے مسائل کون حل کرے گا؟''۔ (بلوغ الامانی فی سیرۃ محمد بن حسن الشیبانی: ۵۹، بحوالہ: مناقب الکردری، مفتاح السعادۃ لطاش کبریٰ زادہ: ۱/ ۳۶)

یہ جو کچھ سمع خراشی کی گئی ہے، یہ کلمات محبت ہیں، اگر آپ غور کریں تو محسوس کریں گے کہ ان الفاظ کی سلوٹوں میں درد دل چھپا ہوا ہے، جس کا ایک ہی مقصد ہے کہ آپ اُمت کے لئے مفید سے مفید تر اثاثہ بن جائیں اور اس خیال سے آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے ہیں کہ :

امیر ! جمع ہیں احباب ، دردِ دل کہہ لے
پھر اِلتفات دلِ دوستاں رہے ، رہے ، نہ رہے

آپ اس ادارہ کے، آپ کے اساتذہ اور مربیوں کے اور ادارہ کے ایک خادم کی حیثیت سے اس حقیر کے لئے سرمایہ گراں مایہ ہیں، ایک کاشتکار کو جیسے اس کی لگائی ہوئی کھیتی کی سرسبزی وشادابی مسرور وشاد کام کرتی ہے، اسی طرح کسی تعلیمی وتربیتی ادارہ کے لئے اس کے دامن تربیت سے وابستہ افراد فرحت وانبساط کا باعث بنتے ہیں؛ اس لئے آپ حضرات کی آمد پر آج ہمیں جو مسرت ہے، اس کے اظہار کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں، فجزاہم اللہ خیر الجزاء۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس جمع ہونے کو قبول فرمائے اور آپ ایک نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ یہاں سے واپس ہوں، جذبۂ عمل آپ کا زادِ سفر ہو، فکر ارجمند اور دلِ دردمند آپ کا رفیق ہو، فراست ایمانی آپ کی سواری ہو، نورِ بصیرت آپ کے لئے مشعلِ راہ کا کام کرے، دُعا آپ کا ہتھیار ہو اور تقویٰ آپ کا لباس ہو، یہاں تک کہ منزل خود بڑھ کر آپ کے قدم چوم لے۔

ربنا تقبل منا إنک أنت السمیع العلیم۔

خالد سیف اللہ رحمانی ۱۱؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ

(خادم: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد) ۲۰؍فروری ۲۰۱۶ء

• • •

کلیدی خطبہ

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام علىٰ سيد
الانبياء والمرسلين وعلىٰ آله وأصحابه اجمعين ، أما بعد ۔

صدر عالی قدر، حضرات علماء کرام اور دانشوران ذی احترام ! المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں آپ حضرات کی تشریف آوری اس ادارہ، اس کے ذمہ داران، اساتذہ اور طلبہ کے لئے بے حد خوشی ومسرت کا موقع ہے، نیز اس پروگرام کا انعقاد جس عظیم شخصیت اور بلند پایہ ہستی کی نسبت سے منعقد ہورہا ہے، اس پہلو سے خود مہمانوں کے لئے بھی سعادت وخوش بختی کا باعث ہے، دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملک وبیرونِ ملک سے حاضر ہونے والے غلامانِ بارگاہ نبوی کے اس اجتماع کو قبول فرمائے اور اسے نہ صرف اُمتِ مسلمہ بلکہ پوری انسانیت کے لئے خیر وفلاح، امن وآشتی اور اُخوت ومودت کا ذریعہ بنائے۔ آمین

نبوت کی ضرورت

حضرات ! اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی جو بستی بسائی ہے، وہ بڑی وسیع، خوبصورت اور متنوع ہے، ہزاروں مخلوقات ہیں اور ہر ایک دوسرے سے مختلف؛ بلکہ اپنی صلاحیتوں اور عادتوں کے اعتبار سے بالکل متضاد کیفیتوں کی حامل؛ لیکن وہ سب ایک مقررہ دستور کے مطابق اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں، سورج کو معلوم ہے کہ اسے مشرق سے نکلنا ہے اور مغرب کی سمت میں ڈوبنا ہے، سمندر ہزاروں سال سے اپنے دائرہ میں مسلسل بہہ رہا ہے اور اپنی تلاطم خیز موجوں کے ساتھ کروٹیں لیتا رہتا ہے، وہ فضا کو بادل کی سوغات دیتا ہے اور دن رات زمین کی آلائشوں کو تحلیل کرنے میں لگا ہوا ہے، جمادات ونباتات ہی نہیں، حیوانات کا بھی یہی حال ہے، ان کا کھانا پینا، لڑنا جھگڑنا، اپنی غذاؤں کو تلاش کرنا، حملہ کرنا اور مدافعت کرنا ہم اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں؛ لیکن قدرت نے ان کو بھی ان کی زندگی کا دستور پڑھا اور سمجھا دیا ہے، گائے اور بکری گھاس اور درخت کے پتے کھاتی ہے، شیر اور باز زندہ جانوروں کا شکار کرتا ہے، چیل مردار کی تلاش میں چپہ چپہ چھانتا پھرتا ہے، بعض جانور ہیں جو چارہ بھی کھاتے ہیں اور اپنے سے چھوٹے جانوروں کو بھی ہضم کر جاتے ہیں، پرندوں کو اپنا گھونسلہ بنانا اور چوہوں کو اپنا سرنگ نما مکان بنانا معلوم ہے، مکڑے جالے بُنتے ہیں اور شہد مکھیاں اپنا چھتہ تیار کرتی ہیں، جس میں اتنے کمرے ہوتے ہیں کہ شاید

بادشاہوں کے محلات میں بھی نہ رہتے ہوں، یہ سب اللہ کی رہنمائی اور ہدایت کا نتیجہ ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی''(طٰہٰ:۵۰) یعنی یہ رب کائنات کا کمال ہے کہ اس نے ہر چیز کو صورت بھی بخشی اور اسے زندگی گذارنے کے بارے میں راہ بھی سجھائی اور سلیقہ بھی سکھایا۔

اور یہ کچھ جانوروں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، حضرت انسان کے وجود میں بھی ہدایت ربانی کے اس تکوینی نظام کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور ماں کی چھاتی کی طرف لپکتا اور اس سے دُودھ پیتا ہے، آخر اس شیر خوار بچے کو کس نے بتایا کہ تمہاری غذا ماں کے سینہ میں ہے؟ اور پھر اس غذا کو ماں کے سینہ سے کشید کرنے کا سلیقہ کس نے سکھایا؟ ماں باپ کی ذرا سی بے توجہی ہو تو بچہ کا رونا اور لاڈ و پیار پر مسکرانا بھی اسی ہدایت ربانی کا مظہر ہے، اس بے زبان اور بے شعور بچہ کو کس نے سکھایا کہ دُکھ اور درد کا اظہار رو کر اور خوشی کا اظہار ہنس کر اور مسکرا کر کیا جاتا ہے؟

تو جب خدا نے ہر چیز کو ایک مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اور اسے دنیا میں رہنے سہنے کا طریقہ بتادیا ہے، تو کیا انسان کو اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے کسی طریقہ اور نظام کی ضرورت نہ ہوگی؟ یقیناً ہوگی، بلکہ زیادہ ہوگی؛ کیوں کہ انسان ایک حد تک بااختیار مخلوق ہے اور عقل وفہم کی نعمت نے اس کی نیکی اور بدی کے دائرہ کو بہت وسیع کردیا ہے، شیر ایک وقت میں ایک ہی انسان یا حیوان کو شکار بناتا ہے، سانپ ایک بار ڈس کر ایک وجود کو فنا کرسکتا ہے؛ لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ وہ ایک ایٹم بم کے ذریعہ بیک وقت ایک پورے خطہ کو تباہ و برباد کرسکتا ہے اور بیک جنبش پلک لاکھوں انسانوں کی جان لے سکتا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ سب سے زیادہ اس بات کا محتاج ہے کہ جینے اور مرنے کا سلیقہ سیکھے اور زندگی گذارنے کا طور وطریق جانے؛ لیکن سوال یہ ہے کہ انسان کو زندگی گذارنے کا طریقہ کون بتائے؟ غور کیا جائے تو ایک سیدھی سادھی اور دیکھی جانی حقیقت یہ ہے کہ جو شخص کسی مشین کو بناتا اور کسی شئ کو ایجاد کرتا ہے، وہی اس کی ضروریات سے آگاہ بھی ہوتا ہے اور اس کے لئے مناسب وغیر مناسب اور درست ونادرست طریقۂ استعمال کے صحیح فیصلے بھی کرسکتا ہے؛ اس لئے جب اللہ تعالیٰ انسان کے خالق و رب ہیں، اسی نے ہمیں پیدا کیا ہے اور اسی کے اشارۂ وحکم سے ہم اس کائنات میں زندہ ہیں تو ضرور ہے کہ وہی ہمیں زندگی کے طور وطریق بھی سمجھائے اور یقیناً اسی کا دیا ہوا نظام حیات ہمارے لئے مفید ہوسکتا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَ الۡاَمۡرُ''۔ (الاعراف:۵۴)

دنیا میں بھی آپ جب کسی کمپنی سے کوئی بڑی مشین حاصل کرتے ہیں تو وہ ایک طرف اس مشین کی تفصیلات پر مشتمل کتابچہ آپ کے حوالہ کرتی ہے اور ساتھ ساتھ اپنے ایک انجینئر کو بھی آپ کی مدد کے لئے بھیجتی ہے کہ کتاب

میں جونظریہ بیان کیا گیا ہے، یہ انجینئر اور ماہر کاریگر اس کو عملی طور پر برت کر دکھائے اور محسوس طریقہ پر سمجھائے، کسی تمثیل کے بغیر یہی صورت آسمانی کتاب اور انبیاء کی ہے، اللہ تعالیٰ کی کتابیں نظام حیات کی رہنمائی کرتی ہیں کہ انسان کو اس دنیا میں اپنی صلاحیتیں کس طرح استعمال کرنی چاہئیں؟ اور پیغمبر کی زندگی اس کی عملی صورت گری ہے، گویا پیغمبر کتاب الٰہی کی شرح اور اس کا بیان ہوتا ہے، ایک ایک حرف جو اس کی زبان سے نکلے، ایک ایک عمل جو اس کے اعضاء و جوارح سے صادر ہوا اور ایک ایک اختیاری کیفیت جو اس پر طاری ہو، منشاءِ ربانی کا اظہار اور انسانیت کے لئے اُسوہ ونمونہ ہے؛ اسی لئے فرمایا گیا کہ جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی: ''مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ''۔(النساء:۸۰)

گویا نبوت محض قلب وذہن کی تسلی کا سامان اور آخرت کی فلاح ونجات ہی کا ذریعہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ سب سے بڑی انسانی ضرورت ہے، جیسے وہ اپنے پیٹ کے لئے غذا کا، تن ڈھکنے کے لئے لباس وپوشاک کا، علاج کے لئے دوا کا اور اپنی مدافعت اور حفاظت کے لئے اسلحہ اور ہتھیار کا محتاج ہے، اس سے بڑھ کر وہ انبیاء اور انبیاء کی تعلیمات کا محتاج ہے؛ کیوں کہ انبیاء کی تعلیمات اس کے پورے وجود کے لئے غذا ہیں، وہ ذہن ودماغ کو بتاتی ہیں کہ انھیں کیا سوچنا چاہئے؟ وہ آنکھوں کی رہنمائی کرتی ہیں کہ انھیں کیا دیکھنا اور کیا نہ دیکھنا چاہئے؟ وہ زبان کو ہدایت دیتی ہیں کہ اللہ کی اس عظیم نعمت کا استعمال کن مقاصد کے لئے کیا جائے اور کن مفاسد سے بچا جائے؟ وہ ہاتھوں سے کہتی ہیں کہ یہ ظلم اور ظالموں کے خلاف اُٹھے نہ کہ مظلوموں اور کمزوروں کے خلاف، وہ پاؤں کو بتاتی ہیں کہ اسے نیکی اور حق کی راہ میں چلنا چاہئے نہ کہ باطل اور برائی کے راستہ میں، اور اس کی چال تو اضع وانکسار اور عجز وفروتنی کی ہونی چاہئے نہ کہ کبر وافتخار اور غرور واستکبار کی۔

پیغمبر اسلام — پوری انسانیت کے لئے رہنما شخصیت

حضرات ! اس دنیا میں شروع ہی سے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں اور کتابوں کو بھیجتے رہے ہیں، قرآن مجید کے بیان کے مطابق کوئی قوم ایسی نہیں گذری، جس میں اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں آئے ہوں: ''وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ''(فاطر:۲۴) اور خود ان کی زبان میں اللہ کی کتاب نہ اُتاری گئی ہو: ''وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ''(ابراہیم:۴) نبوت کا یہ سلسلہ محمد ﷺ پر پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا، دین وعقیدہ تو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے، جس کی بنیاد توحید، رسالت اور آخرت کا تصور ہے؛ لیکن انسانی ضرورتوں اور تمدنی ترقیوں کے لحاظ سے زندگی گذارنے کے قانون میں خالق کائنات کی طرف سے تھوڑی بہت تبدیلی کی جاتی رہی ہے، اسی قانون کو 'شریعت' کہتے ہیں۔

اس لئے اب پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت ہی قیامت تک کے لئے اور پوری انسانیت کے لئے کامل نمونہ اور مکمل رہنما ہے، یہ محض خوش گمانی نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس پر تاریخ کی شہادت موجود ہے؛ کیوں کہ پوری انسانیت کے لئے وہی شخصیت نمونہ بن سکتی ہے، جس میں کم سے کم تین باتیں پائی جائیں، اول: یہ کہ اس کی سیرت تاریخی طور پر محفوظ ہو اور ایسے مستند اور معتبر ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہو، جن پر ہم اعتماد کر سکیں، دوسرے: اس کا پیغام اور اس کا عطا کیا ہوا دستورِ زندگی تمام انسانیت کے لئے ہو، کسی مخصوص علاقہ یا نسل کے لوگوں کے لئے نہ ہو، تیسرے: اس کی سیرت زندگی کے ہر گوشہ کے لئے رہنمائی کرتی ہو اور اس کو اپنا رہنما تسلیم کرنے کے بعد انسان اپنی زندگی میں کہیں کوئی خلا نہیں پائے۔

اب تاریخی تحفظ کے اعتبار سے پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت دیکھئے کہ آپ ﷺ کی سیرت کے دو بنیادی مأخذ ہیں، کتاب اللہ اور سنت رسول، قرآن مجید کا حال یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے الفاظ؛ بلکہ اپنے رسم الخط اور لب ولہجہ کے ساتھ آج تک محفوظ ہے، آپ نے اپنی زندگی ہی میں خود اپنی نگرانی میں اس کی کتابت کرائی، (الاتقان فی علوم القرآن: ۱/۶۴) سورتوں اور آیتوں کی ترتیب قائم کی، (روح المعانی: ۱/۲۶) پھر آپ ﷺ کی وفات کے بعد ایک سال بھی نہ گذر پایا تھا کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے صحابہ سے نوشتے حاصل کر کے اس کو یکجا کیا اور لب ولہجہ کا جو ہلکا سا اختلاف تھا، اسے حضرت عثمان غنیؓ نے ختم کر کے اپنے عہدِ خلافت میں تمام لوگوں کو ایک ہی لہجہ پر متفق کر دیا، (مباحث فی علوم القرآن لمناع القطان: ۱۳۳) ـــــ وہ اس وقت سے آج تک ہر دور میں ہزاروں لاکھوں سینوں میں من وعن محفوظ ہے اور قرأت میں کہیں کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے، جس کو معنی میں تغیر کی حد تک اختلاف کہا جا سکے۔

دوسرا ماخذ ''حدیث'' ہے، احادیث تمام کی تمام آپ ﷺ کے صحابہ سے مروی ہیں، اس کے ایک قابل لحاظ حصہ کی کتابت خود آپ کے عہد میں ہو چکی تھی، آپ ﷺ کی وفات کے صرف سو سال بعد ہی احادیث کے بڑے بڑے مجموعے مرتب ہو گئے، ہر حدیث کی سند محفوظ ہے اور کتابوں میں درج ہے، سند میں آنے والے تمام راویوں کے حالات بھی محفوظ ہیں، انھیں دیکھ کر آج بھی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس حد تک مستند یا غیر مستند ہیں؟

تاریخی طور پر ایسا تحفظ کسی اور مذہبی پیشوا کے حصہ میں نہ آ سکا، اب ظاہر ہے کہ تاریخی استناد اور تحفظ کے لحاظ سے ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آپ ہی کی ذات گرامی کی طرف رُجوع کریں۔

دوسرے: کسی مذہب کے عالمگیر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ پوری انسانیت کو مخاطب کرتا ہو اور وہ ان کو ایک نظر سے دیکھتا ہو، اس نقطۂ نظر سے پیغمبر اسلام کو دیکھئے کہ قرآن نے صاف اعلان کیا ہے کہ آپ ﷺ کو تمام انسانیت کی طرف بھیجا گیا ہے: ''وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ'' (سبا: ۲۸) نیز قرآن مجید کو تمام انسانوں کے لئے

ہدایت کا پیغام قرار دیا گیا ہے، (البقرۃ: ۱۸۵) بلکہ آپ ﷺ کو پورے عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے: ''وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ''۔(الانبیاء: ۱۰۷)

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کی بارگاہِ نبوت میں حبش کے بلال بھی ہیں، روم کے صہیب بھی، فارس کے سلمان بھی ہیں، بنی اسرائیل کے عبداللہ بن سلام بھی اور یمن کے ابو ہریرہ بھی، (رضی اللہ عنہم) اس دربار میں نہ رنگ کی بنیاد پر کوئی تفریق ہے نہ نسل کی بنیاد پر، نہ علاقہ کی بنیاد پر کوئی امتیاز ہے، نہ زبان کی بنیاد پر۔

پوری انسانیت کے لئے اُسوہ ہونے کی تیسری بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کی سیرت میں زندگی کے تمام گوشوں کے لئے رہنمائی موجود ہو، اس کا بہترین نمونہ اگر کہیں مل سکتا ہے تو وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت ہے، انسان خلوت میں ہو یا جلوت میں، بزرگوں کے ساتھ ہو یا عزیزوں کے ساتھ، بزم میں ہو یا رزم میں، دشمنوں کا سامنا ہو یا دوستوں کا، عدالت کی کرسی پر ہو یا خود مقدمہ کا فریق ہو، تخت اقتدار پر ہو یا کسی کے اقتدار کے تحت، استاذ ہو یا طالب علم، آقا ہو یا غلام، تجارت و کاروبار میں ہو یا اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز میں، رنج و الم کی شام ہو یا مسرت و شادمانی کی صبح، فتح سے ہمکنار ہو یا شکست سے دوچار، اولاد ہو یا ماں باپ، شوہر و بیوی ہو یا بھائی بہن، مریض ہو یا معالج، تیماردار ہو یا خود تیمارداری کا محتاج، سرمایہ دار اور آجر ہو یا مزدور و اجیر، قرض دہندہ ہو یا مقروض، دولت مند ہو یا غریب، جوان ہو یا بوڑھا، سفر میں ہو یا حضر میں، عالم ہو یا جاہل، خدا کی توفیق سے نیک عمل اس نے کئے ہوں یا اس کا دامن عمل گناہ سے آلودہ ہو، غرض ہر موقعہ پر اور ہر حالت و کیفیت میں اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کا عملی نمونہ یا آپ ﷺ کے ارشادات اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔

انقلاب انگیز شخصیت

قرآن مجید نے جو آپ ﷺ کو تمام عالم کے لئے رحمت قرار دیا ہے: ''وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ''(الانبیاء: ۱۰۷) اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کی انقلاب انگیز تعلیمات پوری انسانیت کے لئے نفع اور خیر و فلاح کی ضامن ہیں، پیغمبر اسلام ﷺ کی انقلابی شخصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے کہ آپ کے ذریعہ آئے ہوئے دین کو اللہ تعالیٰ غلبہ عطا کریں گے: ''لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ''(التوبۃ: ۳۳) یہ صرف دعویٰ نہیں ہے؛ بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے، آپ کے ذریعہ دنیا میں جو فکری انقلاب آیا اور اس کے نتیجہ میں ترقی اور انصاف کے راستے کھلے، وہ پیغام محمدی کے غلبہ کی واضح مثال ہیں، پیغمبر اسلام ﷺ نے جس صالح انقلاب سے دنیا کو بہرور کیا اور آپ ﷺ کی صحبت بافیض نے ذرہ کو آفتاب بنا دیا، اکبر الہ آبادی نے اس کا خوب نقشہ کھینچا ہے :

دُر فشانی نے تری ، قطروں کو دریا کردیا
دل کو روشن کردیا ، آنکھوں کو بینا کردیا
خود نہ تھے جو راہ پر ، اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا !

وحدتِ اِلٰہ

حضرات ! یوں تو آپ ﷺ کے ذریعہ زندگی کے ہر شعبہ میں دُور رس اثرات کی حامل تبدیلیاں آئیں، ابھی ان سب کے ذکر کا موقع نہیں؛ لیکن ان میں سے چند پہلوؤں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، ان میں پہلی بات یہ ہے کہ آپ نے انسانیت کو 'وحدتِ اِلٰہ' کا تصور دیا، خدا کو ایک ماننا بظاہر ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے؛ لیکن بمقابلہ الحاد وانکار اور شرک ومخلوق پرستی کے یہ ایک انقلابی عقیدہ ہے، خدا کا انکار انسان کو غیر ذمہ دار، گناہوں کے بارے میں جری اور مادہ پرست بنا دیتا ہے؛ کیوں کہ اسے جواب دہی کا کوئی خوف نہیں ہوتا، دنیا اس کے لئے محض عشرت کدۂ حیات ہوتی ہے، اور وہ خدا کی بندگی سے آزاد اور لذت وعیش کا غلام بن جاتا ہے، اللہ کے ایک ہونے کے تصور سے انسانیت کی تکریم اور اس کا اعزاز متعلق ہے، یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اس کی پیشانی غیر اللہ کے سامنے جھکنے سے ماوراء ہے اور خدا نے اس کو پوری کائنات پر فضیلت بخشی ہے، عقیدہ توحید نے انسانیت کو اوہام پرستی سے نجات دلایا؛ کیوں کہ توحید پر ایمان رکھنے والا اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ مخلوق اسے نفع ونقصان پہنچانے سے عاجز ہے، توحید کا عقیدہ انسان کے اندر خدا کی محبت اور خدا کا خوف پیدا کرتا ہے اور یہی خشیت اور خدا کو راضی کرنے کا جذبہ، فرائض کی ادائے گی کا احساس پیدا کرتی ہے اور وہ دنیا کو قصر عشرت سمجھنے کے بجائے محل امتحان سمجھ کر پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے؛ اس لئے توحید کا عقیدہ انسانیت کے لئے بہت بڑی نعمت اور سامان رحمت ہے، جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ انسانیت کو حاصل ہوا ہے۔

گو حضور ﷺ سے پہلے بھی انبیاء نے توحید کی تعلیم دی اور بہت سے مصلحین نے بھی شرک کی تردید وانکار کا فریضہ انجام دیا؛ لیکن حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک ہمیشہ انسانیت پر مشرکانہ فکر کا غلبہ رہا، یہاں تک کہ جو مذاہب توحید کا علم لے کر اُٹھے تھے، وہ خود بھی شرک کے رنگ میں رنگ گئے، عیسائیوں نے حضرت مسیح کی اُلوہیت کو اپنے عقیدہ کا بنیادی جز و بنالیا، ہندو مذہب میں بھی توحید کا عنصر موجود ہے، مگر انھوں نے لاتعداد خدا تخلیق کر لئے، بودھ مذہب کی بنیاد مذہب کے شارحین کے خیال کے مطابق خدا کے انکار پر ہے؛ لیکن بودھ مذہب کے متبعین نے خود بودھ جی کی پرستش شروع کردی، رسول اللہ ﷺ نے توحید کی فکر کو اس طرح غالب

فرمایا کہ وہ قیامت تک کے لئے ایک غالب فکر بن گئی، یہاں تک کہ جن مذاہب کی اساس شرک پرتھی، ان میں بھی ایسی تحریکات اُٹھیں، جوتوحید کی داعی تھیں۔

انسانی وحدت

آپ ﷺ کی دوسری اہم تعلیم ''انسانی وحدت'' کا تصور ہے، آپ کی بعثت سے پہلے قریب قریب دنیا کی تمام تہذیبوں اور مذاہب میں انسان اور انسان کے درمیان فرق کرنے اور کچھ لوگوں کے پیدائشی طور پر معزز اور کچھ لوگوں کے حقیر ہونے کا تصور موجود تھا، یہودی اسرائیلی اور غیر اسرائیلی میں امتیاز کرتے تھے اور جو لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے ہوں، ان کو پیدائشی طور پر افضل و برتر جانتے تھے اور آج بھی ان کا یہی تصور ہے، ایران کے لوگوں کا خیال تھا کہ جو لوگ بادشاہ کی نسل سے ہوں، وہ خدا کے خاص اور مقرب بندے ہیں؛ بلکہ خدا کا کنبہ ہیں، ہندوستان کا حال تو شاید سب سے خراب تھا کہ انسانیت کو مستقل طور پر چار طبقوں میں تقسیم کردیا گیا تھا، کچھ لوگوں کے بارے میں تصور تھا کہ وہ خدا کے سر سے پیدا کئے گئے ہیں، کچھ لوگ خدا کے بازو سے، کچھ کی پیدائش خدا کے ران سے ہوئی ہے اور کچھ کی پاؤں سے، یہ برہمن، ویش، کھتری اور شودر کہلاتے تھے،شودر اتنا بدقسمت گروہ تھا کہ تاریخ عالم میں شاید ہی ایسی اجتماعی اور قومی مظلومیت کی مثال مل سکے، ان پر تعلیم کا دروازہ بند تھا، ان کے لئے کچھ ذلیل سمجھے جانے والے پیشے مخصوص تھے اور وہ اونچی ذاتوں کے پیدائشی غلام سمجھے جاتے تھے، کم وبیش یہی حال دنیا کے مختلف علاقوں اور مختلف قوموں میں تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے ان حالات میں انسانی وحدت کا تصور پیش کیا اور پیدائشی طور پر افضل و برتر اور حقیر و کہتر ہونے کے تصور کو رد فرما دیا، آپ ﷺ نے صاف اعلان کیا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر محض رنگ و نسل کی وجہ سے کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے؛ بلکہ فضیلت کا معیار انسان کا تقویٰ اور اس کا عمل ہے، اس اعلان نے عرب کے معزز قبائل اور حبش وروم کے بلال ؓ وصہیب ؓ کو ایک صف میں کھڑا کردیا؛ بلکہ یہ عجمی نژاد غلام جو کبھی حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، زعماء عرب کے لئے وجہ رشک بن گئے اور حضرت عمر فاروق ؓ جیسے فرمانروا بھی انھیں ''سردار'' کے لفظ سے مخاطب کیا کرتے تھے، یہ آپ ہی کی تعلیمات کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے پھیلنے کے ساتھ ہی تفریق و امتیاز کی زنجیریں کٹنے لگیں، انسانی مساوات کے نعرے ہر سو بلند ہوئے اور دنیا کی مظلوم و مقہور قوموں کو پیدائشی غلامی سے آزادی نصیب ہوئی، اگر کہیں کسی انسانی گروہ نے اپنی شقاوت اور جور و جفا سے اس ظلم کے سلسلہ کو جاری بھی رکھا، تو ان کو ہر طرف سے طعن و تشنیع کے الزام سننے پڑے اور مظلوموں کو ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا موقع فراہم ہوا، یہ آپ ﷺ کی رحمت عامہ کا ایسا پہلو ہے کہ کوئی صاحب بصیرت اُسے نظر انداز نہیں کرسکتا۔

اس وحدت انسانی کے تصور نے زندگی کے تمام شعبوں پر اپنا اثر ڈالا، تمام لوگوں کے لئے ہر طرح کے پیشہ کا دروازہ کھل گیا اور پیشوں کی تحقیر وتذلیل کا تصور ختم ہوا، علم کی روشنی عام ہوئی اور ہر ایک کے لئے تعلیم کا دروازہ کھلا، سماجی زندگی میں ہر ایک کے لئے باعزت طریقہ پر زندگی بسر کرنے کا موقع فراہم ہوا، جرم وسزا کے باب میں انصاف کا قائم کرنا ممکن ہوا، اور ہر ایک کے لئے اپنی تہذیب اور اپنی روایات کا تحفظ ممکن ہوسکا۔

اس انسانی وحدت کے تصور نے ایک نمایاں اثر سیاسی نظام پر بھی ڈالا، اسلام سے پہلے پوری دنیا کے سیاسی اُفق پر ملوکیت کا تصور چھایا ہوا تھا اور اس کے مقابلہ میں کوئی اور نظام سیاست عملاً موجود نہیں تھا، ظہور اسلام کے وقت جتنی معلوم طاقتیں تھیں، وہ سب ملوکیت کی نمائندہ تھیں، روم میں بادشاہت تھی، ایران میں بادشاہت تھی، حبش میں بادشاہت تھی، یمن میں بادشاہت تھی، ہندوچین کے علاقوں میں بھی چھوٹے بڑے راجا تھے، غرض پوری دنیا بادشاہت کے آمرانہ نظام اور پنجہ استبداد کے تحت تھی، یہاں تک کہ یونان کے فلاسفہ نے جس جمہوریت کا نقشہ پیش کیا تھا، اس میں بھی ''اَشراف'' کی حکومت کا تصور تھا اور اقتدار میں عام لوگوں کی شرکت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اسلام نے انسانی وحدت اور مساوات کا جو تصور پیش کیا، اس نے خاندانی بنیاد پر حکومت واقتدار کے ارتکاز اور فرمانروائی کے تصور کو پاش پاش کردیا اور جمہوریت کے تصور نے غلبہ حاصل کرلیا؛ چنانچہ آج صورت حال یہ ہے کہ پوری دنیا میں جمہوری نظام قائم ہے، جو اسلام کے تصور خلافت سے مستعار اور اپنی بعض خامیوں کے باوجود انسانی وحدت ومساوات کا علمبردار ہے، یہاں تک کہ آج یا تو بادشاہت کا وجود ہی نہیں ہے، یا ہے تو محض دستوری اور علامتی بادشاہت ہے، اور اگر کہیں جبراً آمرانہ ملوکیت باقی ہے تو وہ پوری دنیا کی نگاہ میں قابل تحقیر اور لائق ملامت ہے۔

علم کی حوصلہ افزائی

تعلیماتِ محمدی کا تیسرا اہم پہلو علم کی حوصلہ افزائی ہے، آپ جس سماج میں تشریف لائے، وہاں لوگ اس بات کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے کہ وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے، وہ بہت ہی فخر کے ساتھ اپنے ''اُمّی'' ہونے کی بات کہتے تھے، آپ ﷺ نے تعلیم وتعلم کی حوصلہ افزائی کی اور علم کو بلا امتیاز وتفریق ہر طبقہ کے لئے عام فرمایا، پھر آپ نے علم کے معاملہ میں دین ودنیا کی کوئی تقسیم نہیں کی؛ بلکہ ہر وہ علم جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو، خدا سے اس کی دُعاء کی اور فرمایا کہ علم وحکمت کی جو بات جہاں سے مل جائے، اس کی طرف اسی طرح لپکنا چاہئے، جیسے انسان اپنی گم شدہ چیز کے لئے لپکتا ہے: ''الحکمة ضالة المؤمن'' (ترمذی، ابواب العلم، حدیث نمبر: ۲۶۸) آپ ﷺ نے مسلمان بچوں کو بدر کے غیر مسلم قیدیوں سے تعلیم دلائی اور مدینہ میں یہودیوں کی درس گاہ ''بیت المدراس'' میں تشریف لے گئے، جس سے علم کے باب میں آپ کی فراخ قلبی اور کشادہ چشمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس سے نہ صرف یہ کہ علم کا دور دورہ ہوا؛ بلکہ غیر سائنٹفک فکر کی جگہ سائنٹفک فکر کا غلبہ ہوا، اور توہمات کی زنجیریں کٹ گئیں، شرک میں چوں کہ مخلوقات کو معبود کا درجہ دیا جاتا ہے اور جو معبود ہو، اس کی عظمت اور اس کا احترام تحقیق وتجسس میں مانع بن جاتا ہے؛ اس لئے وہ علمی ترقی اور تحقیق وسائنس کے ارتقاء میں رکاوٹ بن جاتی ہے، توحید چوں کہ مخلوقات کے معبود ہونے کی نفی کرتی ہے؛ اس لئے کائنات کی تمام اشیاء پر غور وفکر، بحث وتحقیق اور تفحص وتجسس کا راستہ کھلتا ہے، انسان علم میں جتنا آگے بڑھتا جائے اور کائنات کے حقائق پر جو پردے پڑے ہوئے ہیں، ان کو جس قدر اُٹھاتا جائے، وہ اسی قدر توہمات سے آزاد ہوتا جائے گا۔

دین ودنیا کی وحدت

چوتھے: اسلام سے پہلے اہل مذاہب نے دین اور دنیا کا بٹوارہ کر رکھا تھا اور دین ودنیا کی اس تقسیم کی وجہ سے بعض انسانی گروہ قانون فطرت کے خلاف بغاوت پر آمادہ تھے، نکاح کو بری بات سمجھا جاتا تھا، قرب خداوندی کے لئے تجرد کی زندگی ضروری سمجھی جاتی تھی اور مرد وعورت کے فطری تعلق کو بہرصورت گناہ باور کیا جاتا تھا، کسبِ معاش کی محنتوں کو دین داری کے مغائر اور رضائے خداوندی میں رکاوٹ گمان کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ رہبانیت کے غلبہ کا یورپ میں ایک ایسا دور بھی گذرا ہے کہ لوگ نہانے، دھونے، صاف ستھرے کپڑے پہننے اور خوشبو استعمال کرنے کو بھی للّٰہیت کے خلاف سمجھتے تھے اور دسیوں سال غسل سے مجتنب رہتے تھے، مذہب کے متبعین میں بھی اس طرح کا تصور عام تھا، رسول ﷺ کی رحمت کا ایک اہم باب رہبانیت کے اس تصور کا خاتمہ ہے، آپ ﷺ نے تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی حدود میں رہتے ہوئے دنیا سے نفع اُٹھانا بھی دین کا ایک حصہ ہے —— ’دین‘ دنیا سے نفع اُٹھانے میں حلال وحرام کی تمیز کا نام ہے نہ کہ دنیا کو ترک کر دینے کا؛ چنانچہ آپ نے نکاح کرنے کا حکم دیا، اس کو اپنی اور انبیاء کی سنت قرار دیا اور تجرد کی زندگی کو ناپسند فرمایا، کسب معاش کو ایک اہم فریضہ قرار دیا اور اس کی حوصلہ افزائی فرمائی، صفائی ستھرائی کی تعلیم دی اور کوئی ایسا حکم نہیں دیا، جو انسانی فطرت سے متصادم ہو؛ بلکہ انسانی فطرت میں جو تقاضے اور داعیے رکھے گئے ہیں، ان سب کو جائز رکھا گیا اور ان کے لئے مناسب حدود مقرر کر دی گئیں۔

عورتوں کی توقیر

پانچویں: آپ ﷺ کا ایک اہم کارنامہ ہے عورتوں کو عزت واحترام کا مقام حاصل ہونا، اور انسانی سماج میں ان کی قدردانی، اسلام دنیا میں اس وقت آیا جب عورت کو گناہ کا دروازہ اور نحس کا سبب سمجھا جاتا تھا، ان کے بارے میں تصور تھا کہ وہ شادی سے پہلے باپ کی اور شادی کے بعد اپنے شوہر کی ملکیت ہوتی ہے، وہ چوں کہ خود ایک

مملوکہ شئے ہے؛ اس لئے اس کو مالک ہونے کا حق نہیں تھا؛ اسی لئے انھیں حصۂ میراث نہیں ملتا تھا، عرب کے بعض قبائل میں تو لڑکیاں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں، اس بات میں بھی اختلاف تھا کہ کیا عورت کا شمار انسانوں میں ہے؟ یہاں تک کہ یونان کے فلاسفہ بھی کہتے تھے کہ عورت کے اندر انسان سے کمتر اور حیوان سے برتر روح پائی جاتی ہے، یعنی وہ انسان اور حیوان کے درمیان کی ایک مخلوق ہے۔

ان حالات میں آپ ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور بتایا کہ مرد و عورت ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہونے والی دو صنفیں ہیں، (النساء:۱) پہلے حضرت حواء علیہا السلام کی طرف گناہ کی نسبت کی جاتی تھی، قرآن نے اس داغ کو صاف کیا: ''عَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى'' (طٰہٰ:۱۲۱) اور اس کا اصل محرک شیطان کو قرار دیا: ''فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ'' (البقرۃ:۳۶) عورت کو بیٹی، بیوی اور ماں کی حیثیت سے مردوں سے بڑھ کر درجہ دیا، ان کو نکاح کرنے، اپنے مال میں تصرف کرنے، تعلیم حاصل کرنے، اپنے خیالات کا اظہار کرنے، شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ کسب معاش کرنے وغیرہ کی اجازت دی اور انھیں معاشرہ میں عزت کا مقام دیا، انیسویں صدی کے وسط تک مغربی ملکوں میں عورت کو حق میراث نہیں ملتا تھا، برادرانِ وطن کے یہاں ۱۹۵۰ء تک عورت کو حق میراث حاصل نہیں تھا؛ لیکن اسلام نے اول دن سے بیٹی کو اپنے والدین کے، ماں کو اپنی اولاد کے، بیوی کو اپنے شوہر کے ترکہ میں سے لازمی وارث بنایا اور بعض حالات میں دوسری خاتون رشتہ داروں کو بھی میراث میں حق دیا، آج بھی غیر مسلم سماج میں شریک حیات کے انتخاب میں زیادہ تر لڑکیوں سے مشورہ نہیں لیا جاتا، مشرق سے لے کر مغرب تک آج عورتوں کو جو حقوق دیئے گئے ہیں، یا ان کی آزادی کا جو نعرہ لگایا جا رہا ہے، یہ سب رسول اللہ ﷺ کی انقلاب انگیز تعلیمات کا نتیجہ ہے۔

اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ ﷺ کی ذات صرف مسلمانوں کے لئے نہیں؛ بلکہ پوری انسانیت اور تمام عالم کے لئے رحمت بیکراں ہے۔

مذہبی مقدس شخصیتوں کی بے احترامی — ایک جرم عظیم!

حضرات! یہ ایک حقیقت ہے کہ محبت و احترام کے جتنے رشتے ہیں، ان میں سب سے گہرا اور جذباتی تعلق مذہبی پیشواؤں اور مذہب کی مقدس شخصیتوں سے ہوتا ہے، جو شخص کسی مذہب سے تعلق رکھنے میں سنجیدہ ہو اور جو دل کی گہرائی سے اس پر یقین رکھتا ہو، اس کے لئے اس سے بڑھ کر دل آزاری کی کوئی اور بات نہیں ہو سکتی کہ جو شخصیتیں اس کے لئے مرجع عقیدت ہیں، ان کی شان میں گستاخی کی جائے؛ اس لئے اسلام نے کسی بھی مذہب کی مقدس شخصیتوں کو برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے: ''وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' (الانعام:۱۰۸)؛ اس لئے مذہبی مقدس شخصیتوں کی اہانت نا قابل معافی جرم ہے، غور کیجئے کہ ملک کے جھنڈے کی بے احترامی جرم ہے اور یہ

یقیناً بجا ہے؛ کیوں کہ اس سے ایک ملک کے لوگوں کے جذبات وابستہ ہیں تو مذہبی مقدسات سے تو ایک ملک ہی کے نہیں کئی ملکوں کے، اور ایک قوم ہی کے نہیں کئی قوموں کے جذبات وابستہ ہوتے ہیں، ان کی بے احترامی سے نہ جانے کتنے لوگوں کے جذبات کا قتل ہوتا ہے، تو کیا ایسے دریدہ دہن مجرمین سخت سے سخت سزا کے مستحق نہیں ہیں؟ کچھ لوگ اس کو اظہار خیال کی آزادی قرار دیتے ہیں، یہ قطعاً غیر منصفانہ، غیر سنجیدہ اور ناروا سوچ ہے، آپ کی آزادی کی سرحدیں وہاں پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں، جہاں سے دوسروں کی دل آزاری شروع ہوتی ہے، اگر آزادی کے لئے حدود وشرائط نہ ہوں تو ایسی بے قید آزادی انسانیت کے لئے رحمت کی بجائے زحمت اور فائدہ مند ہونے کی بجائے مضرت رساں ہوگی، یہ ایسی ہی آزادی ہے کہ جیسے کوئی چور اپنے لئے چوری کرنے کی آزادی اور کوئی غنڈہ اپنے حق میں قتل وغارت گری کی آزادی کا مطالبہ کرنے لگے۔

مسلمان علماء اور مذہبی پیشواؤں نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا ہے کہ وہ دوسرے مذہب کی مقدس شخصیتوں کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہیں، جو ان کے ماننے والوں کے لئے دل آزاری کا سبب ہو، یہ بات قابل تحسین ہے کہ برادرانِ وطن کا بھی عمومی مزاج یہی رہا ہے کہ دوسرے مذاہب کی مقدسات کی اہانت سے بچا جائے، ہندو مفکرین وادباء اور شعراء نے پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں جس عقیدت ومحبت کے کلمات استعمال کئے ہیں، وہ بے حد قابل تحسین ہیں، اسی طرح ہمیں اسلامی شاعر علامہ اقبالؒ کے یہاں شری رام جی اور گرو نانک جی کا ذکر پورے احترام کے ساتھ ملتا ہے، ہم سبھوں کا فریضہ ہے کہ اس روایت کو باقی رکھیں، حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مذہبی مقدس شخصیتوں کی بے احترامی کے سلسلہ میں مؤثر قانون وضع کرے اور جو لوگ اس کا خیال نہیں رکھیں، ان کو قرار واقعی سزا دے، کہ یہ بدترین اخلاقی دہشت گردی ہے، عالمی سطح پر بھی ایسا قانون ضروری ہے جو تمام مذہبی شخصیتوں اور کتابوں کے احترام کو یقینی بنائے، اور یہ قانون مذاہب کے درمیان تفریق پر مبنی نہ ہو، نیز اقوام متحدہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں پہل کرے؛ کیوں کہ اس سے عالمی امن متعلق ہے اور اس کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے باہمی نفرت جنم لیتی ہے۔

حضرات گرامی ! اس سیمینار کے لئے سیرت نبوی کے موضوع کو اختیار کرنے میں ایک تو یہ بات پیش نظر ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی حیاتِ طیبہ ایک گل سدا بہار ہے، دنیا جوں جوں آگے بڑھتی جائے گی، اس بات کی ضرورت بڑھتی جائے گی کہ آپ کے اُسوہ سے روشنی حاصل کی جائے، اور یہ حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ان کا حل اُسوۂ محمدی ہی میں مل سکتا ہے، دوسرا خاص محرک یہ ہے کہ مغرب کو مسلمانوں کی خوں آشامی سے کسی طور سیری نہیں ہوتی اور اب اس نے جان ومال اور عزت وآبرو پر حملہ سے آگے بڑھ کر مسلمانوں کو

قلبی وروحانی تکلیف پہنچانے کے لئے پیغمبر اسلام ﷺ کی اہانت کو اپنا ہتھیار بنایا ہے، پہلے بھی مستشرقین کی طرف سے رسول اللہ ﷺ پر تنقیدیں کی جاتی تھیں اور ان کا لٹریچر بے دلیل اور خلاف واقعہ اتہامات سے بھرا پڑا تھا؛ لیکن عام لوگوں کو اس سے دلچسپی نہیں تھی، مگر اب سوشل میڈیا کی وجہ سے ہر بات ــــ چاہے اس کے پیچھے کوئی دلیل اور واقعاتی بنیاد نہ ہو ــــ ہر کچے پکے گھر تک پہنچادی جاتی ہے؛ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے اور نئی نسل مغرب کے پھیلائے ہوئے اس فکری دام میں پھنسنے نہ پائے، خدا کرے یہ سیمینار اپنے ان مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو، یہ نئی نسل کو راہِ راست پر قائم رکھنے، اللہ کے بندوں کو اللہ سے ملانے اور رسول اللہ ﷺ کے دامن نبوت سے وابستہ کرنے میں مؤثر ثابت ہو، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

پیغمبر اسلام ﷺ اور سرزمین ہند

حضرات ! یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان اگرچہ سرزمین حجاز سے کافی فاصلہ پر واقع ہے؛ لیکن اسے پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت سے ایک خاص نسبت ہے، متعدد روایتیں ــــ جو اگرچہ ضعف سے خالی نہیں ہیں ــــ بتاتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کا نزول سراندیپ یعنی سری لنکا میں ہوا، جو اُس وقت ہندوستان کا ایک حصہ تھا، آج بھی 'کوہ آدمؑ' کے نام سے ایک پہاڑ سری لنکا میں موجود ہے، حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی، ان روایات کی رُو سے پہلی بار نبوت کا آفتاب اسی خوش نصیب سرزمین میں طلوع ہوا، گویا وحی الٰہی کا جو سلسلہ حجاز مقدس میں تکمیل وانجام کو پہنچا، اس کی ابتدا ہندوستان ہی سے ہوئی، خود رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا گیا ہے کہ مجھے ہندوستان سے ربانی خوشبو آتی ہے، علامہ اقبالؒ نے اسی کو کہا ہے :

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

عرب سیاحوں کے سفرناموں میں اس بات کا بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ 'معجزۂ شق القمر' کو دیکھ کر مالابار کے ایک راجہ نے اسلام قبول کرلیا تھا، اگر یہ تاریخی روایات درست ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یمن اور شام وایران سے بھی پہلے نبوت محمدی کی روشنی ہندوستان پہنچ چکی تھی، کم سے کم یہ بات تو ثابت ہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والے صحابہ میں متعدد لوگ ہندوستان تشریف لائے ہیں، قاضی محمد اطہر مبارکپوریؒ نے اپنی کتاب ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' میں ستر صحابہ کا ذکر کیا ہے، اور مشہور محقق محمد اسحاق بھٹیؒ نے اپنی تالیف ''برصغیر کے اولین نقوش'' میں آٹھ ناموں کا اضافہ کرکے اس تعداد کو پچیس تک پہنچادیا ہے، تابعین اور تبع تابعین اس کے علاوہ ہیں، اس لئے یقیناً ہندوستان پر حق ہے کہ وہ ذکر رسول (ﷺ) کی خوشبو سے معطر ہو اور اس خوشبو کو اقصائے عالم تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کرے۔

حیدرآباد پر ایک نظـــر!

حضرات ! خوشی کی بات ہے کہ اس وقت ہندوستان کا ایک تاریخی شہر حیدرآباد جس کا تاریخی نام ''فرخندہ بنیاد'' ہے، آپ کے لئے دل کی آنکھیں بچھائے ہوا ہے، اس شہر کی بنیاد ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۹۰ء میں محمد قلی قطب شاہ جیسے عابد شب بیدار بادشاہ نے رکھی ، اور خود اسے یہ شہر ایسا بھایا کہ اُس نے اِس شعر سے اپنے ہی بنائے اور بسائے ہوئے شہر کو داد دی :

لطیف و دل کشا آب و ہوائے
مبارک منزلے فرخندہ جائے

یہ شہر اور دکن کا پورا خطہ ابتدائی دور ہی سے علم وادب کا مرکز رہا ہے، اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی دکنی کا اور اُردو کی پہلی نثر ''معراج العاشقین'' جو خواجہ گیسو دراز ؒ کی طرف منسوب ہے، دونوں کا تعلق دکن سے تھا، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ اُردو کی جائے پیدائش اور جائے پرورش ہے، زمانہ قدیم کے علاوہ ماضیٔ قریب میں بھی اس شہر میں بڑی اہم شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں، جامعہ نظامیہ کے بانی فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ شاہ فاروقی، محدث دکن مولانا عبداللہ شاہ، تحریک اسلامی کے مؤسس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مقبول واعظ و مصلح مولانا حسام الدین فاضل، صحاحِ ستہ کے مترجم نواب وحید الزماں حیدرآبادی اور میدان تحقیق کے درآبدار ڈاکٹر محمد حمید اللہ —— رحمہم اللہ —— اسی شہر سے تعلق رکھتے ہیں، اسی طرح امجد حیدرآبادی جیسے رباعی گو اور اخلاقیات کے ترجمان، مخدوم محی الدین جیسے باغیانہ تیور کے شاعر اور جدید لب ولہجہ کے شعراء شاذ تمکنت اور اوج یعقوبی کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا، ماضی قریب کی شخصیتوں میں مجلس تعمیر ملت کے بانی سید خلیل اللہ حسینی ، بلند پایہ واعظ و عالم حضرت مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقل اور بالغ نظر حوصلہ مند معروف قائد سلطان صلاح الدین اویسی یہیں پیدا ہوئے اور یہیں سے ان کی کوششیں پورے ہندوستان تک پہنچیں۔

شہر کی بنیـاد بھی ایک ایسے بادشاہ نے رکھی، جو سلطان ہونے کے باوجود درویش تھا، اور اس شہر میں اسلام کی دعوت واشاعت کا کام بھی ایک صاحب نسبت بزرگ بابا شرف الدینؒ عراقی سے ہوا ہے، جو براہ راست شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مجاز تھے، یہ عراق سے شمالی ہندوستان اور وہاں سے دکن تشریف لائے، ۶۸۷ھ میں آپ کی وفات ہوئی، آپ کی قبر شہر کے ایک کنارے یہاں سے قریب ایک پہاڑی پر موجود ہے، جو بابا شرف الدین کی پہاڑی کہلاتی ہے، آپ کے ساتھ آپ کے بھائی بابا شہاب الدین بھی تشریف لائے تھے، جنھوں نے اس علاقہ میں بڑا دعوتی کام کیا اور بابا شرف الدین کے چار سال بعد وفات پائی، اس علم پرور شہر میں بہت سے علماء یمن،

افغانستان اور شمالی ہند کے علاقوں سے آ کر بھی خیمہ زن ہوئے ہیں، مولانا حافظ محمد احمد دیوبندی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا سید عبدالباری ندوی، مولانا فضل اللہ جیلانی، پروفیسر الیاس برنی، مولانا عبدالقدیر بدایونی، مولانا ابوالوفاء افغانی، مولانا محمد رضوان القاسمی ـــــ رحمہم اللہ ـــــ وغیرہ ان ہی علماء میں ہیں، یہیں ان کی مسند فیض بچھی اور یہیں سے ان کے علم کی روشنی پوری دنیا میں پہنچی، ان کے علاوہ یہ شہر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور ماہر القادری نیز جوش ملیح آبادی جیسے علماء وادباء کا بھی میزبان رہا ہے۔

یہ شہر تحریکوں اور اداروں کا بھی مرکز رہا ہے، خاص کر جامعہ نظامیہ ہندوستان کی قدیم دینی درسگاہوں میں سے ایک ہے، جس کے فیض یافتگان ہندوستان کے علاوہ بیرون ملک میں بھی بکثرت موجود ہیں، دوسرا اہم بلکہ مایہ افتخار ادارہ ''دائرۃ المعارف العثمانیہ'' ہے، حدیث ورجال، فقہ وتاریخ، طب ولغت اور تفسیر کے بہت سے مخطوطات پہلی بار دائرہ سے شائع ہوئے، شیخ علی متقی کی ''کنز العمال''، علامہ سمعانی کی ''کتاب الأنساب''، امام محمد بن حسن الشیبانی کی ''کتاب الأصل''، علامہ ذہبی کی ''تذکرۃ الحفاظ'' اور نہ جانے کیسے کیسے علمی ذخیرے ہیں، جو دائرۃ المعارف کے واسطے سے اہل علم کی آنکھوں کا سرمہ بنے اور اس کے ذریعہ یہ علمی امانتیں مخطوطات کے دفینوں سے مطبوعات کے سفینوں تک پہنچیں، جب کہ اس وقت عربی کتابوں کی طباعت آسان نہیں تھی۔

جب ذکر اداروں کا آیا ہے تو دو'مرحوم' اداروں کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی، ایک: دارالترجمہ کا، جسے آصف جاہی حکومت نے قائم کیا، اور جس نے مشرق ومغرب کے علمی جواہر کو اُردو کا جامہ پہنایا، نیز اُردو اصطلاحات کو وضع کرنے کا نہایت اہم کام انجام دیا، جس کا فائدہ اب بھی پڑوسی ملک کو پہنچ رہا ہے، دوسرا: احیاء المعارف النعمانیہ، ممتاز فقیہ اور صاحبِ نظر عالم مولانا ابوالوفاء افغانی نے جس کی بنیاد رکھی، یہیں سے امام ابو یوسف اور امام محمد کی ''کتاب الآثار'' شائع ہوئی، امام محمد کی ''جامع کبیر'' طبع ہوئی، سرخسی کی شرح السیر الکبیر اور شرح الزیادات طبع ہوئی، زیادات الزیادات کی طباعت عمل میں آئی، غرض کہ فقہ حنفی کی بنیادی کتابیں جو اہل علم کی نظر سے اب تک مخفی تھیں، اسی ادارہ کے ذریعہ اہل ذوق کے ہاتھوں تک پہنچیں۔

۱۹۴۸ء میں ایک ایسا طوفان آیا کہ اگر آسمان اس پر خون کے آنسو برساتا تب بھی بجا ہوتا، لگتا تھا کہ اس خطہ سے ہر وہ علامت مٹادی جائے گی، جس کی نسبت اسلام اور مسلمانوں سے ہو؛ لیکن اسلام کا نشہ ایسا نشہ نہیں ہے، جسے ظلم وجور کی آندھیاں اُڑالے جائیں؛ چنانچہ طوفان آیا اور گذر گیا، اس موقع سے شہداء حق نے جو اپنے لہو نچوڑ نچوڑ کر سرزمین دکن کو آبیار کیا، اسی کی آغوش سے ایک نیا سورج طلوع ہوا، دین پر استقامت کا، علم کا اور حوصلہ وہمت کا سورج؛

چنانچہ آج یہ شہر دینی تعلیم، عصری تعلیم، دعوتِ دین اور خدمتِ خلق کے اداروں، اوران اداروں کے تحت ہونے والی کوششوں، نیز مسلمانوں کی سیاسی قوت کے اعتبار سے ایک مثالی شہر بن چکا ہے اوراس کی گنگا جمنی تہذیب اور مذہبی رواداری کی روایت واپس آ چکی ہے، شاید یہ اس شہر کے بانی قلی قطب شاہ کی دُعاء دردمندانہ کا اثر ہے، انھوں نے کہا تھا :

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

حیدرآباد کو سیرت نبوی کی خدمت میں ایک نمایاں مقام حاصل رہا ہے، اُردو زبان میں سیرت کی سب سے مفصل کتاب (جس کو سیرت کا انسائیکلو پیڈیا کہنا بے جا نہ ہوگا) سیرت النبی (تالیف: علامہ شبلی نعمانیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ) کی ترتیب واشاعت میں حکومت حیدرآباد کا گرانقدر مخلصانہ تعاون شامل رہا ہے، خود حیدرآباد نے ایک ایسے سیرت نگار کو وجود بخشا ہے، جس نے مغربی زبان میں پیغمبر اسلام ﷺ کا سب سے مؤثر تعارف کروایا ہے اور مستشرقین ہی کے اُسلوب میں ان کی مغالطہ انگیزیوں کا پردہ چاک کیا ہے، میری مراد ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ سے ہے، بحیثیت سیرت نگار حیدرآباد کی ایک اور شخصیت جناب مصباح الدین شکیل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جن کی کتاب ''سیرت احمد مجتبیٰ'' تین ضخیم جلدوں میں ہے اور جس میں نہایت حسن ترتیب کے ساتھ دلچسپ انداز پر سیرت کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں۔

غالب گمان یہی ہے کہ سیرت کے اُردو لٹریچر میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی ''النبی الخاتم''، یہیں لکھی گئی ہوگی، جو عقل کی گرہوں کو کھولتی اور قلب ورُوح کے پیمانہ کو عشق نبوی کی مئے جاں فزا سے لبریز کرتی ہے، جس کو ہر بار پڑھ کر حب نبوی کی آنچ تیز ہوجاتی ہے اور آنکھیں آنسوؤں سے وضوء کرتی ہیں۔

اس شہر کا ایک امتیاز سیرت نبوی کے بلند پایہ مقررین بھی رہے ہیں، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، نواب بہادر یار جنگ، مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقل اور جناب غلام غوث خاموشی — رحمہم اللہ — وغیرہ ایسے بلند پایہ خطباء تھے، جن کی باتیں سن کر ایمانی حرارت تیز ہوجاتی تھی اور بہتوں کی آنکھیں اشکبار ہوجاتی تھیں، یہاں سیرت کے ایسے عظیم الشان جلسے منعقد ہوتے ہیں کہ پڑوسی ملک کے بعض مہمانوں نے بھی اعتراف کیا کہ برصغیر میں سیرت کے موضوع پر اتنا بڑا اجتماع کہیں اور نہیں ہوتا، جناب سید خلیل اللہ حسینی مرحوم نے تعمیر ملت کے پلیٹ فارم سے اس طرح کے عظیم الشان جلسہ ہائے سیرت کا آغاز کیا اور اب بھی ایسے جلسوں اور کانفرنسوں کا سلسلہ جاری ہے۔

کلمۂ آخریں

'المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد' جو اس وقت آپ کی میزبانی کا شرف حاصل کررہا ہے، مدارس کے

فضلاء کی تربیت اور افراد سازی کا مرکز ہے، جو مختلف جہتوں میں خدمت انجام دے رہا ہے، تعلیمی نقطۂ نظر سے اس کے تین مرکزی شعبے ہیں، ایک شعبہ 'اختصاص' کا ہے، اس کے تحت علوم القرآن، علوم الحدیث، فقہ اسلامی اور دعوہ وانگریزی زبان میں تخصصات کے ذیلی شعبے قائم ہیں، تمام شعبوں میں ان کے اصل موضوع کے ساتھ ساتھ تاریخ ہند، عالمی جغرافیہ، جنرل نالج، مبادئ معاشیات اور دستور ہند کا مطالعہ کرایا جاتا ہے اور باضابطہ ان کا امتحان لیا جاتا ہے، اسی طرح ہر طالب کے لئے کم سے کم ڈیڑھ سو معتبر احادیث مع حوالہ روات وکتب حفظ کرنے کا لزوم ہے، نیز انگریزی زبان اور کمپیوٹر کی بھی تعلیم دی جاتی ہے، دوسرا شعبہ 'مطالعہ مذاہب' کا ہے، اس میں ہندو مذہب، عیسائیت، سنسکرت زبان اور اسلام کے خلاف کئے جانے والے شکوک وشبہات کے رد، انگریزی اور کمپیوٹر سے متعلق مضامین پڑھائے جاتے ہیں، تیسرا شعبہ عالم کورس برائے طلبہ وفارغین عصری جامعات کا ہے 'مدرسہ عبد اللہ بن مسعودؓ' کے نام سے یہ شہر میں کام کرتا ہے، جس کا کورس پانچ سالہ ہے، اس شعبہ سے بہت سے ڈاکٹر، انجینئر اور آئی ٹی وغیرہ کے طلبہ، نیز حفاظ نے سند فراغت حاصل کی ہے، چوتھا شعبہ عصری تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا ہے، جو 'ایم، ایس، رحمانی اسکول' کے نام سے خدمت انجام دے رہا ہے اور اس کا ایسا نصاب بنایا گیا ہے کہ جب بچے بارہویں کلاس پاس کرلیں تو وہ عالم کورس کا نچوڑ بھی حاصل کر چکے ہوں، یہ اسکول اس وقت ایم، ایس اسکول کے زیر انتظام ہے اور معہد دینی تعلیم کے شعبہ کی نگرانی کرتا ہے۔

ادارہ کا دوسرا مرکزی شعبہ 'شعبۂ تحقیق' ہے، اس شعبہ میں ہر سال پانچ، چھ فضلاء کو پہلے ایک سال تربیت دی جاتی ہے اور اس کے بعد ان سے تحقیق کا کام لیا جاتا ہے، فتاویٰ سراجیہ، فوائد ظہیریہ اور متعدد کتابوں پر تحقیق وتعلیق کا کام ہو چکا ہے اور فتاویٰ ہندیہ پر بھی کام ہو رہا ہے، جو آخری مرحلہ میں ہے ـــــ اب تک شعبہ اختصاص کے سال دوم کے طلبہ سے جو علمی وتحقیقی کام کرایا گیا ہے، ان کی مقدار ۸۵ ہزار صفحات سے زیادہ ہے، اس کے علاوہ وہ کام ہیں، جو شعبۂ تحقیق کے تحت انجام پائے ہیں، وہ بھی ہزاروں صفحات پر مشتمل ہیں۔

تیسرا مرکزی شعبہ 'دعوتِ اسلام' کا ہے، اس کے لئے 'سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسیج' کے نام سے مستقل ادارہ قائم کیا گیا ہے، جس کے تحت برادرانِ وطن میں دعوت کی تربیت بھی دی جاتی ہے، مذہبی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے مشترک اجتماعات بھی رکھے جاتے ہیں اور دعوت کا کام بھی کیا جاتا ہے، بحمد اللہ معہد کے تربیت یافتہ دو درجن سے زیادہ فضلاء مستقل طور پر یا ضمنی طور پر دعوتِ دین کا کام کرتے ہیں ـــــ اسی مقصد کے لئے 'ستیہ پرکاش' کے نام سے سوشل میڈیا کا کام بھی شروع کیا گیا ہے؛ چوں کہ کچھ ہی عرصہ پہلے اس کا آغاز ہوا ہے؛ اس لئے ابھی اس میں زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی ہے؛ لیکن ان شاء اللہ مستقبل قریب میں اس کے ذریعہ خاص طور پر برادرانِ وطن کو سامنے رکھتے ہوئے تعارف اسلام اور دفاعِ اسلام کا کام کیا جائے گا۔

اخیر میں آقائے نامدار (ﷺ) کی بارگاہ عالی جاہ میں یہ بے مایہ غلامِ بے دام شاعر حقیقت شناس سے ایک شعر مستعار لے کر پیش کرتا ہے :

گنہگارم ولیکن خوش نصیبم
بریں نازم کہ ہستم اُمت تو

(اگرچہ گنہگار ہوں ؛ لیکن خوش نصیب ہوں
اور اس بات پر ناز کرتا ہوں کہ آپ کی اُمت میں تو ہوں)

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سیرت نبوی کی نسبت سے ہونے والے اس پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کرے اور اسے اُمت کے لئے خیر کا ذریعہ بنائے، آپ حضرات کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس ادارہ کو اپنی دُعاؤں اور نیک تمناؤں میں یاد رکھیں گے۔

وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین۔

۱۲؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ
۲۱؍فروری ۲۰۱۶ء

خالد سیف اللہ رحمانی
(خادم: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

• • •

کیارسول اللہ ﷺ نے اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا ہے؟

مولانا محمد کلیم صدیقی ◆

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين وعلىٰ آله الطيبين الطاهرين وعلى من تبعهم ودعا بدعوتهم الى يوم الدين ، اما بعد !

تمہیدی کلمات

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں ہر دور اور ہر آن ساتھ چلنے والی اور ساتھ دینے والی تعلیمات موجود ہیں، زمانہ کیسا ترقی یافتہ ہوجائے، اس کی تعلیمات کی روشنی میں انسان بآسانی سفر حیات طے کر سکتا ہے، اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اس لئے ہمیشہ باطل ادیان پر اس کا غلبہ رہا ہے اور ہر دور میں یہ پھلا پھولا اور پروان چڑھا ہے، یہ سوال کہ رسول اللہ ﷺ نے بزور شمشیر اسلام پھیلایا، یا اپنی تعلیمات واخلاق سے، یہ ایک قدیم اعتراض ہے اور اس پر کافی بحثیں، مکالمے، اور تحریریں آئیں، جو آپ حضرات نے پڑھی یا سنی ہوں گی، اس انٹرنیشنل سیمنار میں اس موضوع کو جگہ دی گئی ہے اور مجھے اس پر کچھ کہنے کا موقع حاصل ہو رہا ہے، اس حقیر کی نگاہ میں اس موضوع کی عصر حاضر میں اس حیثیت سے بہت اہمیت ہے کہ اللہ پاک نے امت کے رجال الفکر والدعوہ کو یہ بات تقریبا سجھادی ہے اور ہر صاحب نظر اس بات کو ماننے پر مجبور ہے کہ اس امت کی بقاء اور اس کی زبوں حالی کی کیفیت سے نکلنے کا صرف اور صرف ایک راستہ ہے، اور وہ ہے کارِ دعوت، یعنی اسلام کو غیر مسلم بھائیوں تک پہنچانا، اس کے لئے ظاہر ہے کہ وہی طریقہ اپنانا پڑے گا جو داعیٔ اعظم جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اختیار فرمایا، اور آپ کے جاں نثار صحابہ نے اپنایا اور امت کے لئے آپ ﷺ نے نمونہ چھوڑا، اس کے لئے ضروری تھا کہ ہم اس طریق سے واقف ہوں تا کہ اس دور میں بھی ہم اس سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔

رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کے دنیا میں تشریف لانے سے پہلے اور بعد کے دور پر نظر ڈالیں تو جہالت کے

◆ ناظم : جامعہ اسلامیہ امام ولی اللہ، پھلت، مظفر نگر۔

سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا؛ لیکن جب آپ نے مردم گری اور افراد سازی کا کام انجام دینا شروع کیا تو ان افراد کو دیکھ کر دنیا دنگ ہے کہ وہ کیسے انسان تھے؟ وہ لوگ بنے کیسے اور ان کی شخصیتوں میں نکھار کیسے پیدا ہوا؟ اس کو سمجھنے کے لئے آپ ﷺ کی تعلیمات پر نظر ہونا لازمی اور ضروری ہے:

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

حقیقت یہ ہے اللہ پاک نے آپ ﷺ کی ذات میں ایسی خصوصیات وامتیازات رکھی تھیں جو اپنے اندر کشش اور جاذبیت رکھتی تھی، جو انسانی ہمدردی غم خواری اور آدمیت کے سبق پر مبنی تھیں؛ چنانچہ جن حضرات نے آپ ﷺ کو دیکھا، یا آپ کے بارے میں سنا، ان پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ وہ ماننے پر مجبور ہوئے اور خاص طور پر ان تعلیمات کے نتیجہ میں جن حضرات کی تربیت ہوئی، وہ غیر معمولی سطح کی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان جہاں کہیں بھی آباد ہوئے اور دنیا کے جن ملکوں میں بھی انہوں نے سکونت اختیار کی، اپنے تشخصات کو باقی رکھا، اور اسلام کی تبلیغ واشاعت زبانی وعملی طور پر کی۔

موضوع کا احاطہ

مذکورہ بالا موضوع کو سمجھنے اور اس کو حل کرنے کے لئے لازمی ہے کہ جس ذات گرامی کی بات کی جارہی ہے اس کی ذات پر غور کیا جائے، اس کی تعلیمات کو جانچا جائے، اس کے متبعین اور پیروکاروں کی زندگیوں کو کھنگالا جائے اور خاص طور پر اس پہلو پر توجہ کی جائے کہ وہ ذات خود جن تعلیمات کو سامنے رکھ کر سفر طے کررہی ہے، وہ تعلیمات کیا ہیں؟ اس موضوع کو حل کرنے کے لئے ان چار باتوں کو ملحوظ رکھا جائے تو یقیناً یہ مسئلہ حل ہے اور اس سے زیادہ بہتر حل کسی اور شکل میں ممکن نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں موضوع کے مالہٗ وماعلیہ کا پورا احاطہ ہے، انھیں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ہم نے آئندہ صفحات میں گفتگو کی ہے، جس میں آپ ﷺ کی بعثت سے قبل کے حالات اور نبوت ملنے کے بعد نیز آپ ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔

قبل نبوت کی ایک جھلک انسانی سماج پر

رسول اللہ ﷺ کی آمد پر دنیا نے ایک لمبے زمانے کے بعد کسی نبی ورسول کا استقبال کیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس دنیا سے اُٹھ جانے کے طویل عرصہ بعد زمین وآسمان کا رشتہ بسلسلہ وحی قائم ہوا، حضرت جبرئیل علیہ السلام کی آمد کی کہانیاں یہودیوں نے تو دشمنی میں اور عیسائیوں نے عقیدت میں گمراہ کن نظریات میں تبدیل کردی تھیں، پیغام الٰہی کا یہ سلسلہ مدتوں بعد دوبارہ شروع ہوا، اور آسمان وزمین کا رشتہ ایک نئی شکل میں سامنے آیا، جس کو

دنیا یکسر بھلا چکی تھی، آپ ﷺ کی صورت میں انسانیت کو ایک سچا مسیحا، غمگسار، خبر گیری کرنے والا، بوجھ بانٹنے والا خیر خواہ اور ہمدرد میسر ہوا؛ لیکن اس دنیا میں دن کے ساتھ رات، خیر کے ساتھ شر، اور انسانوں کے ساتھ شیطانوں کی کشمکش جاری ہے؛ لہٰذا نورِ اسلام کے ظہور پذیر ہوتے ہی اندھیروں کا راج خطرے میں پڑنے لگا اور خیر کی دعوت کے وجود میں آتے ہی شر نے اپنی کمر کس لی؛ لیکن آخر ایک دن وہ آیا کہ جتنی جدوجہد اس نبوی چراغ کو گل کرنے کے لئے کی گئی، وہ اتنی ہی آب وتاب کے ساتھ تاریکیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوگیا، باطل کا پرچم حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت سمیہؓ کی شہادت نے سرنگوں کردیا، اور اس بات کی گواہی دی کہ اس شمع پر جان دینے والے پروانوں میں کمی نہ آئے گی، حضرت بلالؓ کی ابتلاء وآزمائش اور شعب ابی طالب اور طائف کی ہمت افزا قربانیوں نے اس بات کی دلیل قائم کردی تھی :

ستمگر ادھر آ ! کہ فن آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

نبوی زندگی اور اس کے اثرات

دراصل اسلام قربانیوں کے سائے تلے پلا بڑھا اور پروان چڑھا ہے، جس ظلم وستم، جہالت اور انسانی خود کشی کے دور میں اسلام آیا اور اس نے ہلاکت کے دہانے پر کھڑی انسانیت کو بچانے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی، وہ عام آدمی کے لئے بھی کوئی انجان حقیقت نہیں، اسلام خود تو کیا کسی پر جبر وکراہ کرتا، حقیقت تو یہ ہے کہ خود جناب رسول اللہ ﷺ کی بعثت جس معاندانہ موحول میں ہوئی اور انسانیت جن طبقات میں بٹی ہوئی تھی، وہ تاریخ عالم کا دردناک دور ہے، اسلام نے تو شجر وحجر، گائے و گوبر اور ہزاروں خیالی دیوی دیوتاؤں کی چوکھٹ پر پڑی اشرف المخلوقات کو ان کی عبادت سے اور ظالم حکمرانوں اور غاصبانہ مذہبی ٹھیکیداری اور انسانیت سوز نظام اور رسم ورواج سے آزاد کر کے اس کے اصل منصب پر فائز کیا، حضرت جعفر طیارؓ کی شاہ حبشہ کے دربار میں اسلام کی صحیح منظر کشی سننے کے لائق ہے، جو تاریخ کے اوراق پر ثبت ہیں اور جس دور میں اللہ کے نبی ﷺ کی بعثت ہوئی اس کی صحیح منظر کشی اور عکاسی اس میں موجود ہے :

> اے بادشاہ ہم پر ایک دور گزرا کہ ہم میں جاہلیت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے، ہم نے ایک حقیقی خدا کو چھوڑ کر بے شمار معبود بنالئے تھے، اور خود ساختہ پتھروں کی پرستش کرنا ہمارا شعار بن چکا تھا، مردار خوری، زنا کاری، لوٹ مار، قطع رحمی، ہمارا صبح وشام کا مشغلہ، پڑوسیوں کے حقوق سے ہم ناواقف، رحم وانصاف سے ہم بے پرواہ،

غرض ہماری زندگی درندوں کی زندگی تھی، کہ قوی ضعیف کومسلنے اور کھالینے کواپنے لئے قابل فخر اورطرۂ امتیاز سمجھتا تھا،خدا کی رحمت کا کرشمہ دیکھئے کہ اس نے ہمارے پاس ایک پیغمبر بھیجا،جس کے نسب سے ہم واقف،جس کی صداقت،امانت وعصمت پر دوست ودشمن دونوں گواہ، ہماری قوم نے متفق ہوکر جس کو''الصادق''''الامین'' کا لقب دیا، وہ آیا اوراس نے ہم کوخدا کی توحید کی دعوت دی،اس نے ہم کو بتایا کہ کوئی اس کا شریک نہیں،وہ شرک سے پاک ہے، بت پرستی جہالت کا شیوہ ہے،اس کو ترک کردو اورصرف ایک خدا کی عبادت کرو،اس نے ہم کوحق گوئی اور صداقت شعاری کا حکم دیا، صلہ رحمی کو ضروری بتایا، پڑوسیوں اور کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک سکھایا،قتل وغارت گری کا خاتمہ کیا، زنا کاری کوحرام قرار دے کر اس ننگ انسانی سے ہم کوچھڑایا،نکاح میں محرم اورغیر محرم کا فرق بتایا،جھوٹ بولنےاور مال یتیم کے کھانے سے سختی سے منع فرمایا،نماز،روزہ،زکوۃ،اور حج کی تعلیم دی،غرض ہم کو حیوانیت سے نکال کر انسانیت کے مرتبے پر پہنچایا،ہم نے اس کی تعلیم کوقبول کیا، اوراس پر ایمان لائے یہ ہماراوہ قصور ہےجس کی بنیاد پر یہ مشرکین کا وفدآپ سے مطالبہ کرتا ہے کہ آپ ہم کوان کے حوالے کردیں۔(۱)

اس طرح آپ ﷺ نے اپنی ساری زندگی قربان کرکے انسانیت کوخودکشی سے بچالیااور کائنات کوتوحید کے نور سے منور کردیااورآپ ﷺ نے اپنے بعدایک ایسی جماعت چھوڑی،جس کو یہی پیغام بقیہ انسانیت تک پہنچانا تھا اور بندوں کی بندگی سےنکال کرایک اللہ کی بندگی اور دنیا کی تنگی سے نکال کراس کی وسعتوں میں داخل کرنا تھا؛چنانچہ انھوں نے اپنا فریضہ انجام دیااوراس دنیا میں یہ سلسلہ جاری رہااوراسی تعلیم نبوی کا ثمرہ ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان جہاں بھی آبادہیں،وہ اس پیغام کوسرمۂ چشم جان کراس کی حفاظت اوراس کودوسروں تک پہنچانا اپنا فریضہ جانتے ہیں۔

لیکن فطرت کے باغیوں اورخودغرضوں،ناشکروں کی کمی نہیں،جنھوں نے اس سچے اورامانت دار نبی برحق کو بھی یہ کہہ کر بدنام کرنے کی کوشش کی کہ آپ ﷺ نے اسلام بزور شمشیر پھیلایا؟ لہٰذا ہم اسی کے متعلق حقائق کے پردوں سے جھانک کر دیکھیں کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ اس موضوع کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مکمل حیات طیبہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہواور خاص کرآپ ﷺ کی حیات کا وہ پہلو جوابتدائی دور کہلاتا ہے،

---

(۱) الروض الانف:۲/۱۲۴،۱۲۵۔

جب کہ اسلام کا دائرہ بہت وسیع نہ تھا اور لوگوں نے ابھی اس پیغام کو صحیح حد تک جانا بھی نہ تھا، اس پہلو پر نظر ہوگی تو یہ حقیقت خود بخود واشگاف ہوجائے گی کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا کتنا رول ہے اور آپ ﷺ کی تعلیمات کا کتنا؟

تعلیمات نبوی کی اثر انگیزی

جب آپ ﷺ پر پہلی وحی الٰہی آئی اور فرشتہ سے پہلی ملاقات آپ ﷺ کی ہوئی تو آپ کی کیا کیفیات تھیں اور خاص کر وہ گفتگو جو آپ ﷺ کی حضرت خدیجہؓ سے ہوئی؛ چنانچہ اس پیغام الٰہی کو لے کر اپنے گھر واپس آئے تو آپ کی کیا حالت تھی؟ وہ آپ کی عاجزی کی مثال آپ ہے کہ آپ کو اپنی جان تک کا خدشہ ہونے لگا تھا اور پھر آپ نے وہ سب ماجرا حضرت خدیجہؓ کے سامنے رکھا جو ایک تجربہ کار ماہر تاجر خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ ایک لائق فخر بیوی بھی تھیں، عمر میں آپ سے پندرہ سال بڑی یعنی ہر اعتبار سے مکمل تھیں، وہ بے ساختہ پکار اُٹھیں :

> کلا أبشر ، فو الله لا یخزیک الله ابدا ، انک لتصل الرحم ، وتصدق الحدیث ، وتحمل الکل ، وتکسب المعدوم ، وتقری الضیف ، وتعین علی نوائب الحق ۔ (۱)
>
> ہرگز نہیں؛ بلکہ آپ تو خوش ہوں، اللہ آپ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا؛ کیوں کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، آپ کی باتوں میں صداقت ہوتی ہے اور محتاجوں کی دستگیری اور بے بسوں کا سہارا بنتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق گوئی کی پاداش میں مصائب برداشت کرتے ہیں۔

اور پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا خود ایمان لے آتی ہیں، یہ ہے اس حق کی کشش جو اپنے آپ کو تسلیم کرانے پر مجبور کرنے کی ساحرانہ اثر رکھتی ہے جس میں نہ کہیں تیغ وتفنگ کا دخل ہے، نہ توپ وسلاسل کا، اسلام کے امتیازات وخصوصیات ہی ایسی ہیں، جن کی بدولت اسلام نے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی اور اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا، جس کی زندہ وتابندہ مثالیں آج کے اس گئے گزرے دور میں بھی بڑی تعداد میں مل جاتی ہیں کہ جو لوگ اسلام کی آغوش میں آرہے ہیں، ان میں سے ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے، جو صرف اور صرف اسلام کی تعلیمات سے متأثر ہوکر قبول اسلام کرتے ہیں۔

اس سے آگے بڑھیں تو وقت کی معزز ترین ہستیاں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرتؓ عثمان، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت حمزہؓ، حضرت طلحہؓ وغیرہ یہ سب وہ لوگ ہیں جو بہت حساس، تجربہ کار، طاقتور،

(۱) بخاری، حدیث نمبر: ۶۹۸۲، کتاب التعبیر ۔

رعب وداب والی شخصیت ہیں، یہ لوگ حلقہ بگوش اسلام ایک ایسے وقت میں ہوتے ہیں، جب کہ آپ کے پاس نہ لاؤلشکر تھا، نہ جمعیت تھی، نہ طاقت، اور نہ ہی اس وقت آپ ﷺ کو سیاسی قوت حاصل تھی، جیسا کہ ان لوگوں کو حاصل تھی جن کے پاس آپ پیغام اسلام لے کر گئے، دوسری طرف ایمان قبول کرنے والے وہ افراد تھے جو معاشرے میں سب سے دبے کچلے سمجھے جاتے تھے، حضرت بلالؓ حضرت سمیہؓ وغیرہ، جن کے آقاؤں کے ظلم وستم کی داستان زبان زدخاص وعام ہے، یہ آپ کے لشکری تھے، اور اس وقت خود آپ کی شخصیت اتنی کمزور اور لاچار تھی کہ طاقتور لوگ اونٹ کی اوجھڑیاں ڈالتے، کانٹے بچھاتے اور کمزور تک بھی آپ پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا کرتے تھے، آپ ﷺ کے ماننے والوں کو قوت تو کہاں؛ بلکہ ایمان لانے کے بعد اپنوں کی حمایت تک سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا، حضرت مصعب بن عمیرؓ اپنی ناز ونعمت میں گزری ہوئی زندگی کی وجہ سے مثالی حیثیت رکھتے تھے؛ لیکن اسلام لانے کے بعد وہ دن بھی آیا کہ ایک دن میں کئی جوڑے بدلنے والا کمبل اور بوریا اور بجائے گھنڈیوں کے کانٹے لگانے پر مجبور ہوگیا، چٹائیوں میں ڈال کر دھونی دی جاتی تھی آپ کو، آپ کی ماں نے گھر سے باہر نکال دیا، اسی طرح حضرت ابوبکرؓ جیسے معزز شخص نہ بچ سکے، ایک بار آپ کو اتنا مارا کہ بے ہوش کر دیا، ناک منھ اس طرح سوج گئے تھے کہ چہرہ بھی پہچان میں نہیں آتا تھا؛ لیکن عشق رسول کا یہ حال تھا کہ ہوش آتے ہی سب سے پہلے آپ ﷺ کی خیر خبر معلوم کی، جس پر آپ کی والدہ تک کو اعتراض ہوا کہ جس کی وجہ سے اتنی مار کھائی کہ بے ہوش ہوگئے، اب بھی اسی کو یاد کر رہا ہے اور پھر آپ ﷺ سے ملاقات پر آپ کی والدہ بھی مسلمان ہوگئیں۔(۱)

اور جب ایمان والوں پر زندگی گزارنا بھی دوبھر ہوگیا، اپنے بیگانے سب پرائے بن گئے، بیوی بچوں اور ماں باپ تک نے چہرے پھیر لئے تو انھوں نے اپنے ایمان کی ثابت قدمی کا اس طرح ثبوت دیا کہ تاریخ انسانی دنگ رہ جاتی ہے، وہ کونسی چیز تھی، جس نے ان کو محمد ﷺ کا اتنا عاشق بنا دیا تھا کہ آپ کی اتباع چھوڑنے کے بجائے بیوی بچوں، ماں باپ، یار دوستوں، اقربا، واعزاء، اور وطن عزیز سب کو خیرآباد کہہ کر بحر احمر سے ہوتے ہوئے حبشہ چلے گئے، جہاں کا بادشاہ اللہ کی تائید و مدد سے ان کا حامی بھی بنا اور سچا مسلمان بن گیا، یہ جھلک ہے اس اسلام کی، جس کو تلوار نے نہیں بلکہ آپ کی شخصیت، کشش اور محبت نے پھیلایا، آپ کی امانت وصداقت نے پھیلایا۔

حضرت حمزہؓ جیسے غیرت مند اور خوددار شخص کی ایمان قبول کرنے کی داستان بھی رقیبوں کے لئے ایک زبردست جواب ہے، آپ ﷺ کو ابوجہل نے سخت سست کہا اور آپ کے ساتھ دست درازی کی تو ایک باندی نے حضرت حمزہؓ سے جو شکار سے واپس آرہے تھے، اس کا ذکر کیا تو وہ غیرت اور غصہ سے مشتعل ہوگئے اور ابوجہل کے

(۱) السیرۃ النبویۃ:۱۳۹۔

سر پر ایسا نیزہ مارا کہ خون فوارے کی طرح بہنے لگا، اور کہا تجھے کیسے جرأت ہوئی کہ تو محمد پر ہاتھ اُٹھائے اور پھر آپ ﷺ کے پاس آکر کہنے لگے کہ بھتیجے خوش ہوجاؤ! میں نے تمہارا انتقام لے لیا ہے اور مذکورہ قصہ سنایا، آپ ﷺ نے فرمایا مجھے اس کے بجائے خوشی اس بات سے ہوگی کہ آپ ایمان لے آئیں، حضرت حمزہ نے فوراً اسلام قبول کرلیا،(۱) یہ ہے وہ اسلام جو انسانیت کا خون بہا کر نہیں؛ بلکہ خون بچا کر پھیلا ہے۔

حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ کو قتل کرنے کا عزم کرلیا تھا، راستے میں جا ہی رہے تھے کہ ابونعیم نامی صحابی ملے پوچھا کہاں چلے ہو؟ جواب دیا کہ محمد کا خاتمہ کرنے جارہا ہوں، تو ان صحابی نے کہا پہلے اپنی بہن کی خبر لو، وہ پہلے ہی محمد پر ایمان لاچکی ہے، حضرت عمر بہن کے گھر گئے تو کچھ بھنبھناہٹ محسوس کی، دروازہ کھٹکھٹایا تو آپ کی بہن اور بہنوئی قرآن سیکھ رہے تھے، فوراً قرآن کو چھپالیا اور وہ معلم جوان کو قرآن پڑھا رہے تھے، اوٹ میں چلے گئے، حضرت عمر نے دروازہ کھلتے ہی بہنوئی اور بہن کو مارنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہ خون میں لت پت ہوگئے، بہن نے کہا عمر! جان تو جاسکتی ہے؛ لیکن ایمان نہیں چھوڑیں گے، اس آواز نے حضرت عمرؓ کے ہوش اُڑادیئے، گویا کوئی بجلی کوند گئی ہو، آپ نے ذرا ٹھنڈے انداز میں پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہے تھے؟ بہن نے کہا کہ پہلے پاک صاف ہوجاؤ، پھر پڑھنا، آپ نے پاک صاف ہوکر قرآن پڑھا تو فوراً آپ ﷺ کے پاس دارارقم میں پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا، دارارقم میں موجود مسلمان دروازے پر حضرت عمرؓ کو کھڑے دیکھ کر سخت خوف زدہ ہوئے، آپ ﷺ نے آگے بڑھ کر کنڈی کھولی تو فوراً حضرت عمرؓ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھتے ہوئے داخل اسلام ہوگئے اور اعلان کردیا کہ آج سے مسلمان کھلم کھلا نمازیں پڑھیں گے اور اب چھپ کر نہیں کھل کر جئیں گے، یہ ہیں وہ عمرؓ جنھوں نے تلوار سے نہیں حقیقت اسلام سے متأثر ہوکر اسلام قبول کیا، یہاں بھی حقیقت واضح ہے کہ تلوار کس کے ہاتھ میں اور بے شمشیر کون ہے۔(۲)

مشکلات کا سامنا اور ہجرت وطن

شعب ابی طالب میں تین سال تک مسلمان اور بنوہاشم محصور رہے، فاقہ میں درختوں کے پتے تک کھانے پڑے، کوئی انسان ان اللہ کے فرمانبردار بندوں کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہ تھا، غرض ظلم وستم کا کوئی تیر ان کے ترکش میں نہیں بچا تھا، جو انھوں نے آزمالیا نہ ہو، شعب ابی طالب کے بعد آپ کے چچا ابوطالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جو آپ ﷺ کی اصل پرسان حال اور ہر آنے والی رکاوٹ کے لئے سہارا تھیں، ان کا بھی انتقال ہوگیا، یہ دونوں آپ ﷺ کے لئے ڈھال کی حیثیت رکھتے تھے، اب ہر آنے والا تیر آپ کو خود سہنا تھا، جن کے ہوتے ہوئے

(۱) الروض الانف: ۱۴۳/۲ تا ۱۴۲۔ (۲) حوالہ سابق۔

کسی کواس کی جرأت نہ ہوسکی کہ آپ کووطن بدر یا جان لیواحملہ کرنے جیسی ناپاک سازش کر سکے، جب زندگی کے یہ دوسہارے ٹوٹ گئے اور مکہ کی سرزمین آپ کے لئے جہنم بن گئی اور وہاں سے مایوس ہوگئے تو آپ ﷺ طائف کی طرف روانہ ہوئے، یہ اُمید دل میں لئے ہوئے کہ وہاں کے لوگ شاید سمجھ سے کام لیں گے اور حق کو قبول کرلیں گے؛ لیکن آپ سلگتے ہوئے صحراء کی تند وتیز ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے زخمی دل کے ساتھ طائف پہنچے ہی تھے کہ وہاں ایسا استقبال ہوا کہ ایک سردار نے طنز میں کہا: کیا اللہ کو تیرے علاوہ کوئی اور نبی بنانے کے لئے نہیں ملا تھا، دوسرے نے کہا اگر تو جھوٹا ہے تو تجھ سے بات ہی نہیں کرنی چاہئے اور اگر تو واقعی نبی ہوا تو بھی تجھے کچھ نہیں کہوں گا کہ کہیں کوئی ناگہانی آفت نہ آ پکڑے، تیسرے نے آوارہ لڑکوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیا، جو سیٹیاں بجاتے، گالیاں دیتے، پتھر مارتے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے پاؤں لہولہان ہوگئے، آپ کے پاؤں جوتوں میں چپک گئے، کہیں بیٹھ کر آرام تک نہ کرنے دیتے، آپ دیوانہ وار چلتے جاتے ہیں اور دل کو چیر دینے والی یہ دُعا ورد زباں ہے :

اللّٰهم اليک أشكو ضعف قوتی ، وقلة حيلتی ، وهو انی علی الناس ، يا ارحم الراحمين انت رب المستضعفين ، وانت ربی ، الی من تكلنی ؟ الی بعيد يتجهمنی ؟ أم الی عدو ملكته امری ؟ ان لم يكن بک علی غضب فلا أبالی ، ولكن عافيتک هی أوسع لی ، أعوذ بنور وجهک الذی اشرقت له الظلمات ، وصلح عليه أمر الدنيا والآخرة ، من ان ينزل بی غضبک ، أو يحل علی سخطک ، لک العتبی حتی ترضی ، ولا حول ولا قوة الا بک ۔ (۱)

اے خدا تیرے ہی حضور میں ضعف قوت اور لاچاری اور لوگوں کی ایذا دہی کی شکایت کرتا ہوں، اے ارحم الراحمین تو ہی بے چاروں کا چارہ اور میرا کارساز ہے، مجھ کو تو کس کے سپرد کردتا ہے، کیا ایسے اجنبی کے جو مجھ سے ترش روئی کرے یا ایسے دشمن جس کو تو نے مجھ پر مسلط کیا ہو، اگر تیرا غضب مجھ پر نہیں ہے تو مجھ کو کچھ پرواہ نہیں، مگر تیری عافیت بڑی وسیع ہے، میں تیرے اس نور ذات کے ساتھ جس سے تو نے تاریکیوں کو روشن کیا ہے اور دنیا وآخرت کے اُمور کو اس پر درست کیا ہے، اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ تو اپنا غضب اور غصہ مجھ پر نازل فرمائے، یہاں تک کہ تو

---

(۱) الروض الأنف: ۲/ ۲۵۷، ۲۵۸۔

راضی ہوجائے اور تیرے سوا کسی میں نہ کوئی ضرر دُور کرنے کی قوت ہے اور نہ نفع حاصل کرنے کی طاقت۔

آخر آپ ﷺ طائف سے اور زیادہ غم وفکر لے کر واپس ہوئے، ادھر آپ ﷺ طائف سے باہر نکلے، اُدھر پہاڑوں کا فرشتہ اس حکم کے ساتھ آتا ہے کہ اگر آپ اشارہ کردیں تو ان پہاڑوں کے بیچ میں انھیں پیس کر رکھ دوں آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ نادان ہیں، یہ مجھے پہچانتے نہیں، اگر یہ ایمان نہ لائیں تو اُمید ہے کہ ان کی نسل میں کوئی مسلمان ہوگا''۔

جس کو امام بخاریؒ نے اس طرح نقل کیا ہے :

بل ارجو ان یخرج اللہ عزوجل من اصلابهم من یعبد اللہ وحدہ ولا یشرک به شیئاً۔ (۱)

بلکہ میں اُمید کرتا ہوں کہ اللہ ان کی نسل میں ایسے افراد پیدا کرے گا جو صرف اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہیں کریں گے۔

یہ ہے وہ مظلوم شخصیت جس کو دنیا کی عدالت میں ناواقفوں نے (نعوذ باللہ) مجرم بنا کر پیش کیا کہ وہ بڑا قاتل ہے، اور تلوار کی پیاس وہ خون انسانی سے بجھاتا ہے، ادھر آپ ﷺ طائف سے واپس آتے ہیں اور ادھر مکہ میں صورت حال بدلی ہوئی تھی، مکہ مکرمہ میں ابولہب کی صدارت میں یہ قانون پاس ہو چکا تھا کہ محمد ﷺ کے لئے اب مکہ میں کوئی جگہ نہیں، مگر یہ کہ کوئی قبیلہ اس کو پناہ دے، آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ کے باہر ہی سے ایک شخص کے ذریعہ کئی لوگوں کے پاس درخواست بھیجی کہ وہ اپنی امان میں لے لے؛ لیکن سب نے انجان بن کر انکار کردیا، آخر کار حضرت خدیجہؓ کے قرابت داروں نے آپ ﷺ کو مکہ میں امان دی اور اس طرح آپ کو اپنے وطن میں اجنبی قرار دے دیا گیا؛ لیکن بات یہیں پر نہ رُکی؛ بلکہ آپ ﷺ کی زندگی کا سودا ہونے جارہا تھا، اب اگر دستِ الٰہی یاوری نہ کرتا تو نہ معلوم شمع کے ساتھ پروانے کا کیا انجام ہوتا، آخر کار وہ دن آیا کہ آپ اور آپ کی دعوت کے لئے ہاجرہ کا گھر اور اسماعیل کا گہوارا تنگ پڑ گیا اور آپ مدینہ منورہ ہجرت کر گئے، ستم کی انتہا ہوئی، شاعر کے الفاظ میں :

یہ خوف ہے کہ صبا لڑ کھڑا کے گر نہ پڑے
پیام لے کے چلی ہے شکستہ حالوں کا

یہ تھی روداد، مکہ کے اس معصوم ہستی کی جس نے اللہ کے بندوں کو اللہ سے ملانے، انسانوں کو انسان بنانے،

(۱) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۹۵، کتاب الجهاد والسیر۔

ظالم کے خلاف مظلوموں کی حمایت میں، سب کچھ لٹا دیا، جان کیا، مال کیا، عزت کیا، قرابت کیا، وطن کیا؛ لیکن ایک قطرہ بھی خون کا زمین پر گرنا گوارا نہ کیا :

یہ کیا کم ہے بجھائی ہے پیاس کانٹوں کی
بلا سے راہ وفا میں لہو لہان ہوئے

آپ ﷺ کی مدنی زندگی

مدینہ منورہ کی ایک بڑی تعداد حج کے موسم میں دعوتی ملاقاتوں کے ذریعے مسلمان ہوچکی تھی، ان کی فرمائش تھی کے آپ ہمارے یہاں آجائیں تو ہم ہر طرح جان مال کے ذریعہ آپ کے لئے قربانی دینے کے لئے تیار ہیں، پہلے تو وہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو خود اپنی فرمائش پر بحیثیت ایک معلم، ایک داعی کے لے گئے، جنھوں نے وہاں اپنے اخلاق اور دردمندانہ اُسلوب کے ذریعہ دعوت کا خوب کام کیا؛ لیکن مدینہ منورہ کے باشندوں کا شوق بڑھتا ہی چلا جارہا تھا، کہ کسی طرح آپ ہمارے یہاں ہجرت کرکے آجائیں؛ چنانچہ آپ ﷺ ۱۳ رنبوی کو اپنے یار غار حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچ گئے، آپ ﷺ کے پہنچنے سے پہلے ہی اسلام مدینہ میں اس تیزی سے پھیلا کہ قبیلے کے قبیلے اسلام میں داخل ہو گئے، مدینہ میں اشاعت اسلام خود ایک حجت ہے ملزمین کے خلاف، کہ آپ تو کیا آپ کا سایہ بھی ابھی وہاں تک نہ پہنچ سکا تھا کہ اسلام کے لئے اور اہل اسلام کے لئے میدان تیار ہو چکا تھا اور افراد جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے۔

آپ ﷺ نے سب سے پہلے وہاں کے امن وامان کو باقی رکھنے کے لئے ایسا مثالی اتحاد قائم کیا کہ دنیا نہ آپ ﷺ سے پہلے اور نہ آپ ﷺ کے بعد ایک بھی ایسی مثال قائم کرسکی اور لٹیروں اور ڈاکوؤں کے لئے دروازے بند کردیئے۔

اسلام اور کفر کے درمیان رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی حدّ فاصل کی حیثیت رکھتی ہے؛ کیوں کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ایک مستقل سرزمین اسلام کو مکمل طور پر نافذ کرنے کے لئے عطا کی تھی؛ چنانچہ آپ نے اسلام کی مرکزیت کے لئے سب سے پہلے مسجد تعمیر کرادی؛ جب کہ ابھی تک آپ ﷺ کے مکانوں کا بھی انتظام نہیں ہوا تھا، جب آپ ﷺ مدینہ پہنچ گئے، تو قریش کو ایک طرف یہ خوف لگا رہتا تھا کہ ہم نے مسلمانوں اور ان کے نبی کو یہاں سے تو نکال دیا؛ لیکن ان کو باقاعدہ ایک زبردست جمعیت حاصل ہوگئی ہے، کہیں وہ ہمارے اوپر چڑھائی نہ کردیں، دوسرے ان کو اپنے مال کا غرور اور کبھی جاہ اور اقتدار اس بات پر آمادہ کرتا کہ ان مسلمانوں کا قصہ ہی تمام کردینا چاہئے؛ چنانچہ بدر کے میدان میں اس کا مظاہرہ ہوا، جس میں مسلمانوں ہی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی، وہ حق

وباطل کی فیصلہ کن کامیابی تھی ، یہ اعلان تھا اس بات کا کہ اب مسلمان کسی سے دب کرنہیں زندگی گزاریں گے ؛ کیوں کہ انھوں نے سب کچھ چھوڑ دیا؛ لیکن کسی کو اُف تک نہ کہا اور اپنے ایمان کے ساتھ مدینہ اور حبشہ ہجرت کی ؛ لیکن اب خالق کائنات نے ان کے لئے ان کے حال پر رحم کھاتے ہوئے ، انھیں باضابطہ اپنی جان کی حفاظت اور ایمان کی بقا کے لئے ، اور زمین میں فساد برپا کرنے والے بے لگام افراد کو لگام کسنے کی اجازت دیدی تھی ؛ کیوں کہ زمین پر بسنے والا ہر انسان مکمل آزادی اور اختیار رکھتا ہے، قرآن یوں گویا ہوا :

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ، الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ، اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۔ (الحج:۳۹-۴۱)

(اے مسلمانو !) ان لوگوں کو (جہاد کی) اجازت دی جاتی ہے ، جن سے جنگ کی جارہی تھی ؛ کیوں کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور یقیناً اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہیں ، یہ وہ لوگ ہیں جن کو ناحق صرف اس وجہ سے ان کے گھروں سے نکال دیا گیا کہ وہ کہا کرتے تھے : اللہ ہی ہمارے رب ہیں ، اگر اللہ تعالیٰ ایک کے ذریعہ دوسرے کا زور نہ گھٹواتے تو خانقاہیں ، کلیسائیں ، عبادت خانے اور مسجدیں ڈھادی جاتیں ، جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے ، اور جو اللہ کی مدد کرے گا ، اللہ بھی ضرور اس کی مدد فرمائیں گے ، بے شک اللہ بڑی قوت والے اور بڑے غلبہ والے ہیں ، یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں حکومت عطا کردیں تو وہ نماز قائم کریں گے ، زکوۃ ادا کریں گے ، بھلائی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے ۔

یہ اب علاج تھا بگڑے ذوق اور فسادزدہ اخلاق اور بدخولوگوں کے لئے ، جنھوں نے زمین پر اودھم مچا رکھا تھا ، جنھوں نے مسلمانوں پر عرصہ حیات صرف اس لئے تنگ کیا تھا کہ وہ اللہ کی زمین میں اللہ کا نام لینے والے لوگ تھے ، تو اب آپ کو برملا حق کے اظہار کرنے کا موقع دیا ، نہ کہ تلوار کے ذریعے لوگوں کو زبردستی اسلام کے حصار میں دھکیلنے کا ، قرآن نے جو کہ اسلام کا اولین سرچشمہ ہے ، اس بات کا اعلان کیا کہ :

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ (البقرۃ:۲۵۶)

دین میں زبردستی کی گنجائش نہیں، گمراہی کے مقابلہ ہدایت آشکارا ہوچکی ہے، تو جس نے ''طاغوت'' کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا، اس نے مضبوط ڈوری تھام لی جو ٹوٹ نہیں سکتی اور اللہ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں۔

اور فرمایا :

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ (یونس:۹۹)

اگر آپ کے پروردگار کو منظور ہوتا تو زمین پر جتنے لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے، تو کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کریں گے؟

اور مزید :

اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۔ (الشوریٰ:۴۸)

آپ کے ذمہ تو صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۔ (القصص:۵۶)

(اے رسول!) آپ جس کو چاہیں، ہدایت پر نہیں لا سکتے ہیں۔

پھر فرمان باری ہے :

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۔ (البقرۃ:۲۷۲)

ان کو راہِ ہدایت پر لانا آپ کی ذمہ داری نہیں؛ لیکن اللہ ہی جسے چاہتے ہیں، ہدایت دیتے ہیں۔

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُسَيْطِرٍ ۔ (الغاشیۃ:۲۲)

آپ ان پر داروغہ تو ہیں نہیں۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔ (النحل:۱۲۵)

(اے رسول!) آپ اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ بلایئے اور ان سے بہتر طریقہ پر بحث کیجئے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ، اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۔ (الشعراء:۳-۴)

اس لئے کہ وہ ایمان نہیں لاتے، شاید آپ اپنی جان دے دیں گے، اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے ایک نشانی اُتار دیں، پھر ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک کر رہ جائیں (لیکن اس طرح مسلمان بنانا مقصود نہیں)۔

اور نبی ﷺ کی شان مبارک کس خوبصورت اور والہانہ انداز سے قرآن پاک میں بڑھائی گئی ہے، ارشاد ہے :

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۔ (الحجر:۷۲)

آپ کی جان کی قسم! (مگر) وہ تو اپنے نشہ میں بدمست تھے۔

بلکہ معاملہ یوں ہے :

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۔ (الشوریٰ:۱۳)

اللہ جس کو چاہتے ہیں، اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور اپنی طرف آنے کا راستہ اسی شخص کو دکھاتے ہیں، جو اس کی طرف رُجوع کرے۔

بلکہ قرآن نے تو انتہا کر دی کہ :

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ (الحجرات:۱۷)

وہ آپ پر احسان جتاتے ہیں کہ وہ مسلمان ہو گئے؟ آپ کہہ دیجئے: تم مجھ پر اپنے مسلمان ہونے کا احسان نہ جتاؤ، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر احسان فرمارہے ہیں کہ اس نے تم کو ایمان کا راستہ دکھایا، اگر تم سچے ہو۔

یہ تمام آیتیں اس بات کا کھلم کھلا ثبوت ہیں کہ اسلام کوئی خوشامدی یا زبردستی تھوپا جانے والا مذہب نہیں؛ بلکہ اس کا اپنا چیلنج ہے :

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔ (الکہف:۲۹)

(اے نبی!) آپ فرما دیجئے: تمہارے پروردگار کی طرف سے دین حق آچکا ہے، پھر جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے۔

لہٰذا اب اس بات کی گنجائش ہی سرے سے نہیں رہ گئی کہ اسلام کو آپ ﷺ نے بزورِ شمشیر پھیلایا ہے، آپ ﷺ کی دی گئی مذکورہ بالا ساری ہی تعلیمات اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ کسی داعی کے بھی بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کو اسلام میں داخل کر دے، اور اگر کوئی بادل ناخواستہ اپنے کو دسترخوان اسلام کا خوشہ چیں کہے بھی تو اس کی بات کوئی اعتبار نہیں؛ اس لئے قبول اسلام اللہ کے لئے ہو تبھی معتبر ہے، ورنہ دکھاوے کا اسلام یا زبردستی قبول کرایا گیا اسلام کوئی حیثیت نہیں رکھتا، یہاں معاملہ ہی الگ ہے کہ کسی طرح کی گنجائش چھوڑی ہی نہیں گئی، اللہ پاک نے فرمادیا :

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۔ (قٓ:۱۶)

اور ہم تو اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

فتوحاتِ اسلام کا دور

ہلکی سی جھلک اس دور کی بھی دیکھتے چلیں جس میں آپ ﷺ کو فتوحات میسر ہوئیں، غزوہ بدر کے قیدیوں کے ساتھ آپ ﷺ نے کیا کیا، یہ تو وہ لوگ تھے جنھوں نے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی، پر آپ ﷺ نے ایسا زبردست عملی پیغام دیا کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے بانجھ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو اپنی جان کا فدیہ دے وہ آزاد اور جس کے پاس کچھ بھی نہیں وہ بطور فدیہ مدینہ کے نونہالوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دے۔(۱)

دوسری مثال فتح مکہ کی لیجئے کہ آپ کے سامنے سارے افلاطون بھیگی بلی کی طرح یاس واُمید کے سمندر میں غوطہ زن تھے کہ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: آج تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے؟ سب نے یک زبان ہو کر پکارا: ''خیرا ، أخ کریم و ابن أخ کریم''، بہتر سلوک؛ کیوں کہ آپ شریف بھائی اور شریف بھتیجے ہیں، آپ ﷺ نے اعلان فرمایا: ''اذهبوا و انتم الطلقاء'' جاؤ تم سب کو معاف کیا۔(۲)

حضرت ثمامہ بن اثال کا واقعہ بھی تاریخ کے صفحات میں درج ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قید میں ہیں اور ناقدانہ انداز میں آپ ﷺ کی تعلیمات اور زندگی کا جائزہ لینا چاہتے ہیں؛ لیکن آپ ﷺ کا طرزِ عمل اپنے ساتھ دیکھ کر خود شکار ہو جاتے ہیں اور کلمہ توحید پڑھ کر اسلام کی آغوش میں آ جاتے ہیں،(۳) نہ جانے کتنے اس قسم کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں، جن سے دُور دُور تک تلوار یا کسی بھی قسم کے ظلم وتشدد کا دُور دُور تک واسطہ نہیں ہے۔

(۱)　مسند أحمد بن حنبل: ۱/ ۲۴۷۔

(۲)　السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: ۴/ ۵۴، ۵۵، تاریخ الطبری: ۳/ ۶۰، ۶۱۔

(۳)　الاصابۃ: ۱/ ۲۰۴۳، الاعلام للزرکلی: ۲/ ۸۲۔

یہ تھا ایک مظلوم کا مقدمہ انصاف کی عدالت میں کہ جس نے قوت حاصل ہونے کے دور میں دو دو مہینے اپنے گھر چولہے میں آگ نہ دیکھی ہو، جس نے دشمنوں کو یوں ہی معاف کر دیا ہو، زبانی دعوے اور قلم کو لے کر ہزاروں اوراق سیاہ تو کوئی بھی کر دے؛ لیکن عملی محبت ورواداری کی حقیقی مثال محمد ﷺ اور آپ کے غلاموں کا امتیاز ہے، تاریخ عالم ایسی کوئی بھی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کسی شخص نے اپنے پیغام کی حقانیت اور سچائی کو ثابت کرنے کے لئے اور اپنی بات کے وزن کو ظاہر کرنے کے لئے ساری زندگی داؤ پر لگا دی ہو، یقیناً ایسی مثال صرف حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ گرامی کے یہاں ملتی ہے، جس کو قرآن ابدالآباد تک کے لئے نقل کیا فرمایا :

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ (یونس:۱۶)

میں تو اس سے پہلے بھی تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہو، کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟

کیا یہ ممکن ہے کوئی شخص جس نے اپنی بات کو زبردستی لوگوں پر تھوپا ہو یا جسے اپنی بات کو منوانے کے لئے تلوار کا سہارا لینا پڑا ہو وہ بھی اس انداز میں کہ اس کے خوف سے اس کی بات بادل ناخواستہ ہی سہی پر تسلیم کر لی جائے، وہ اپنی زندگی کو اس انداز میں بطور نمونہ پیش کر دے کہ دیکھو میری بات تمہیں اس لئے ماننا ضروری ہے کہ میری ساری زندگی تمہارے سامنے ہے، نہیں ہرگز ایسا ممکن نہیں ہے، ایسی مثال وہی شخص پیش کر سکتا ہے، جس کی ساری زندگی خیر خواہی، صدق وامانت، ورع ودیانت، ظالم کو ظلم سے باز رکھنے اور مظلوم کی حمایت کرنے، امن وامان قائم کرنے، کمزوروں کا سہارا بننے اور مخلوق کو خالق سے جوڑنے، انسانیت وآدمیت کا درس دینے میں گذری ہو اور یہ ساری باتیں محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

ہاں رسول اللہ ﷺ نے تلوار اٹھائی ہے اور اس کا استعمال بھی کیا؛ لیکن اس سے آپ ﷺ کا منشاء دین پر یا اس کے قبول پر جبر واکراہ ہرگز نہیں تھا؛ بلکہ دنیا کو اس بات سے روشناس کرانا تھا کہ اگر ضرورت پڑ جائے اور نوبت تلوار اُٹھانے کی آجائے تو اس تلوار کا استعمال اس طرح کیا جائے کہ جو لوگ برسرِ پیکار ہیں صرف انہیں سے لڑا جائے، جو لوگ اپنی عبادت گاہوں میں عبادت میں مصروف ہوں، ان سے اعراض کیا جائے، کسی عورت پر ہرگز ہاتھ نہ اُٹھایا جائے، کسی بچے یا بوڑھے کو ہرگز قتل نہ کیا جائے، سرسبز وشاداب درختوں کو نہ کاٹا جائے، جانوروں کے ساتھ ظلم نہ کیا جائے، یہ سب وہ تعلیمات ہیں جن کو سکھانے کے لئے اور جنگ کے آداب ملحوظ رکھنے نیز آدمیت کا احترام ووقار برقرار رکھنے کی تعلیم دینے کی خاطر آپ ﷺ نے تلوار کا استعمال کیا، اس لئے کہ آپ ﷺ کی بعثت اس حیثیت سے ہوئی کہ آپ کو اُسوہ اور نمونہ بنایا گیا، ظاہر ہے کہ اس میدان کی تعلیمات سے واقف کرانے اور نمونہ چھوڑنے کی غرض سے تلوار اُٹھائی گئی اور تاریخ شاہد ہے ظلم کا ایک لمحہ بھی ان تمام غزوات وسرایا میں پیش نہیں کیا جاسکتا، تمام

غزوات وسرایا میں مقتولین کی تعداد ۱۰۱۸ سے کم ہے،جس میں دونوں فریق کے مقتولین شامل ہیں، اب بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام جیسے آفاقی مذہب کو کیا اس کوضرورت ہے کہ اس کی نشرواشاعت کے لئے شمشیر وسنان کا استعمال کیا جائے؟ اسلام کی تعلیمات اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی سامنے رکھ کر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ بصارت وبصیرت رکھنے والا انسان بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ اسلام دین فطرت ہے اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اس کے آگے سر تسلیم خم کیا جائے۔

• • •

اسلام کی پُر امن اشاعت — ایک مختصر جائزہ

مولانا محمد عبید اختر رحمانی ◆

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو فرمایا ہے کہ: ''يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ'' (المائدۃ:٦٧) آپ اللہ کا پیغام پہنچایئے ،لوگوں سے آپ کو اللہ بچائے گا،اس سے علماء نے یہ سمجھا اوراستنباط کیا ہے کہ جیسے پیغام ربانی کی تبلیغ آنحضرت کے لئے لوگوں کے شر سے بچنے کی وجہ تھی ، ویسے ہی اگر مسلمان بھی اشاعت اسلام کے کام میں لگیں گے تو اللہ اس اُمت کی بھی دوسری قوموں کے شر سے حفاظت کرے گا اور تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان چودہ صدیوں میں جب کبھی کمزور پڑے، تو دعوت وتبلیغ کے کام سے ہی ان کو عروج ملا ، تا تاریوں کا حملہ اس زور کا تھا کہ لگتا تھا کہ مسلمانوں کے دن گن چکے ہیں ؛ لیکن تبلیغ ودعوت اسلام کی بدولت تھوڑے ہی عرصہ میں تا تاری مسلمان ہو گئے اور پھر انھوں نے حرم کی پاسبانی کا فریضہ انجام دیا، یہی واقعہ سلجوقیوں کے ساتھ بھی پیش آیا کہ وہ بھی ابتداء میں مسلمانوں کے لئے زحمت اور بعد میں رحمت بنے ، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تاریخ ادبیات عرب کے مشہور مصنف پروفیسر ہٹی نے لکھا ہے :

> مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے۔ (تاریخ ادب عربی:۴۸۸)

اور ٹی ڈبلیو آرنلڈ لکھتے ہیں :

> اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے بعض انتہائی شاندار اور روحانی فتوحات حاصل کی ہیں، دو بڑے تاریخی مواقع پر وحشی کافروں نے اپنے پاؤں محمد (ﷺ) کے پیروؤں کی گردن پر رکھ دیئے تھے، گیارہویں صدی عیسوی میں سلجوق ترکوں نے اور تیرہویں صدی عیسوی میں مغلوں نے، مگر ہر بار فاتح نے اپنے مفتوح کے مذہب کو قبول کرلیا۔ (پریچنگ آف اسلام:۲)

◆ نگراں : شعبۂ تحقیق المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

عہد نبوی میں اشاعت اسلام

اشاعت اسلام کی ابتداء حضرت خدیجہؓ سے ہوتی ہے، حضرت خدیجہؓ کو معلوم ہے کہ ان کے شوہر کتنے پاکباز اور سچے ہیں؛ لہٰذا وہ کسی قسم کے حیل وحجت کے بغیر اسلام لے آتی ہیں، آپ کے دوست حضرت ابوبکرؓ آپ کی بات سن کر ایمان قبول کر لیتے ہیں، حضرت ابوبکر کی تبلیغی مساعی سے حضرت عثمانؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت طلحہؓ اور دیگر مقتدر شخصیات اسلام قبول کرتی ہیں،(۱) اسد الغابہ میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر عشرہ مبشرہ میں سے پانچ افراد نے اسلام قبول کیا، تاریخ خمیس میں ان افراد کے علاوہ حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد اور ارقم بن الارقم کا نام ملتا ہے، جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے کہنے سننے سے اسلام قبول کیا تھا(۲۸۷)، سیرت ابن ہشام میں ان افراد کے علاوہ مزید کچھ نام ملتے ہیں، علاوہ ازیں سیرت ابن ہشام میں یہ بھی مذکور ہے کہ اسلام قبول کے بعد حضرت ابوبکر نے اسلام کی تبلیغ واشاعت کو ہی اپنا کام بنالیا تھا، اپنے ملنے جلنے والوں کو اسلام کی دعوت دیتے رہتے تھے،(۲) حضرت علیؓ باوجود صغر سنی کے اسلام قبول کر کے آپ کا ساتھ دینے کا اعلان کرتے ہیں،(۳) حضرت حمزہ ابوجہل کے برتاؤ کے ردعمل میں اسلام قبول کرتے ہیں،(۴) حضرت عمرؓ تو نعوذ باللہ حضور کے قتل کے لئے جاتے ہیں؛ لیکن صیاد خود صید ہوجاتا ہے اور حضرت عمر اسلام کا کلمہ پڑھ کر لوٹتے ہیں، حضرت طفیل دوسی قرآن سن کر اسلام قبول کر لیتے ہیں، مدینہ سے کچھ افراد آتے ہیں، حضور کی باتیں اور قرآن سنتے ہیں تو اسلام قبول کرنے کی جانب سبقت کرتے ہیں،(۵) حضرت مصعب بن زبیر کو مدینہ میں اسلام کی اشاعت کے لئے بھیجا جاتا ہے، ان کے ہاتھوں پر حضرت اسید بن حضیر اور سعد بن معاذ اسلام قبول کر لیتے ہیں،(۶) یہ دونوں چوں کہ اپنی قوم کے سردار بھی ہیں؛ لہٰذا ان کی فرمائش وفہمائش پر ان کے قبیلہ کے سارے آفراد اسلام قبول کر لیتے ہیں۔(۷)

حضرت قیس بن یزیدؓ ممتاز صحابی ہیں، ان کی دعوت پر ان کی قوم نے اسلام قبول کرلیا تھا،(۸) اسی طرح قیس اسلمی کے تذکرہ میں ہے ''وہ اسلام لاکر پلٹے تو کہا کہ اے بنوسلیم، میں نے روم کے افراد کے حالات زندگی، عرب کاہنوں اور حمیر کے بہادروں کے اشعار سنے؛ لیکن محمد کا کلام ان سب سے الگ ہے، محمد کے معاملے میں میری

(۱) الاستیعاب:۳/۶۹۹۔
(۲) سیرت ابن ہشام:۱/۲۴۹۔
(۳) سیرت ابن اسحاق:۱۳۷۔
(۴) سیرت ابن ہشام:۱/۲۹۱۔
(۵) سیرت ابن ہشام:۱/۳۸۲۔
(۶) سیرت ابن ہشام:۱/۴۳۴۔
(۷) سیرت ابن ہشام:۱/۴۳۵۔
(۸) اسد الغابہ:۴/۴۲۹۔

بات مانو؛ کیوں کہ تم ان کے رشتہ میں ماموں ہوتے ہو،(۱) ایک صحابی کسی چشمہ کے مالک تھے، جب وہ اسلام سے مشرف ہوئے تو انہوں نے اپنی قوم کو اسلام لانے کے لئے سو اونٹ دیئے، (۲) حضرت قیس بن غزیہ کے حالات میں ہمیں ملتا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی۔(۳)

رسول اللہ ﷺ نے بعض افراد کو اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دینے کی جانب بھی مامور فرمایا تھا: مثلاً حضرت ابوذر غفاری کو اپنی قوم کی جانب اسلام کی دعوت دینے کی جانب روانہ فرمایا، (۴) حضرت طفیلؓ دوسی کو آنحضرت ﷺ نے اپنی قوم کی جانب اسلام کی دعوت دینے کے لئے روانہ فرمایا؛ چنانچہ ان کی دعوت پر ان کی قوم نے اسلام قبول کرلیا، (۵) اس کے علاوہ بعض صحابہ کرام کا نام اُسوہ صحابہ کے مولف مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی ذکر کیا ہے، اسے ذکر کیا جاتا ہے :

● حضرت مالک بن مرارہؓ : انھوں نے عک اور ذی خیوان کو اسلام کی دعوت دی اور ان کی قوم نے اسلام قبول کرلیا۔

● حضرت احنف بن قیسؓ : رسول اللہ ﷺ نے ان کو قبیلہ بنولیث میں اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لئے بھیجا۔

● حضرت عبداللہؓ بن عویجہ البجلی : آپ ﷺ نے ان کو قبیلہ بنی حارثہ کے پاس بھیجا۔

● حضرت محیصہ بن مسعود: آپ ﷺ نے ان کو اہل فدک کی ارشاد وہدایت کے لئے بھیجا۔

● حضرت عمروؓ بن العاص: ان کی نانیہال قبیلہ بلی میں تھی جو بدوؤں کا قبیلہ تھا، اس تعلق سے بدوان سے مانوس تھے؛ لہٰذا ان میں تبلیغ واشاعت اسلام کے لئے بھیجا۔

● حضرت مالک بن احمرؓ : اسلام لانے کے بعد انھوں نے درخواست کی کہ اپنے قبیلہ میں اسلام کی دعوت دینے کے لئے انھیں ایک خط لکھ دیا جائے۔

● حضرت ابوزید انصاری: آپ ﷺ نے ان کے ذریعہ سے عبید وجعفر کو اسلام کی دعوت دی، ان دونوں نے مشرف بہ اسلام ہوکر وہاں کے تمام عرب کو اسلام کی دعوت دی، سبھی نے اسلام قبول کرلیا۔

● حضرت علاءؓ بن عبید الحضرمی : آپ ﷺ نے ان کو بحرین میں بھیجا کہ وہاں کو لوگوں نے اسلام کی دعوت دیں، منذر بن ساوی اور سی بخت کے نام خصوصیت کے ساتھ خط دیا، وہ دونوں مسلمان ہوئے اور ان کے اثر سے وہاں کے تمام عرب اور بعض عجم نے بھی اسلام قبول کرلیا۔

---

(۱) اسد الغابہ: ۴/۲۷۴۔
(۲) سنن ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۹۳۴۔
(۳) اسد الغابہ: ۴/۴۱۸۔
(۴) الطبقات الکبریٰ، ابن سعد: ۴/۲۲۲۔
(۵) معرفۃ الصحابہ لابی نعیم: ۳/۱۵۶۲۔

● حضرت معاذؓ بن جبل: آپ ﷺ نے ان کو یمن بھیجا اور یمن والوں کو اسلام کی دعوت دینے اور اسلامی احکام سے آگاہ کرنے کی تاکید کی۔

اس کے علاوہ بھی مختلف مقامات پر آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو بھیجا جیسا کہ بعض مقامات پر آپ نے حضرت علیؓ کو روانہ فرمایا، حضرت خالد بن ولیدؓ اور دیگر صحابہ کرام کو روانہ فرمایا۔

جب مکہ فتح ہو گیا تو عرب کے قبائل خود اپنے نمائندگان آپ کے پاس بھیجنے لگے، کہ وہ آپ کے پاس آ کر اسلام کے احکام وفرائض سے آگاہ ہوں اور واپس آ کر ان کو مسلمان کر لیں۔(۱)

بنوتمیم کے وفد نے آپ ﷺ سے شاعری اور خطابت میں زور آزمائی چاہی؛ لیکن شاعری اور خطابت دونوں میں ہی مسلمان غالب رہے، یہ دیکھ کر بنوتمیم کے وفد نے اوران کے اثر سے بنوتمیم نے اسلام قبول کر لیا۔

مردوں کے ساتھ عورتیں بھی تبلیغ اسلام کے کام میں دوش بدوش شریک رہتی تھیں، حضرت اُم شریک مکہ کی عورتوں کو خفیہ طور پر اسلام کی دعوت دیتی تھیں، جب کفار مکہ کو ان کی تبلیغی کوششوں کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے ان کو مکہ سے نکال دیا،(۲) حضرت طلحہؓ، حضرت اُم سلیمؓ کے کہنے سے اسلام لائے،(۳) حضرت عکرمہؓ اپنی بیوی اُم حکیمؓ بنت الحارث کے کہنے سننے سے یمن سے واپس لوٹے اور اسلام قبول کیا۔(۴)

یہ چند واقعات محض نمونہ کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں، ورنہ تو پیغمبر اسلام کی سیرت کا ہر صفحہ پر امن تبلیغ اسلام سے عبارت ہے، ان کی زندگی میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا، جہاں آپ نے کسی کو زبردستی مسلمان کیا ہو، یا جبر واکراہ سے کام لیا ہو؛ بلکہ ہر جگہ ہم یہی پاتے ہیں کہ کسی نے آپ کے اعلیٰ اخلاق وکردار، کسی نے عفو ودرگذر اور کسی نے بخشش وسخاوت دیکھ کر اور کچھ افراد نے کلام الٰہی سن کر، کچھ نے اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔

اس کے علاوہ مکہ میں آنحضرت ﷺ کے پاس ایسی کوئی طاقت نہ تھی جس کی بنیاد پر اہل مکہ کو ڈرایا جا سکتا تھا اور زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا؛ بلکہ مکہ میں تو مسلمان خود مجبور، مقہور اور بے بس تھے، ان پر قبول اسلام کی وجہ سے ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے، مشہور یورپی مصنف ٹامس کارلائل نے اس کا پرزور اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے:

یہ بات بہت کہی گئی ہے کہ محمد نے اپنا مذہب تلوار کے ذریعہ پھیلایا، تلوار یقیناً،

---

(۱) فتح الباری:۱۰/۲۹۸۔ (۲) اسد الغابہ، تذکرہ اُم شریک۔

(۳) الطبقات الکبریٰ:۸/۴۲۶۔ (۴) معرفۃ الصحابہ لابی نعیم:۴/۲۱۷۔

مگر آپ تلوار کہاں سے لائیں گے، ہر نیا فکر اپنے آغاز میں لازمی طور پر ایک اقلیت میں ہوتا ہے، وہ ابتداءً صرف ایک انسان کے دماغ میں آتا ہے، ساری دنیا میں صرف ایک آدمی اس کو ماننے والا ہوتا ہے، تمام آدمیوں کے مقابلہ میں صرف ایک آدمی، ایسی حالت میں اگر وہ ایک تلوار لے اور اس کے ذریعہ سے اپنے عقیدہ کو پھیلانے کی کوشش کرے تو اس کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔(۱)

حضور پاک ﷺ کی زندگی میں ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا، جس میں آپ نے کسی کو اسلام لانے پر مجبور کیا ہو، اس کو بزور تلوار کلمہ پڑھایا ہو، یا اس سلسلے میں جبر واکراہ سے کام لیا گیا ہو۔

عہد صحابہ میں اشاعت اسلام

صحابہ کرام کے دور میں بھی اسلام کی پر امن تبلیغ واشاعت کا کام جاری رہا، حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں مثنی بن حارثہ نے کسی کے کہے سنے بغیر اسلام قبول کرلیا اور ان کے اثر سے ان کی قوم کے بہت سے افراد نے بھی اسلام قبول کرلیا، حضرت ابوبکرؓ سے ان امیر العسکر بنادینے کی گذارش کی گئی، حضرت ابوبکرؓ نے ان کو ایک اجازت نامہ لکھ کردے دیا، اس کے بعد انھوں نے اپنی قوم کے ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، انھوں نے بھی اسلام قبول کرلیا، حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں جب حضرت خالد بن ولیدؓ نے عراق پر حملہ کیا تو عراق میں آباد ربیعہ وغیرہ عربی قبائل سب کے سب مسلمان ہو گئے۔(۲)

حضرت عمرؓ کے عہد میں فتوحات کے اسلام کی بھی تیز رفتار اشاعت ہوئی، مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں :

سیاہ اسواری یزدگرد کے مقدمۃ الجیش کا بڑا افسر تھا، یزدگرد جب اصفہان کے لئے روانہ ہوا تو سیاہ کو تین سو سواروں کے ساتھ جن میں ستر افراد سردار تھے، اصطخر کی طرف روانہ کیا اور حکم دیا کہ ہر شہر سے اپنے ساتھ سپاہی کا انتخاب کر کے لیتا چلے، اصطخر پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے سوس کا محاصرہ کیا ہے، اس لئے یزدگرد نے سیاہ کو سوس بھیج دیا، جب سوس فتح ہوگیا تو سیاہ نے تمام سرداروں کو جمع کر کے کہا، ہم پہلے ہی کہتے تھے کہ یہ قوم اس سلطنت پر غالب ہوجائے گی، اور اصطخر کے محل ان کے گھوڑوں کے اصطبل بن جائیں گے، اب بہتر یہی ہے کہ ہم لوگ ان کے مذہب میں داخل ہوجائیں؛ چنانچہ وہ سب کے سب چند شرائط پر مسلمان ہو گئے

---

(۱) دی ہیرو آف پروفٹ: ۲۳، ترجمہ: مولانا وحیدالدین خان، دین کامل۔ (۲) طبری: ۲۱۲۲۔

اور ان کے ساتھ سیابجہ، زط اور اندغار نے بھی جو ہندوستانی قومیں تھیں، اسلام قبول کرلیا۔(۱)

حضرت عمرو بن العاص ؓ نے جب مصر کے بعض قصبات کے لوگوں کو لونڈی غلام بنا کر عرب میں بھیجا اور وہ فروخت ہوکر عرب میں پھیل گئے تو حضرت عمر ؓ نے ان کو ہر جگہ سے بلا کر مصر بھیج دیا اور لکھا کہ ان کو اختیار ہے، خواہ اسلام لائیں، خواہ اپنے مذہب پر قائم رہیں؛ چنانچہ ان میں بلہیب کے رہنے والے کل کے کل مسلمان ہو گئے، ان کے علاوہ بھی بہت سارے قیدیوں نے اسلام قبول کیا، تاریخ طبری میں مذکور ہے، جب تمام قیدی اکٹھا ہو گئے تو عیسائیوں کے سامنے ایک ایک قیدی کو لایا گیا اور اس کو عیسائیت پر قائم رہنے اور اسلام قبول کرنے کا اختیار دیا گیا، جب کوئی قیدی اسلام قبول کرتا تھا تو مسلمان اس زور سے تکبیر کا نعرہ مارتے تھے کہ کسی شہر کے فتح ہونے پر بھی تکبیر کی صدا میں یہ غلغلہ انگیزی نہیں پائی جاتی تھی؛ لیکن اگر وہ عیسائیت پر قائم رہتا تھا تو مسلمانوں کو اس قدر صدمہ ہوتا تھا کہ گویا کوئی آدمی خود ان کی جماعت سے نکل گیا ہے، ابومریم ایک عیسائی تھا جس کے سامنے یہ دونوں مذہب پیش کئے گئے، توفیق ایزدی نے اعانت کی، اور اس نے اسلام قبول کرلیا، مسلمانوں نے فوراً اس کو اپنی جماعت میں شامل کرلیا؛ لیکن ابومریم کے باپ، ماں اور بھائی بھی موجود تھے، انھوں نے اس کو اپنی طرف کھینچا اور باہم اس قدر کشمکش ہوئی کہ اس کے کپڑے پرزہ پرزہ ہو گئے۔(۲)

شطا مصر کا مشہور شہر ہے، وہاں کا رئیس پہلے ہی مسلمانوں سے ہمدردی رکھتا تھا، جب اسلامی فوج دمیاط پہنچی تو دو ہزار آدمیوں کے ساتھ مسلمانوں سے جاملا اور مسلمان ہو گیا، (۳) اسلامی فوج جب آگے بڑھی تو بقارہ، اور دراوہ سے لے کر عسقلان تک ہر جگہ کثرت سے غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا اور ہر جگہ اسلام پھیل گیا۔(۴)

نومسلمانوں کی اتنی بہتات ہوئی کہ ان کو الگ الگ محلوں میں آباد کرنا پڑا، فسطاط مین تین محلے آباد کئے گئے جن میں دو محلے یونانی نومسلموں کے تھے اور ایک محلہ یہودی نومسلموں کا تھا۔

اسلام کی اشاعت کا قافلہ عہد عثمانی میں بھی رواں دواں رہا، عہد عثمانی میں جب آذر بائیجان والوں نے بغاوت کی اور اشعث بن قیس نے اس کو فتح کرکے ان کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا تو وہاں بہت سے عرب آباد کرادیئے کہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں، ان لوگوں کی تبلیغی مساعی کا اثر یہ ہوا کہ جب اشعث بن قیس دوبارہ حضرت علی ؓ کی جانب سے آذر بائیجان کے گورنر مقرر ہوکر آئے تو ان میں اکثر لوگ مسلمان ہوکر قرآن مجید پڑھ چکے تھے۔(۵)

(۱) اُسوۂ صحابہ: ۱۰/ ۱۴۵۔
(۲) تاریخ طبری: ۲۵۸۳۔
(۳) مقریزی: ۱/ ۲۲۶۔
(۴) مقریزی: ۱/ ۱۸۴۔
(۵) فتوح البلدان: ۳۳۷۔

حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ میں بھی اشاعت اسلام کا کارواں تیزگامی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا، جب افریقہ پرفوج کشی کی گئی تو نافع بن قریشی نے فوج میں بربری قبائل کے ان افراد کو بھی شامل کیا جو اسلام قبول کرچکے تھے، اس فوج کے ساتھ جب نافع نے افریقہ کے شہروں کو فتح کیا تو مزید بہت سارے بربروں نے اسلام قبول کیا، معجم البلدان میں ہے :

واسلم علیٰ یدہ خلق من البر بر وفشا فیھم دین اللہ حتی اتصل بلاد السودان ۔

ان کے ہاتھ پر بہت سے بربر اسلام لائے اور ان میں خدا کا دین پھیل گیا، یہاں تک کہ سوڈان تک پہنچ گیا۔

مصر کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے :

مسلمانوں نے ۶۴۲ء میں مصر کو نہایت تیزی سے فتح کرلیا؛ مگر انھوں نے وہاں شدت کے ساتھ مذہبی رواداری پر عمل کیا، مصریوں کو اسلام قبول کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا گیا، حتیٰ کہ حکومتی سطح پر انھیں ترغیب بھی نہیں دلائی گئی، عرب حکمرانوں نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ عیسائی گرجا گھروں کو باقی رکھیں گے۔(۱)

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں لکھتے ہیں :

مصر کے مسلم فاتحین نے عیسائیوں ے ساتھ کامل رواداری کا ثبوت دیا، اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ مصری عیسائیوں کا کثرت سے اسلام قبول کرنا مسلم حکمرانوں کی جانب سے کسی ظلم، یا نا منصفانہ دباؤ کا نتیجہ تھا۔(۲)

مصریات کے ماہر سر آرتھر کیتھ کا کہنا ہے کہ مصر کے عیسائیوں کا کثرت سے اسلام قبول کرنا جبر واکراہ اور تلوار کا نتیجہ نہیں؛ بلکہ اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ تھیں، یعنی قرآن وحدیث کی سادہ، صاف اور واضح تعلیمات نے انھیں متاثر کیا اور انھوں نے کثرت سے اسلام قبول کیا۔(۳)

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا: ۶/ ۴۸۷-۴۸۸۔

(۲) پریچنگ آف اسلام: ۱۰۴۔

(۳) تھیوری آف ہیومن ایوولوشن: ۳۰۳۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں اس کثرت سے مفتوحہ علاقوں کے افراد نے اسلام قبول کرنا شروع کردیا کہ ان علاقوں کے عاملین کو خوف ہوگیا کہ اگر اسی کثرت سے اسلام قبول کیا جاتا رہا تو سرکاری خزانے میں جزیہ سے آنے والی رقم بالکل ختم ہوجائے گی، اس سلسلے میں سرکاری عامل نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خط لکھا تو انھوں نے جواب میں یہ تاریخی فقرہ لکھ کر بھیجا :

محمد ﷺ ہادی (ہدایت کی راہ دکھانے والے) بنا کر بھیجے گئے تھے تحصیل دار اور ٹیکس وصول کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے، (۱) ایک دوسرے عامل کو آپ نے لکھا ''مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہوجائیں اور ہم دونوں کھیتی کرکے اور ہل چلا کر اپنا پیٹ بھریں۔(۲)

بلاذری نے فتوح البلدان مین حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تبلیغ واشاعت اسلام کی کوششوں کے متعلق لکھا ہے :

انھوں نے ہندوستان کے راجاؤں کو قبول اسلام کی ترغیب کے خطوط لکھے، اور ان کو بتایا کہ ان کے حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں، بلاذری نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سادہ اور درویشانہ زندگی اور اعلیٰ اخلاق وکردار کی خبریں ان راجاؤں تک پہنچ چکی تھیں، جب ان کو قبول اسلام کے خطوط ملے تو انھوں نے اسلام قبول کرلیا، اسی طرح اسماعیل بن عبداللہ بن ابی المہاجر مولی بنی مخزوم بلاد مغرب کے والی بنائے گئے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کی معرفت اہل بربر کے لئے قبول اسلام کا خط لکھا، اسماعیل نے بربریوں کے مجمع میں یہ خط پڑھ کر سنایا، بہت سارے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ماوراء النہر کے حکمرانوں کو بھی قبول اسلام کا خط لکھا، خراسان کے اسلام لانے افراد سے خراج معاف کردیا گیا، اسلام لانے کے بعد جن لوگوں نے سرائے تعمیر کرائے تھے ان کو انعام سے نوازا گیا۔(۳)

تاتاریوں کا قبول اسلام

تاتاری ترکستان (روس) اور منگولیا کے کچھ حصوں میں آباد تھے، خانہ بدوش قبائل تھے، چنگیز خان (۱۱۶۲-۱۲۲۷) نے ان کو متحد کیا اور عالم اسلام پر ٹوٹ پڑا، عیش وعشرت میں ڈوبے حکمران اور عوام اس آفت کا

(۱) کتاب الخراج امام ابو یوسف: ۷۵۔ (۲) مناقب عمر بن عبدالعزیز: ۶۴۔
(۳) فتوح البلدان: ۳۳۹، ۴۳۲، ۴۴۶، بحوالہ دعوت وعزیمت، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: ۱/۴۹۔

سامنا نہ کر سکے، تا تاریوں نے مفتوحین کے ساتھ ہر وہ ستم روا رکھا جو خواب وخیال میں آ سکتا ہے، مسجدوں کو اصطبل گاہ بنا دیا، حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچے نکالے گئے اور ان بچوں کو نیزوں کی انی پر لہرایا گیا، سروں کے مینار قائم کیے گئے، تا تاری امراء اور سپہ سالاروں میں اس بات پر مقابلہ ہوتا تھا کہ کس کے سروں کا مینار سب سے زیادہ بلند ہے، چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے بغداد فتح کر کے اسے مقتل بنا دیا، لاکھوں افراد کو قتل کر دیا، بغداد کے کتب خانوں کی بیش قیمت کتابیں دریائے دجلہ وفرات کی نذر ہو گئیں، خلیفہ کو ہلاکو نے بڑی بے رحمی کے ساتھ قالین پر لپیٹ کر ہاتھی سے کچلوا دیا، تا تاریوں کی دہشت مسلمانوں کے دلوں پر اتنی بیٹھ گئی کہ یہ مقولہ زبان زد عام ہو گیا ''اگر کوئی کہے کہ تا تاریوں کو شکست ہو گئی تو اس کا یقین نہ کرنا''، لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد تا تاریوں نے اسلام قبول کر لیا، تا تاریوں کا قبول اسلام کسی جبر کی وجہ سے قطعی نہیں ہو سکتا؛ کیوں کہ وہ فاتح تھے اور فاتح پر مفتوح جبر کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے، پہلے تا تاری حکمرانوں نے اسلام قبول کیا، پھر امراء اور سرداروں نے اسلام قبول کیا اور آخر میں تا تاری عوام نے بھی اتنی کثرت سے اسلام قبول کر لیا کہ اب تا تاریوں میں غیر مسلم اقلیت میں ہیں۔

آرنلڈ تا تاریوں کے قبول اسلام کے تعلق سے لکھتے ہیں :

> لیکن اسلام اپنی گزشتہ شان وشوکت کے خاکستر سے پھر اُٹھا، اور واعظین اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنھوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کر لیا، یہ ایسا کام تھا جس میں مسلمانوں کو سخت مشکلیں پیش آئیں؛ کیوں کہ دو مذہب اس بات کی کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تا تاریوں کو اپنا معتقد بنائیں، وہ حالت بھی عجیب وغریب اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہو گی جس وقت بدھ مذہب اور عیسائی مذہب اور اسلام اس جدو جہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں نے جنھوں نے ان تینوں بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پامال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں، باوجود ان مشکلات کے مغلوں اور وحشی قوموں نے جو مغلوں کے بعد آئیں، ان ہی مسلمانوں کا مذہب قبول کیا، جن کو انھوں نے اپنے پیروں سے روندا تھا۔(۱)

چنگیز خان مرتے ہوئے اپنی عظیم سلطنت اپنے چار بیٹوں میں تقسیم کر دی تھی، اسلامی مبلغین کی کوششوں سے چاروں خاندان جلد ہی اسلام کے پرچم تلے آ گئے، یہ کیسے ہوا، کیوں کر ہوا، اس کی تفصیل دعوت اسلام کے مورخ آرنلڈ کی زبانی پڑھئے :

---

(۱) دعوت اسلام: ۲۴۵۔

مغلوں کا پہلا بادشاہ جو مسلمان ہوا ،وہ برکہ خان تھا ، جو ۱۲۵۶ تا ۱۲۶۷ تک سیرادادرا کا خان رہا، اس بادشاہ کے مسلمان ہونے کی نسبت لکھا ہے کہ ایک دن وہ ایک کارواں میں پہنچا، جو بخارا سے آیا تھا، اس میں دو مسلمان تاجر تھے، جن کو برکہ خان الگ لے گیا، اور اسلام کے متعلق کچھ سوالات ان سے کئے ،مسلمانوں نے اپنے مذہب کے احکام وارکان کو اس خوبی سے بیان کیا کہ سیرادادرا کو مسلمان ہونے کا شوق پیدا ہوا، وہ اسلام لے آیا، اس کا حال برکہ خان نے اپنے چھوٹے بھائی سے بیان کیا ، اور اس کو بھی اسلام قبول کرنے کی ہدایت کی ، اس کے بعد برکہ خان نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا، اسلام قبول کرنے کے بعد برکہ خان نے سلطان مصر رکن الدین بیبرس سے مصالحت کر لی ......غرض جب سلطان رکن الدین اور برکہ خان میں رسم اتحاد پیدا ہوئی تو سیرادادرا کے بہت سے مغل مصر میں آئے ، جہاں ان کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب ہوئی۔

چنگیز خان کے خاندان کی دوسری شاخ میں اسلام کس طرح پھیلا؟ اس تعلق سے آرنلڈ لکھتا ہے :

ایران میں جہاں ہلاکو خان دولت ایلخانیہ کا بانی ہوا، ترکوں میں اسلام کی اشاعت رفتہ رفتہ ہوئی ، ہلاکو خان کا بیٹا تکودار جو اپنے بھائی باقا خان کا جانشیں ہوا، دولت ایلخانیہ کا پہلا بادشاہ تھا جس نے اسلام قبول کیا ،ایک عیسائی مصنف نے لکھا ہے کہ تکودار کی تعلیم وتربیت عیسوی مذہب پر ہوئی تھی ، بچپن میں اس کو اصطباغ ملا تھا، اور نکولس اس کا نام رکھا گیا تھا؛ لیکن تکودار جب بڑا ہوا تو اس نے مسلمانوں کے اثر صحبت سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا ، عیسائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام کو اختیار کیا اور سلطان محمد (یا احمد) نام رکھا، اور جس قدر ہو سکا اس بات کی کوشش کی کہ سب تاتاری اسلام قبول کر لیں، اور اس کے لئے انعام واکرام اور اختیار وعزت لوگوں کو بخشی ، یہاں تک کہ اس کے زمانہ میں بہت سے تاتاری مسلمان ہو گئے ، اس بادشاہ نے سلطان مصر کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر بھیجی۔

چنگیز خان کے خاندان کی تیسری شاخ جس کی حکومت بلاد متوسطہ میں تھی اور جس کا حکمراں چغتائی بن چنگیز خان تھا، اس خاندان میں اشاعت اسلام کے تعلق سے آرنلڈ لکھتے ہیں :

بلاد متوسطہ میں جو چغتائی ابن چنگیز خان اور اس کی اولاد کے حصے میں آئے تھے، دعوت اسلام کے حالات کا پتہ کم چلتا ہے، اس سلسلہ میں پہلا بادشاہ جس کو نور اسلام کی برکت ملی، وہ براق خان تھا، جو چغتائی خان کا پرپوتا تھا، اور جس نے تخت نشیں ہونے کے دو برس کے بعد مسلمان ہو کر سلطان غیاث الدین اپنا نام رکھا۔

براق خان کے مسلم ہونے کے بعد ایک دو مرتبہ اور ایسا ہوا کہ کبھی یہ تاتاری مسلمان ہو جاتے اور کبھی اپنے قدیم دین کی جانب لوٹ جاتے، سلطان کاشغر کے مسلمان ہونے سے تاتاریوں پر اچھا اثر پڑا اور انھوں نے صدق دل سے اسلام قبول کر لیا اور اس کے بعد پھر کبھی وہ مرتد نہ ہوئے، سلطان کاشغر کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ بہت ہی عجیب وغریب ہے، آرنلڈ نے اس سلسلے میں لکھا ہے :

شیخ جمال الدین اور ان کے ساتھی سفر میں تھے کہ نادانستہ تغلق کی شکاری زمین پر سے ان کا گذر ہوا، بادشاہ نے اس قصور میں ان سب لوگوں کی مشکیں کسوا کر اپنے سامنے طلب کیا، اور نہایت غصہ کی حالت میں ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں ہماری زمین پر بے اجازت داخل ہوئے شیخ نے جواب کہ ہم اس ملک میں اجنبی ہیں اور ہم کو مطلق خبر نہ تھی کہ ہم ایسی زمین پر چل رہے ہیں جس پر چلنے کی ممانعت ہے، بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں تو اس نے کہا کہ ایرانی سے تو کتا بہتر ہوتا ہے، شیخ نے کہا کہ سچ ہے، اگر دین برحق ہمارے پاس نہ ہوتا تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے، یہ جواب سن کر تغلق تیمور حیران رہ گیا، اور حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں تو یہ ایرانی ہمارے سامنے حاضر کئے جائیں؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بادشاہ نے شیخ جمال الدین کو علاحدہ لے جا کر کہا کہ جو کچھ تم اس وقت کہتے تھے اس کو اب سمجھاؤ، دین برحق سے تمہارا کیا مطلب ہے، یہ سن کر شیخ نے اسلام کے احکام اور ارکان کو ایسے جوش سے بیان کیا کہ تغلق تیمور کا دل جو پہلے پتھر تھا، اب موم کی طرح نرم پڑ گیا۔

شیخ نے حالت کفر کا ایسا مہیب نقشہ کھینچا کہ بادشاہ کو اپنی غلطیوں سے اب تک بے بصیرت رہنے کا یقین ہو گیا؛ لیکن اس نے کہا کہ اگر اس وقت مسلمان ہونا ظاہر کروں گا تو پھر رعایا کو راہ راست پر نہ لاسکوں گا، اس لئے کچھ عرصہ کے لئے

تم سکوت کرو، جب میں اپنے باپ کے تخت اور ملک کا مالک بنوں تو اس وقت تم میرے پاس آنا، چغتائیہ سلطنت اب حصہ ہوکر چھوٹی چھوٹی عملداریوں میں تقسیم ہوگئی تھی اور برسوں کے بعد تغلق تیمور اس قابل ہوا کہ ان سب عملداریوں کو شامل کرکے پھر قلمرو چغتائیہ کی مثل ایک سلطنت قائم کرے، اس عرصہ میں شیخ جمال الدین وطن واپس چلے گئے اور یہاں سخت بیمار پڑے، جب موت کا وقت قریب آیا تو اپنے بیٹے رشیدالدین سے کہا کہ تغلق تیمور ایک دن بڑا بادشاہ ہوگا، تم اس وقت اس کے پاس جانا اور میرا اسلام پہنچا کر بے خوف وخطر بادشاہ کو یاد دلانا کہ اس نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا، چند سال کے بعد تغلق تیمور نے باپ کا تخت حاصل کرلیا تو ایک رشیدالدین بادشاہ کے لشکر میں پہنچا کہ باپ کی وصیت پوری کرے؛ لیکن باوجود کوشش کے اس کو خان کے دربار میں حضوری نہ ہوئی، آخر اس نے مجبور ہوکر یہ تدبیر کی کہ ایک دن علی الصباح تغلق کے خیمہ کے قریب اذان کہنی شروع کی، تغلق کی نیند جب خراب ہوئی تو غصہ ہوا، اس نے رشیدالدین کو اپنے سامنے بلوایا، رشیدالدین آیا اور اپنے باپ کا پیغام تغلق کو سنایا، تغلق کو پہلے ہی سے اپنے وعدہ کا خیال تھا، وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا، اس کے بعد اس نے اپنی رعا میں اسلام کی اشاعت کی اور اس کے زمانے میں ان تمام ملکوں کا مذہب اسلام ہوگیا جو چغتائی ابن چنگیز خان کی اولاد کے تسلط میں رہتے تھے۔

چنگیز خان کی چوتھی شاخ جس کا بانی اوگتائی خان تھا، اس میں اسلام کس طرح پھیلا؟ اس کی بھی نقاب کشائی آرنلڈ نے کی ہے :

تیمور خان کے زمانہ میں خان انندا نے جوقوبلائی خان کا پوتا تھا، اور چین میں صوبہ کا نسوہ کا حاکم تھا، اسلام قبول کرلیا اور ٹا نگوت میں اس نے بہت لوگوں کو مسلمان کیا، بلکہ جو فوج اس کے ماتحت تھی، اس کے بھی اکثر لوگ مسلمان ہوگئے ...... تمام سلطنت مغلیہ میں ہر جگہ ایسے لوگ موجود تھے جو منکرین کو خفیہ طور پر مسلمان کرلیتے تھے، اوگتائی خان کے عہد میں حاکم ایران کرزنامی کا حال لکھا ہے کہ وہ اول بدھ مذہب کا پیرو تھا، پھر اس نے یہ مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا۔

واضح رہے کہ ان ہی تاتاریوں یا مغلوں کی اولاد میں سے بابر ہے، جس نے نے ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی اور تقریباً چار سو سال تک مغلوں نے ہندوستان پر حکومت کی، خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مغلوں نے ہندوستان میں اسلام کی بقاء اور نشوونما میں قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے، حضرات صوفیائے کرام کی خدمات مسلم؛ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ صوفیائے کرام تبلیغی مشن اسی لئے آزادی سے جاری رکھ سکے کہ ان کے پس پشت ایک مسلم حکومت موجود تھی جو ہر مشکل وقت میں ان کے لئے مددگار ہوسکتی تھی اور بسا اوقات ہوئی بھی، جب کچھ راجاؤں نے صوفیائے کرام کے تبلیغی مشن میں روڑے اٹکانے چاہے، ان سے قتال کیا تو حکومت نے ایسے راجاؤں کی گوشمالی کی اور صوفیائے کرام کو ان کی ایذا رسانیوں سے بچایا، چاہے تبلیغ اسلام کی کوششوں میں مسلم سلاطین کا کوئی رول نہ مانا جائے؛ لیکن کم ازکم ان کی بطور حکومت صوفیائے کرام کے لئے راہ کے روڑے صاف کرنے کی خدمت تو تسلیم کرنی چاہئے۔

سلجوقیوں کا قبول اسلام

تاتاری کی طرح سلجوقی بھی ترک ہی تھے، اور ترکوں کے ایک قبیلہ غز سے تعلق رکھتے تھے، ان ترکوں نے اسلام کیسے قبول کیا، اس تعلق سے معلومات بہت کم ہیں، بعض روسی فضلاء کا خیال ہے کہ ان ترکوں نے پہلے عیسائیت قبول کی، بعد میں اسلام قبول کیا، انھوں نے اسلام کس وجہ سے قبول کیا، اس تعلق سے کوئی مستند بات نہیں ملتی؛ البتہ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ جند کے علاقہ میں جب ان کو مسلمانوں کے ساتھ رہنے کا موقع ملا، مسلمانوں کے مذہب ومعاشرت اور رسوم ورواج سے آگاہی ہوئی تو انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔(۱)

مولانا وحیدالدین خان اس تعلق سے لکھتے ہیں :

> سلجوق، ترکان غز کے ایک سردار کا نام تھا، اس نے قبائل کی ایک فوج جمع کی اور گیارہویں صدی عیسوی میں مغربی ایشیاء پر حملہ کردیا، اس نے ایک طاقتور سلطنت بنائی، اس کی سلطنت میں اُردن، شام، عراق، فلسطین وغیرہ کے علاقے شامل تھے، ان علاقوں میں اس وقت مسلمانوں کی حکومت تھی، سلجوقی ترکوں نے مسلم افواج کو زیر کرکے یہاں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی، سلجوق کے بعد طغرل بیگ (م: ۱۰۶۳) اور الپ ارسلان (م: ۱۰۷۳) اس کے وارث بنے، تاریخ اسلام کا یہ عظیم الشان واقعہ ہے کہ سلجوق ترک جو ابتداء وحشی قبائل تھے، انھوں نے اسلام قبول کرلیا،

---

(۱) اُردو اسلامی انسائیکلو پیڈیا: ۱۱/ ۱۳۸۔

اور ۲۰۰ / سال سے زیادہ مدت تک اسلام کی پاسبانی کی ، انھوں نے شیعہ سنی ،
لڑائیوں کو ختم کر کے اسلامی دنیا میں اتحاد پیدا کیا ، انھوں نے بڑی بڑی مسجدیں
اور مدرسے بنائے ، انھوں نے اسلام کے خلاف عیسائی حملوں کا طاقتور دفاع کیا۔(۱)

الجرائز میں اسلام کی اشاعت

الجزائر میں بربر قبائل کی اکثریت ہے، ان قبائل کے چاروں اطراف پہاڑ تھے جس کی وجہ سے ان کو قدرتی حفاظت ملی ہوئی تھی ،قبائلی وحشیانہ مزاج ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ، ان میں اشاعت اسلام کی متعدد کوششیں کی گئیں لیکن ناکام رہیں بربروں میں اسلام کی اشاعت اس طرح ہوئی ، جب اندلس پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا (۱۴۹۲ء) اور مسلمانوں کے لئے وہاں زندگی دوبھر ہوگئی تو مسلمان وہاں سے نکلنے لگے، قادریہ سلسلے کی ایک خانقاہ میں انھیں پناہ ملی ، خانقاہ کے شیخ نے دیکھا کہ یہ لوگ ہنرمند ہیں، مختلف علوم وفنون سے واقف ہیں، علاوہ ازیں بے وطن ہونے کی وجہ سے ان کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہے، ایسے لوگوں کو کسی اعلیٰ مقصد میں لگانا چاہئے ؛ چنانچہ خانقاہ کے شیخ نے اندلس کے مہاجرین سے اسلام کی عظیم نعمت اور قبائلیوں کے اس سے محروم ہونے پر پرزور خطاب کیا اور ان کو ان قبائل میں اسلام کی اشاعت ودعوت عام کرنے کی ترغیب دی، انھوں نے کہا :

> ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اسلام کی مشعل ان ملکوں میں لے جائیں جو برکات اسلام کی نعمت سے محروم ہو چکے ہیں، ان بدقسمت قبائل کے ہاں نہ تو مدارس ہیں اور نہ کوئی شیخ ہے، جو ان کے بچوں کو بھی اُصول اخلاق اور محاسن اسلام کی تعلیم دے سکے، یہ لوگ جانوروں کی طرح رہتے ہیں، جن کو نہ خدا کا علم ہے اور نہ دین کا، لہٰذا میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس ناگوار صورت حال کی اصلاح کے لئے تمہاری دینی حمیت اور تمہارے نور ایمان سے درخواست کروں ؛ تاکہ یہ کوہستانی لوگ اپنی قابل رحم جہالت کی دلدل میں غلطاں و پیچاں نہ رہیں، اور ہمارے دین کی شاندار صداقتوں سے باخبر ہوجائیں ، اور ان کے ایمان کی بجھتی ہوئی آگ کو ہوا دو اور اس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو دوبارہ روشن کرو، اپنے پہلے مذہب یعنی عیسائیت کی جس ضلالت سے وہ اب تک آلودہ ہیں، اس سے ان کو پاک کرو اور ان کو یہ سمجھاؤ کہ سیدنا محمد ﷺ کے دین میں عیسایت کے برعکس میل کچیل اللہ تعالیٰ کی نظروں میں مقبول نہیں ہے، میں تم سے یہ بات پوشیدہ نہیں

(۱) دین کامل: ۲۳۲۔

رکھنا چاہتا کہ تمہارے کام میں بہت سی دشواریاں ہیں ؛ لیکن تمہاری نا قابل تسخیر حمیت اسلامی اور حرارت ایمانی خدا کے فضل وکرم سے تمام مشکلات پر غالب آئے گی ، میرے بچو! جاؤ ، اور اس بدنصیب قوم کو خدا اور اس کے رسول کی طرف دوبارہ لاؤ ، جو اس وقت جہالت اور کفر کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے ، ان کو نجات کا پیغام پہنچاؤ ، خدا تمہارے شامل حال رہے اور تمہاری مدد کرے ۔(۱)

مہاجرین یوں ہی سب کچھ لٹا چکے تھے ، وہ اس کے لئے تیار ہوگئے ، یہ اندلسی مہاجرین پانچ چھ افراد کی ٹولیوں میں مختلف جگہوں کے لئے روانہ ہوگئے ، انھوں نے ویران مقامات میں ڈیڑہ ڈالا ، قبائل کے درمیان ان کی نیکی اور پرہیزگاری کا چرچا ہونے لگا ، یہ مبلغین جسمانی امراض کے علاج سے واقف تھے ، اس کے علاوہ مختلف قسم کی صنعت وحرفت سے بھی آگاہ تھے ، رفتہ رفتہ انھوں نے ان قبائل میں اپنی ان خصوصیات کی بنا پر اثر ورسوخ قائم کرلیا ، ہر مبلغ جماعت کا ڈیرہ تعلیم وتبلیغ کا مرکز بن گیا ، قبائلیوں کے بچے یہاں تعلیم حاصل کرنے لگے ، پھر یہ طلبہ لوٹ کر اپنے قبائل میں اسلام کی دعوت دینے لگے ، تھوڑے ہی عرصہ میں اسلام بربری قبائل کے تمام علاقوں اور پورے الجزائر میں پھیل گیا۔

انڈونیشیا میں اشاعت اسلام

انڈونیشیا میں مسلمان کبھی عسکری طور پر داخل نہیں ہوئے ؛ لیکن اس کے باوجود پورا انڈونیشا مسلمان ہے ، اور یہ اسلام پر تلوار اور جبر واکراہ کا اعتراض کرنے والوں کا عملی جواب ہے کہ جس مقام پر کسی مسلمان نے تلوار نہیں چلائی ، تیر نہیں پھینکا ، عسکری اقدامات نہیں کئے ، اس ملک کے باشندوں نے کیوں اسلام قبول کرلیا؟ انڈونیشیا میں اسلام کیسے پھیلا ، اردو انسائیکلوپیڈیا کے حوالہ سے کچھ ذکر کیا جاتا ہے :

آج انڈونیشیا ایک عظیم ترین اسلامی ملک ہے ، جہاں بیس کروڑ کے قریب مسلمان موجود ہیں ، لیکن تیرہویں صدی سے قبل وہاں ایک بھی مسلمان نہیں تھا ، لوگ یا تو ہندو تھے یا مظاہر پرست ، اسلام کا یہاں قدم جمانا اور پھر تمام جزائر پر چھا جانا ، بقول کرافورڈ ایک عجیب اور مہتمم بالشان واقعہ ہے ، انڈونیشیا کو مسلمان حملہ آوروں نے فتح نہیں کیا بلکہ مسلمان تاجروں اور مبلغوں نے مختلف جزیروں میں راجاؤں ، امیروں اور عوام کو دین حق کی تبلیغ اور اپنے اوصاف حمیدہ سے متاثر کر کے اسلام قبول کرنے پر

(۱) پریچنگ آف اسلام: ۲۹ تا ۱۲۸۔

آمادہ کیا، مجمع الجزائر میں سب سے پہلے ساترا نے اسلامی اثرات قبول کئے، بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں آچے (آچیہ) کے کچھ باشندے شیخ عبداللہ عارف کی کوششوں سے مسلمان ہوئے، ان کے خلیفہ شیخ برہان الدین نے مغربی اورجنوبی ساترا میں دین کی وسیع اشاعت کی، انھوں نے ایک مدرسہ قائم کیا، جہاں نومسلموں کو دینی تعلیم دی جاتی تھی، اورتبلیغ کے اصول سکھائے جاتے تھے، ان نومسلم مبلغوں نے مختلف علاقوں میں اسلام کا پیغام پہنچایا اورآچے کا پورا علاقہ اسلام کے زیراثر آگیا، حتی کہ ۱۲۰۵ء میں پہلی اسلامی ریاست وجود میں آئی، چودھویں صدی عیسوی میں شیخ اسماعیل کے زیر قیادت کچھ مسلمان حجاز سے پہنچے، جن کی مساعی سے سمدرا، آرو، اورپینگ کباؤ کے راجا اور باشندے مسلمان ہوگئے، پندرہویں صدی عیسوی میں بھی پالم بانگ اورلمپانگ کے راجاؤں اور باشندوں نے بھی اسلام قبول کرلیا، جاوا میں اشاعت اسلام ایک تحریک کی شکل میں چودہویں صدی عیسوی یں اختیار کی، جب مولانا ملک ابراہیم نے گریسک میں ایک تبلیغی مرکز قائم کیا، اس تحریک کے مندرجہ ذیل نوہنما بہت مشہور ہیں اورانہیں ولی کا درجہ دیا جاتا ہے، ایک اورنامور مبلغ رادن فاتح تھے، جن کی قیادت میں مبلغین اسلام نے ۱۴۲۸ء میں مجاپائت کے حکمراں کوشکست دی اور جاوا میں پہلی اسلامی سلطنت قائم کی، بورنیو میں اشاعت اسلام کا آغاز پندرہویں صدی کے آغاز میں ہوچکا تھا، مگر مجاپائت کے خاتمے پر یکے بعد دیگر بنجر ماسین، دامکہ، برونی اورسکدانہ کے فرماں روا اورعوام مسلمان ہوتے ہوگئے، یہاں مبلغین کے سردار شیخ شمس الدین حجاز سے آئے تھے، ان کے ہاتھ پر سکدانہ کے راجا نے اسلام قبول کیا اور سلطان محمد صفی الدین کا لقب پایا، سلاویسی میں اسلام بورنیو کے نومسلموں کی بدولت پھیلا، سب سے پہلے مکلسر اور بوگی قومیں اور پھر اہل منہاسہ مسلمان ہوئے، موخرالذکر کو پرتگالیوں نے عیسائی بنالیا تھا، مکلسر کے نومسلم خاص طور پر بڑے پرجوش مبلغ ثابت ہوئے۔

جزائر مالوکا میں اسلام کی ابتداء پندرہویں صدی عیسوی میں ہوئی، جب ایک عرب مبلغ شیخ منصور نے تدورے کے راجا کومسلمان کرکے اس کا نام سلطان جلال الدین رکھا، اسی زمانے میں ترناتے کے راجا نے بھی مسلمان ہوکر اپنا نام

سلطان زین العابدین رکھا، موخر الذخر کے جانشیں سلطان باب اللہ کی کوششوں سے جزائر مالوکا میں دور دور تک اسلام پھیل گیا۔ جزائر سونڈا صغیر میں تبلیغ کا فرض مکاسر کے منظم اور پرجوش مبلغین نے انجام دیا، سولہویں صدی عیسوی میں سمباوا اور اس کے بعد قلورس، تیمور اور سمبا میں بھی اسلام پھیل گیا، اس طرح مبلغوں کی ایک منظم تحریک نے جس کے پاس سیاسی اقتدار تھا نہ عسکری قوت، ایسی قوموں کو مسلمان کرلیا جو بڑی بڑی سلطنتوں کی مالک اور اپنے مذہب اور تہذیب ومعاشرہ کی سختی سے پابند تھیں۔(۱)

انڈونیشیا میں جس طرح عجیب وغریب طریقہ سے پوری قوم نے اسلام قبول کیا، وہ تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے چنانچہ وان لیر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :

جو شخص بھی انڈونیشیا کی تاریخ میں داخل ہوتا ہے، وہ ایک نامعلوم دنیا میں داخل ہوتا ہے، لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی پراسرار، معجزاتی طاقت کارفرما تھی جس نے جنوب مشرقی ایشیاء کے لوگوں کو اسلام میں داخل کردیا۔(۲)

ہندوستان میں اشاعت اسلام

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تھانہ تک اسلامی فوج نے یلغار کیا تھا؛ لیکن حضرت عمر رضی اللہ نے سپہ سالار عثمان بن ابوالعاص کی اس روش پر ناراضگی ظاہر کی؛ کیوں کہ وہ دربار خلافت سے اجازت کے بغیر کیا گیا تھا اور اس میں اسلامی فوج کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا، اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے ہندوستان کے تعلق سے تحقیق کے لئے ایک شخص کو بھیجا جس نے ہندوستان کی منفی صورت حال بیان کی جس کی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہندوستان پر فوج کشی کا خیال ترک کردیا، محمود غزنوی کے حملہ سے پہلے ہندوستان کے مختلف ساحلی علاقوں میں مسلم آبادیاں قائم ہوچکی تھیں۔

سراندیپ

سب سے پہلے مسلمان بستی کہاں قائم ہوئی، اس بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے؛ لیکن عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ دیار ہند میں اولین مسلم بستی سراندیپ میں قائم ہوئی، مشہور مورخ فرشتہ اس سلسلہ میں لکھتا ہے :

---

(۱) اُردو انسائیکلوپیڈیا: ۳/۳۹۰ تا ۳۹۵۔

(۲) دین کامل: ۲۳۷۔

چوں کہ اسلام کے پہلے ہی سے عرب ان جزیروں میں تاجرانہ آتے تھے اور یہاں کے لوگ عرب جایا کرتے تھے۔اس لئے سراندیپ کے راجہ کو اسلام اور مسلمانوں کا حال سب سے پہلے معلوم ہوااور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہی زمانہ میں 40 ہجری یعنی ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں وہ مسلمان ہوگیا تھا، اس کی تائید مشہور سیاح اور ناخدا بزرگ بن شہر یار کی تصنیف عجائب الہند سے بھی ہوتی ہے۔

سراندیپ اور آس پاس والوں کو جب پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے میں سے ایک سمجھدار آدمی کو تحقیق حال کے لئے عرب روانہ کیا، وہ رکتے رکاتے جب مدینہ پہنچا تو رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے تھے، ابوبکر صدیق کی خلافت بھی ختم ہوچکی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا، وہ ان سے ملا اور رسالت مآب ﷺ کے حالات دریافت کئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہ تفصیل بیان کئے، جب وہ واپس ہوا تو مکران (بلوچستان) کے پاس پہنچ کر مر گیا، اس کے ساتھ اس کا ایک ہندو نوکر تھا، وہ صحیح سلامت سراندیپ پہنچ گیا، اس نے رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سارا حال بیان کیا اور ان کے فقیرانہ اور درویشانہ طور وطریق کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ کیسے متواضع اور خاکسار ہیں اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہین اور مسجد میں سوتے ہیں، اب یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ جو اس قدر محبت اور میلان رکھتے ہیں وہ اسی سبب سے ہے۔

ملیبار میں اشاعت اسلام

متعدد روایتیں اس امر کی ملتی ہیں کہ اسلام اور عربوں کا ایک بڑا مرکز وہ تھا جسے ملیبار کہتے ہیں، ملی کے معنی پہاڑ اور بار کا معنی ملک کا ہے، تحفۃ المجاہدین میں ملیبار میں مسلم آبادی اور اشاعت اسلام کے تعلق سے لکھا ہے :

اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد یہودی اور عیسائی سوداگر یہاں آیا کرتے تھے، اور یہاں بود و باش اختیار کر چکے تھے جب اسلام پر دو سو برس گزرے، عرب اور عجمی مسلمان درویشوں کی ایک جماعت حضرت آدم علیہ السلام کے نقش قدم کی زیارت کیلئے سراندیپ جس کو لنکا کہتے ہیں، جا رہی تھی اتفاق یہ ہے کہ ان کا جہاز ہوا کے جھونکوں سے بہک کر ملیبار کے شہر کدنگلور کے کنارے آکر لگا۔شہر کے راجہ زیمور (سامری) نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی، باتوں باتوں میں اسلام کا ذکر آگیا، راجہ نے کہا میں نے یہودیوں اور عیسائیوں کی زبانی تمہارے پیغمبر اور مذہب کا حال سنا ہے اب تم خود سناؤ! درویشوں نے اسلام کی حقیقت اس موثر انداز سے بیان کیا کہ

راجہ کا دل موہ لیا، راجہ نے ان سے عدہ لیا کہ واپسی میں بھی وہ ادھر سے ہی گزرتے جائیں؛ چنانچہ وعدہ کے مطابق وہ آئے، راجہ نے سب امرا کو بلا کر کہا کہ اب میں خدا کی یاد کرنا چاہتا ہوں اور یہ کہہ کر ملک برابر برابر سب افسروں میں تقسیم کر دیا اور خود چھپ کر ان درویشوں کے ساتھ عرب چلا گیا اور مسلمان ہوگیا اور ان درویشوں سے کہا کہ ملیبار میں اسلام کے پھیلانے کی صورت یہ ہے کہ تم لوگ ملیبار سے تجارت شروع کردو اور اپنے امرا کے نام ایک وصیت نامہ لکھ کر سپرد کیا کہ ان پردیسی سوداگروں کے ساتھ ہر قسم کی مہربانی اور لطف کا برتاؤ کیا جائے اور ہر نیک کام میں ان کی مدد کی جائے اور ان کو اپنی عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت دی جائے اور اس طرح ان سے سلوک کیا جائے کہ ان کو وہاں رہنے کی اور اس کو وطن بنانے کی خواہش پیدا ہو، اس وقت سے عرب سوداگر اس ملک میں آنے جانے اور رہنے لگے، تحفۃ المجاہدین کی ایک روایت کے مطابق راجہ کا واقعہ پیغمبر اسلام کے عہد کا ہے؛ لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے اس روایت کو غلط مانا ہے، تحفۃ المجاہدین کی تیسری روایت اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہندوستان کے مغربی ساحل کے بندرگاہوں میں مختلف ملکوں سے تاجر بکثرت آتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے شہر آباد ہوگئے ہیں اور مسلمانوں کی تجارت سے ان میں آبادی بڑھ گئی ہے اور مکانات کثرت سے بن گئے ہیں، یہاں کے سردار اور راجہ مسلمانوں پر سختیاں کرنے سے پرہیز کرتے ہیں، باوجویکہ یہ سردار اور ان کی سپاہ بت پرست ہے، مگر وہ مسلمانوں کے مذہب اور ان کے شعائر کا بہت کچھ پاس ولحاظ کرتے ہیں، بت پرستوں اور مسلمانوں کے اس اتحاد سے اس لئے اور تعجب ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں، بحیثیت مجموعی ملیبار کے ہندوراجاؤں کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ عزت اور مہربانی کا ہے؛ کیوں کہ ان کے ملک میں زیادہ شہروں کا آباد ہوجانا انھیں مسلمان تاجروں کی بودوباش کا نتیجہ ہے۔

ملیبار کے یہی مسلمان عرب تاجر اور سوداگر اور تارکین وطن آگے چل کر نائط اور موپلا کے نام سے مشہور ہوئے اور پرتگیزوں سے پہلے ان کے ہاتھوں میں جہاز رانی کی باگ ڈور تھی، ان کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہوگئے جو دیسی باشندوں میں سے مسلمان ہوگئے یا شادی بیاہ کے ذریعہ برادری میں شامل ہوگئے ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری

برصغیر پاک وہند میں اشاعت اسلام کا سہرا صوفیہ کرام کے سر ہے جن کی مساعیٔ جمیلہ سے کفر وشرک کے مستحکم قلعے نیست و نابود ہو گئے، ہند کے بت کدوں کی رونق ماند پڑنے لگی، شمع توحید فروزاں ہونے سے کفر کی تاریکی چھٹ گئی اور دیارِ ہند میں ہر سو صدائے لا الہ الا اللہ گونجنے لگی، اس خطہ ارض میں قدم رنجہ فرمانے والے صوفیہ عظام نے اپنے اعلیٰ کردار کے ذریعے یہاں کے باسیوں کے دل موہ لئے اور وہ جوق در جوق دولت اسلام سے بہرہ ور ہونے لگے، یہ ان ہی بزرگانِ دین کے قدوم میں منت لزوم کا اثر ہے کہ آج یہاں کروڑوں مسلمان موجود ہیں، پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ (T.W.Arnold) نے اپنی کتاب The Preaching of Islam میں لکھا ہے :

> Among the millians of indian Musalmans there are vast numbers of converts or descendants of comverts, in whose conversion forse played no part and the only influences at work were the teaching and persuasian of peaceful missionaries.
>
> ہندوستان میں آباد لاکھوں مسلمانوں میں سے اکثر ایسے نومسلم یا نومسلموں کی نسل سے ہیں جن پر مسلمان ہونے کے لیے کسی طرح کا جبر یا تشدد نہیں ہوا بلکہ پر امن دعوت اسلام کی تعلیم وہدایت سے انھوں نے بخوشی اسلام قبول کیا۔

ہندوستان میں دوسرے سلسلے کے بزرگوں نے بھی تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کی خدمات انجام دی ہیں اور ان کی خدمات قابل قدر ہیں؛ لیکن ان سب میں گل سرسبد کی حیثیت حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہے، آپ نے ہندوستان میں بڑی حکمت سے اسلام کی نشر واشاعت کا کام انجام دیا، آپ کے اخلاق و کردار میں وہ جادو تھا کہ جو ایک مرتبہ دیکھ لیتا دل ہار دیتا، آپ نے ہندوستان میں تبلیغ اسلام کی جو شمع روشن کی تھی، اسے آپ کے خلفاء اور مریدین نے جاری رکھا اور دن بدن اس کی لَو تیز سے تیز تر ہوتی گئی، ایک روایت کے مطابق: 97 سال حیات رہے، جب کہ دوسری روایت میں: 103 سال کی عمر میں آپ کا وصال 633ھ 1236ء میں اجمیر میں ہوا، آرنلڈ آپ کی دعوتی خدمات کے تعلق سے لکھتے ہیں :

> ہندوستان کے مشہور ومعروف اولیائے کبار میں سے خواجہ معین الدین چشتیؒ بھی ہیں جنہوں نے راجپوتانہ میں اسلام کی تبلیغ کی اور 1234ء میں اجمیر میں انتقال کیا، اجمیر پہنچنے بعد جس ہندو کو پہلے پہل آپ نے مسلمان کیا، وہ راجہ کا ایک جوگی گرو تھا،

رفتہ رفتہ اُن کے مریدوں کی ایک کثیر جماعت اُن کے پاس جمع ہوگئی، جنھوں نے ان کی تعلیم وتلقین سے بت پرستی چھوڑ کر اسلام اختیار کرلیا، اب ایک مذہبی پیشوا کی حیثیت سے آپ کی شہرت سب طرف پھیل گئی اور آپ کا شہرہ سُن کر بہت سے ہندو لوگ اجمیر میں آئے اور آپ کی ترغیب سے مسلمان ہو گئے، روایت ہے کہ جب آپ اجمیر جاتے ہوئے راستے میں دہلی میں ٹھہرے تھے تو وہاں آپ نے سات سو ہندوؤں کو مسلمان کیا تھا۔(۱)

مرے ٹی، ٹائی ٹس (Murray T.Titus) نے اُنیس برس تک برصغیر پاک وہند میں رہ کر اس خطے میں اشاعت اسلام کے موضوع پر تحقیق کیا اور اسلام ان انڈیا اینڈ پاکستان کے عنوان سے مقالہ لکھا، اس مقالے کی تکمیل پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا، اُن کا یہ مقالہ پہلی بار 1929ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا اور پھر 1990ء میں پاکستان میں بھی اشاعت پذیر ہوا، اس مستشرق نے خواجہ صاحب کو ہندوستان کا سب سے معروف مسلم مبلغ قرار دیا ہے :

Titus, Murray T. Islam in India and Pakistan. (2)

مرے مزید لکھتا ہے کہ خواجہ صاحب کی شہرت ایک مرشد کی حیثیت سے اجمیر کے قرب وجوار تک پھیل گئی اور ہندو بڑی تعداد میں اُن کے پاس آتے اور اُن کی ترغیب سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوجاتے۔(۳)

سیر الاولیاء کے مصنف حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے خلفاء کی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ہندوستان میں ان کی وجہ سے اسلام کی اشاعت ہوئی اور کفر کی ظلمت یہاں سے کافور ہوئی۔(۴)

یہ صرف صوفیانہ خوش عقیدگی نہیں ہے؛ بلکہ دیگر مورخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے، ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے :

اجمیر میں عزلت گزریں ہوئے اور اسلام کا چراغ بڑی آب وتاب سے روشن کیا اور ان کے انفاس قدسیہ سے جوق در جوق انسانوں نے ایمان کی دولت پائی۔(۵)

---

(۱) آرنلڈ، پروفیسر ٹی، ڈبلیو، دعوتِ اسلام، مترجم ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، ط: لاہور، محکمہ اوقاف پنجاب: 1972ء، ص: 279۔

(۲) Karachi Royal Books company, 1990.P:43۔ (۳) حوالۂ سابق۔

(۴) سیر الاقطاب: 101۔ (۵) آئین اکبری، سرسید ایڈیشن، ص: 270، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت، ص: 30۔

جگن ناتھ آزاد نے اپنی نظم ''ہندوستان ہمارا'' میں ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کے بانی کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا :

یہ چشتی خانداں ، نازاں ہے جس پر رتبۂ عالی
بنا خواجہ نے اس کی وادیِ اجمیر میں ڈالی
پھلا پھولا بڑھا یہ خانداں اک پیڑ کی صورت
زمیں پر اس کا پھیلا سائباں اک پیڑ کی صورت
تناور پیڑ ہے یہ اور شاخیں ہیں کئی اس کی
ہزاروں دور گزرے پھر بھی ہے صورت نئی اس کی (۱)

سلطان محمود غزنوی نے یوں تو عسکری طور پر لاہور کو فتح کیا تھا؛لیکن لاہور کو اسلامی رنگ میں رنگنے کا کام صوفیا کرام نے انجام دیا سب سے قبل جن بزرگ نے لاہور میں اشاعت اسلام کا کام انجام دیا وہ شیخ اسماعیل بخاری ہیں، شیخ اسماعیل بخاری لاہور میں میں آئے ، وہ علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں کمال رکھتے تھے، وہ یہاں آکر وعظ وتبلیغ کرنے لگے،ان کی مجلس میں ہزاروں افراد شریک ہوتے تھے اور ہر روز صدہا لوگ اسلام قبول کرتے تھے، تذکرہ علمائے ہند میں ان کی بابت لکھا ہے وہ گراں قدر محدث اور مفسر تھے وہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے علم حدیث اور تفسیر سے لاہور کو منور کیا، ہزاروں لوگ ان کے وعظ میں شریک ہوتے تھے اور ان کا وعظ سن کر اسلام قبول کرتے تھے،خزینۃ الاصفیا کے مولف لکھتے ہیں''جب شیخ اسماعیل لاہور تشریف لائے اور جمعہ میں وعظ کہا تو ایک ہزار افراد مشرف بہ اسلام ہو گئے''۔

دوسرے بزرگ جنھوں نے لاہور کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا، وہ شیخ علی بن عثمان ہجویری معروف حضرت داتا گنج بخش لاہوری ہیں،مختلف اسلامی ممالک کا سفر کیا اور وہاں کے علما ومشائخ سے کسب فیض کیا اور سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے اخیر عہد حکومت میں لاہور آئے اور یہاں آکر تصنیف وتالیف اور تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا، کئی لوگ آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے ،جس میں خاص طور پر قابل ذکر سلطان مودود ابن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کا رائے راجو ہے،مسلمان ہونے کے بعد آپ نے اس کا نام شیخ ہندی رکھا،آپ نے تصوف میں متعدد کتابیں لکھیں،جس میں سے ''کشف المحجوب''بطور خاص مشہور ہے۔

ان کے علاوہ دیگر بزرگوں میں سید احمد المعروف سلطان سخی سرور یا لکھ داتا ہیں،آپ ملتان میں پیدا ہوئے

(۱) آزاد،جگن ناتھ،نسیم حجاز (نئی دہلی) محروم میموریل لٹریری سوسائٹی:1999ء۔

اور زبان زدخلق روایت کی بنیاد پر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے کسب فیض کیا اور پھر موضع سودھرہ (پنجاب) میں اقامت اختیار کی اور خلقت آپ پر پروانے کی طرح ٹوٹ پڑی، غیر مسلم بطور خاص آپ سے عقیدت رکھتے ہیں؛ بلکہ غیر مسلموں کی اس علاقے میں ایک نئی قوم بستی ہے جسے سلطانی کہتے ہیں اور وہ کئی باتوں میں مسلمانوں سے مشابہ ہیں اوران کا سب سے بڑا تہوار سلطان سخی سرور کے مزار کی زیارت ہے، ان کے علاوہ دیگر مشائخ میں سید احمد توختہ ترمذی ہیں، آپ ترمذ سے لاہور تشریف لائے اور ہزاروں مخلوق خدا وفیض پہنچایا، ان کے علاوہ سید یعقوب صدر دیوان زنجانی ہیں، آپ ہجری میں ترستان سے لاہور آئے اور لاہور میں نور اسلام کو عام کیا۔

حضرت شیخ فریدالدین گنج شکراور اشاعت اسلام

شیخ فریدین الدینؒ گنج شکر کے آبا واجداد چنگیزی حملے دوران کابل سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے، یہیں شیخ فریدالدین — جن کا اصل نام مسعود تھا — پیدا ہوئے، یہاں اٹھارہ برس کی عمر میں خواجہ قطب الدین سے ملاقات ہوئی ان کے ساتھ آپ دہلی کی طرف چلے، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے ان کو نصیحت کی کہ وہ پہلے علوم ظاہری کی تکمیل کرلیں اور پھر ان کے پاس دہلی آئیں، پانچ سال تکمیل تعلیم کے لئے قندھار میں گزارے اور پھر دہلی آئے، تھوڑے ہی دنوں میں شیخ قطب الدین نے آپ کو نعمت ہائے روحانی سے مالا مال کردیا، جب آپ نے دیکھا کہ دہلی میں لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے یکسوئی نہیں ہوتی تو مرشد کی اجازت سے ہانسی چلے گئے، آپ کے روحانی استعداد سے خواجہ معین الدین اجمیری بھی متاثر تھے، (سیر العارفین، ص:32) فوائد میں متعدد مقامات پر سانپ سے مختلف درویشوں کے ڈسے جانے کا ذکر ملتا ہے، خود وہاں کے لوگوں کی نسبت بھی لکھا ہے کہ وہ زیادہ تر کج طبع اور درشت مزاج اور بداعتقاد تھے، آہستہ آہستہ آپ کی عبادت وریاضت کی شہرت عام شروع ہوئی اور پھر تو لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ آنے لگے حتیٰ کہ شاہان وقت بھی آپ سے ملاقات کے متمنی رہنے لگے۔

بیعت وارشاد کے ساتھ ہی آپ کی توجہ اشاعت اسلام کی بھی جانب تھی؛ چنانچہ راجپوتوں کی کئی برادریاں آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئیں، اس سلسلے میں ضلع ملتان اور ضلع منٹگمری کے گزیٹر میں درج ہے کہ اشاعت اسلام میں جتنی کامیابی آپ کو ہوئی ہے، حضرت خواجہ بختیار کا کی کو شاید ہی ہوئی ہو، مغربی پنجاب کے کئی بڑے بڑے قبیلے آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، مثلاً سیال، راجپوت، وٹو غیرہ، شیخ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ ان کے دست حق پرست پر 16 قوموں (برادریوں) نے اسلام قبول کیا۔

حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی اور اشاعت اسلام

شیخ بہاؤالدین ذکریا سہروردیؒ ہندوستان میں سہروردیہ سلسلے کے موسس اعلیٰ ہیں، شیخ بہاؤالدین ملتان میں پیدا ہوئے، آپ بارہ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوا، اس کے بعد آپ خراسان چلے گئے اور سات برس تک علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی، پھر بخارا میں یہ سلسلہ جاری رکھا، اس کے بعد حج کے لئے تشریف لے گئے اور مدینہ منورہ میں پانچ سال تک روضہ نبویؐ کی مجاوری کی اور شیخ کمال الدین محمد یمنی سے علم حدیث کی سند لی، پھر بغداد گئے اور شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی ے مرید ہوئے، خلعت خلافت سے سرفراز کرنے کے بعد بالغ نظر مرشد نے آپ سے کہا کہ اب آپ ملتان جائیں اور وہاں اقامت اختیار کریں اور وہاں کے لوگوں کو مقصود تک پہنچائیں؛(۱) چنانچہ آپ ملتان آئے اور جلد ہی آپ کو بڑا اعتبار اور وقار حاصل ہو گیا، آپ کے درگاہ کے خادمان نے ایک کتاب انوار غوثیہ کے نام سے شائع کی ہے، اس کتاب میں لکھا ہے کہ حضرت کا وعظ سن کر سندھ، ملتان اور لاہور کے اہل ہنود میں سے بھی بے شمار خلقت نے جس میں بہت سے متمول تاجر اور بعض والیان ملک بھی تھے، دین اسلام اختیار کیا اور حضور کے مرید ہوئے۔

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے شیخ زکریاؒ کی تبلیغی خدمات کا یوں ذکر فرمایا ہے: ''مغربی پنجاب میں اشاعت اسلام کا فخر سب سے زیادہ حضرت بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کو حاصل ہے۔''(۲)

ڈاکٹر روبینہ لکھتی ہیں :

> حضرت بہاؤالدین زکریا کے مریدین کا حلقہ بہت وسیع تھا، آپ کے خلفاء نے سلسلہ سہروردیہ کی ترویج کے ساتھ ساتھ اشاعت اسلام کا فریضہ بطریق احسن سر انجام دیا، آپ نے حضرت سید جلال الدین سرخ بخاری (۵۹۵ھ) کو خرقہ خلافت عطا فرما کر روحانی علوم کی دولت سے مالا مال کر دیا، وہ تیس برس تک آپ کی خدمت میں رہے، پھر حضرت صدر الدین عارف (فرزند اکبر و سجادہ نشین درگاہ زکریا) کے حکم پر اوچ تشریف لے گئے، ان دنوں اوچ کے گرد و نواح میں ہندوؤں کا تسلط تھا، سید جلال الدین نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ دین اسلام کی تبلیغ کی اور کفار کو راہِ راست پر لانے کی ذمہ داری قبول کی اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔(۳)

(۱) سیر العارفین، ص:109۔ (۲) مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تصوف اور تعمیر سیرت، ص:۱۵۳۔

(۳) ڈاکٹر روبینہ، ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ، ص:۹۶۔

محمد دین کلیم مورخ لاہور نے لکھا ہے کہ :

> حضرت بہاؤالدین ملتانی علیہ الرحمۃ مختلف ممالک اور شہروں کی سیر وسیاحت کے بعد ملتان تشریف لائے ، یہاں آ کر آپ نے سلسلہ عالیہ سہروردیہ کا ایک بڑا زبردست مرکز قائم کیا ،جس کا کام مبلغ پیدا کرنا تھا ، انھوں نے آپ کے تبلیغی دوروں کے حوالے سے یہ بتایا جاتا ہے کہ عام طور پر گرمی کا موسم کشمیر، بلخ، بخارا، دمشق، نیشاپور اور افغانستان کی طرف گزرتا اور سردی کے ایام راجپوتانہ، سندھ اور پنجاب کے میدانی علاقہ میں وعظ وتبلیغ پر جاتے ،ساون بھادوں کے مہینوں میں دیبل، ملھیر اور سہوان کی طرف نکل جاتے ۔(۱)

شہزادہ داراشکوہ نے اپنی کتاب ''سفینۃ الاولیاء'' میں ان کا ذکر یوں کیا ہے :

> پھر آپ شیخ الشیوخ سے اجازت لے کر ملتان آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور طالبانِ حق کی ہدایت وارشاد میں مشغول ہوئے ، آپ کی برکت سے بہت سی مخلوق راہِ راست پر آئی اور اس شہر اور اطراف کے تمام لوگ معتقد ہوئے اور آج بھی اس نواح میں آپ کے مرید کثرت سے موجود ہیں ۔(۲)

ایل، بی، ون جونز (L.Bevan Jones) جو بپٹسٹ مشنری سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے، سلسلہ سہروردیہ کا تعارف کرواتے ہوئے شیخ بہاؤالدین زکریا علیہ الرحمہ کا یوں ذکر کرتے ہیں :

> اس سلسلے کی بنیاد ضیاالدین ابونجیب سہروردی نے رکھی جن کا 1167ء میں انتقال ہوا، ہندوستان میں اسے ملتان کے شیخ بہاؤالدین زکریا نے متعارف کرایا جو بانیٔ سلسلہ کے جانشین شیخ شہاب الدین کے مرید تھے، بہاؤالدین نے 1266ء میں وفات پائی ، ملتان میں ان کے مزار کا بہت احترام کیا جاتا ہے، ان کی روحانی اولاد نے اسلام کی اشاعت کا کام مستعدی اور کامیابی سے سرانجام دیا۔

بنگال میں تبلیغ وتوسیع اسلام میں صوفیاء کرام کی کاوشیں

سب سے پہلے جو بزرگ شمالی ہند کے راستے بنگال تشریف لے گئے، شیخ جلال الدین تبریزی تھے، آپ ایرانی نسل سے تھے، پہلے پہل شیخ ابوسعید تبریز کے مرید ہوئے اور ان کی وفات کے بعد شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے کسب فیض کیا۔

---

(۱) کلیم، محمد دین، لاہور کے اولیائے سہرورد، لاہور، مکتبہ تاریخ لاہور، گڑھی شاہو، ۱۹۶۹ء، ص:۸۶۔

(۲) داراشکوہ، شہزادہ، سفینۃ الاولیاء، اُردو ترجمہ محمد علی لطفی، کراچی: نفیس اکیڈیمی، طبع ششم، ۱۹۸۲ء، ص: ۱۵۲۔

بنگالہ میں تبلیغ اسلام کی وجہ آپ کی یہ کرامت بنی کہ شیخ جلال الدین جب دیوہ محل آئے تو ایک کمہار یا مالن کے یہاں قیام کیا، دیکھا کہ اس کے گھر میں آہ وشیون کا طوفان برپا ہے، پوچھا تو پتا چلا کہ اس کے شہر میں ایک رسم یہ تھی کہ راجا کے حکم کے مطابق ہر روز ایک نوجوان دیو کے سامنے بھیجا جاتا تھا اور وہ اسے کھالیتا تھا، اس روز شیخ کے میزبان کے بیٹے کی باری تھی، شیخ نے کہا کہ اپنے بیٹے کو نہ بھیجو، مجھے بھیجو؛ لیکن وہ نہ مانا کہ اگر دیو نے تمہیں قبول نہیں کیا تو راجا مجھے قتل کرادے گا؛ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کو نہلایا، دھلایا، نئے کپڑے پہنائے اور اسے بت خانے میں لے گیا، شیخ بھی ساتھ تھے، بت خانے میں پہنچ کر شیخ نے نوجوان کو تو رخصت کردیا اور خود دیو کا انتظار کرنے لگے، جب دیو اپنے معمول کے مطابق ظاہر ہوا تو شیخ نے اسے اپنے عصا کی ضرب سے ہلاک کردیا، صبح کو راجا اپنے لشکریوں کے ساتھ بت کی پرستش کو آیا تو دیکھا کہ اس بت خانے میں ایک آدمی سیاہ کپڑے اور سیاہ ٹوپی پہنے کھڑا ہے اور لوگوں کو بلا رہا ہے، لوگ یہ دیکھ کر حیران تھے، راجا خود آگے بڑھا، شیخ نے کہا کہ تم بلا کھٹکے آگے آؤ، دیو کو میں نے ہلاک کردیا ہے، لوگوں نے دیکھا تو واقعی ایسے ہی تھا؛ چنانچہ سب لوگ ایمان لائے اور مسلمان ہوئے۔(۱) شیخ جلال الدین کی وفات کب ہوئی اس تعلق سے مختلف روایات ہیں، سیر العارفین اور آئین اکبری کے مطابق آپ کی وفات 642 ہجری یعنی 1244 میں ہوئی، یہی تاریخ خزین الاصفیا میں بھی درج ہے؛ لیکن مشہور اسلامی سیاح ابن بطوطہ کہتا ہے کہ اس نے 746 ہجری مطابق 1345 میں شیخ کی زیارت کی ہے؛ چنانچہ وہ اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے :

> چاٹگام سے میں کامروپ کے پہاڑوں کی طرف کا راستہ اختیار کیا جو یہاں سے ایک مہینہ کی مسافت پر ہے، میرا ارادہ اس ملک میں جانے سے یہ تھا کہ میں شیخ جلال الدین تبریزی کی جو مشہور اولیا اللہ تھے، زیارت کروں، ان شیخ کے ہاتھ پر اس ملک کے اکثر باشندوں نے اسلام قبول کیا ہے، اس ملک کے ہندو مسلمان سبھی شیخ کی زیارت کرتے ہیں اور ان کے واسطے تحفے لاتے ہیں۔
>
> پروفیسر گب کا خیال ہے کہ ابن بطوطہ نے جس شیخ جلال الدین کی زیارت کی تھی وہ شیخ جلال الدین تبریزی نہیں؛ بلکہ جلال الدین سلہٹی تھے؛ لیکن اس نظریہ کو ماننے میں بھی الجھن ہے؛ کیوں کہ شیخ جلال الدین کی اس نے جو صفات بیان کی ہیں یعنی بغداد کی زیارت، خلیفہ مستعصم کا تاتاریوں کے ہاتھ قتل وغیرہ تو وہ شیخ جلال الدین تبریزی پر صادق آتی ہیں۔(۲)

(۱) جوامع الکلم، ص:157۔ (۲) آب کوثر، ص:299۔

شیخ علاالحق سے بھی زیادہ فروغ ان کے صاحبزادے نورالحق المعروف نورقطب عالم نے پایا جن کی نسبت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبارالاخیار میں لکھتے ہیں :

شیخ نورالحق والدین رحمۃ اللہ علیہ المشہور بہ شیخ نورقطب عالم فرزندومریدخلیفہ علاالحق است از مشاہیر اولیائے ہندوستان و صاحب عشق ومحبت و ذوق وشوق وتصرف وکرامت۔

شیخ نورالحقؒ جو شیخ نور قطب عالم کے نام سے مشہور ہیں ، شیخ علاء الحق کے فرزند اورخلیفہ ہیں، ہندوستان کے مشہور بزرگوں میں سے ایک ہیں،عشق ومحبت، ذوق وشوق اورتصرف وکرامت میں آپ کا بلند مقام ہے۔

جب بنگال کے راجہ غیاث الدین کو راجا گنیش نے قتل کرکے تخت سنبھالا تو گنیش نے مسلمانوں اور علما ومشائخ کا قتل شروع کیا اس کا ارادہ تھا کہ بنگال سے اسلام کا نام ونشان مٹا دے، یہ دیکھ کر شیخ قطب عالم نے جونپور کے حکمراں ابراہیم شاہ شرقی کو مدد کے لئے خط لکھا، اس نے بڑی فوج بھیجی، گنیش نے فوج کے آنے کی خبر سن کر معافی مانگی، شیخ نے کہا کہ تم کافر ہو تمہاری ہم مدد کیسے کر سکتے ہیں، گنیش نے کہا کہ میں دنیا ترک کرتا ہوں اور حکومت سے علاحدہ ہوتا ہوں، آپ میرے بیٹے جدو کو مسلمان کرلیں ؛ چنانچہ جدو کو جلال الدین کا نام دیا گیا، فوج کے واپس جانے کے بعد گنیش نے بیٹے کو پھر سے غیر مسلم بنانا چاہا تو جدو نے انکار کردیا اور سلطان جلال الدین کے نام سے تخت بنگالہ پر رونق افروز ہوا۔

شیخ جلال الدین سلہٹی

آپ کا مزار مسلمانان بنگلہ دیش کی بڑی اہم زیارت گاہ ہے، ضلع سہلٹ کے سرکاری گزیٹر میں لکھا ہے گوڑ یا سہلٹ کو مسلمانوں نے 1384 میں فتح کیا، آخری ہندوراجا کو سکندر غازی کی فوجوں سے زیادہ شاہ جلال کی کرامات نے بے بس کردیا، شاہ صاحب کی وفات کے بعد یہ علاقہ صوبہ بنگالہ میں داخل کیا گیا اور نظم ونسق کے لئے ایک علاحدہ صوبہ دار مقرر ہوا، اس ضلع کے تقریباً 53 فیصدی باشندے گزشتہ مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق مسلمان ہیں ، 1303 میں سلہٹ فتح ہوا اور 20 ذی قعدہ 740 کو شاہ جلال نے وفات پائی، قیام سلہٹ کے 37 سال میں کچھ وقت تو شیخ جلال نے ظاہری انتظامات میں گزارا اور باقی عبادت اور ارشاد وہدایت میں، ضلع سہلٹ میں چار ایسے مقامات مشہور ہیں جہاں شیخ جلال نے اپنے ساتھی پیروں کو بسایا اور ان سیارشاد وہدایت کا کام لیا یعنی سلہٹ، لاتو، ہاپنیہ ٹیلہ، ہمنگ ٹیلہ۔

بنگال میں صوفیائے کرام نے اشاعت اسلام میں جو کارہے نمایاں انجام دیئے ان کے متعلق ڈاکٹر کالی راجن قانون گو بنگال میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

''بلبنی سلاطین کے عہد حکومت میں نہ صرف بنگالے میں اسلام کو وسعت نصیب ہوئی بلکہ اس کی بنیادیں بھی گہری ہوگئیں، یہ وہ زمانہ تھا جب اولیائے کرام نے جو برہمنوں اور ہندو سادھوؤں سے عملی پارسائی، قوت عمل اور دور اندیشی میں بڑھ کر تھے، وسیع پیمانے پر تبلیغ شروع کی، جس کی کامیابی کا باعث طاقت نہ تھی؛ بلکہ ان کا مذہبی جوش اوران کی عملی زندگی، وہ نچلے طبقہ کے ان ہندوؤں میں رہتے اوراپنے مذہب کی تبلیغ کرتے جواس وقت بھی توہم پرستی اور معاشرتی دباؤ کے پنجے میں گرفتار تھے، دیہاتی علاقوں کے یہ باشندے مسلمان ہوکر اسلامی حکومت کے لئے ایک نئی تقویت کا ذریعہ ہوگئے، بنگالے کی عسکری اور سیاسی فتح کے سو سال بعد صوفیانہ سلسلوں کی مدد سے جو ملک کے کونے کونے میں پھیل گئے تھے، اس سرزمین میں اخلاقی اور روحانی غلبے کا سلسلہ شروع ہوا، مندروں اور ہندو خانقاہوں کو تباہ و برباد کرکے ابتدائی مسلمان فاتحین نے صرف ان کے زر و جواہر پر قبضہ کیا تھا؛ لیکن تلوار کے زور سے تاریخی روایات ختم نہ ہوسکتی تھی اور نہ ہی ان غیر فانی روحانی خزائن کا خاتمہ ہوسکتا تھا جن پر ہندوقومیت اور ہندو مذہب کی بنیادیں قائم تھیں، مسلمان اولیا نے اخلاقی اور روحانی فتح کے عمل کو مکمل کیا اوراس مقصد کے لئے ہندو دھرم اور بدھ مت کے پرانے استھانوں پر (جو برباد ہوگئے تھے) ایک پالیسی کے مطابق درگاہیں اور خانقاہیں قائم کردیں، اس کے دو نتیجے ہوئے، ایک تو بت پرستی کے ان قدیم استھانوں سے ہندومت کے احیا کا امکان جاتا رہااور دوسرے عوام الناس میں ایسے قصے کہانیاں رائج ہوگئیں جن کے مطابق یہ نو وارد قدیمی مقدس ہستیوں کے جانشیں ہوگئے، ہندوعوام صدیوں سے ان مقامات کومقدس مانتے آئے تھے وہ ان کی پرانی تاریخ کو بھول گئے اور بڑی آسانی سے انھوں نے اپنی ارادات کا سلسلہ ان پیروں اور غازیوں سے وابستہ کردیا جوان مقامات پر قابض ہوگئے، ہندو سوسائٹی بالخصوص نچلے طبقے کے ہندو اولیا اور غازیوں کی کرامات کے ایسے قصوں کی بدولت جو بسا اوقات قدیم ہندو اور بودھی روایتوں پر مبنی تھے، آہستہ آہستہ اسلام کی طرف

مائل ہو گئے ، شاید ہندو تیرتھوں پر اس اثر کی سب سے نمایاں مثالیں دو ہیں ، ایک راجگیر میں سرنگی رشی کنڈ کا مخدوم کنڈ بن جانا اور دوسرے دیو اوتار روایات کے معجزہ باز بدھ کا ایک مقدس مسلمان مخدوم ولی بن جانا۔(۱)

جب کہ ایک انگریزی مورخ اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ بنگال میں اشاعت اسلام کو نمایاں کامیابی ملنے کی وجہ اسلام کا ''درس مساوات'' ہے، جس کی وجہ سے ذات کے چکر میں جکڑے کم تر ذات کے لوگوں نے اسلام میں اپنی ہر قسم کی محرومی کا مداوا دیکھا اور اسے قبول کرلیا۔

ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں :

ان لوگوں کے لئے جن میں مفلس ، ماہی گیر ، شکاری قزاق اور ادنیٰ قوم کے کاشتکار لوگ تھے، اسلام ایک ایسا اوتار تھا جوان کے لئے آسمان سے اترا تھا، وہ حکمراں قوم کا مذہب تھا، اس کے پھیلانے والے باخدا لوگ تھے، جنھوں نے توحید و مساوات کا مژدہ ایسی قوم کو سنایا جس کو سب ذلیل وخوار سمجھتے تھے، اس کی تعلیم نے خدا اور اسلامی اُخوت کا بلند ترتخیل پیدا کردیا اور بنگال کی کثرت سے بڑھنے والی قوموں کو جو صدیوں سے ہندوؤں کے طبقے سے تقریباً خارج ہوکر بڑی ذلت وخواری کے دن کاٹ رہی تھیں، اسلام نے بلا تامل اپنی اُخوت کے دائرے میں شامل کردیا۔(۲)

شیخ کرامت علیؒ جونپوری

کرامت علی جونپوری (1800ء-1873ء) ایک ہندوستانی حنفی فقیہ، عالم دین، عظیم داعی و مصلح اور چالیس سے زائد کتابوں کے مصنف تھے، جونپور میں ولادت ہوئی، مختلف علماء سے علم حاصل کرنے کے بعد سید احمد بریلوی سے بیعت ہوئے ، اوران کے حکم سے جونپور، سلطان پور، اعظم گڑھ، غازی پور، اور فیض آباد میں دعوت وتبلیغ اور اشاعت اسلام کے بعد بنگال وآسام میں اکیاون برس تک دعوت وتبلیغ اور اشاعت اسلام کرتے رہے، دوران سفر بنگلہ دیش کے رنگ پور میں وفات پائی۔

(۱) سر وجادو ناتھ سرکار کا مسلمانوں سے تعصب ڈھکا چھپا نہیں ہے، وہ کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جس سے اسلام یا مسلمانوں پر حملہ کریں، ان کی کتاب زوال سلطنت مغلیہ ان کے تعصب کی بہترین عکاس ہے، اس اقتباس میں بھی انھوں نے غلط باتیں کہی ہیں، بدھوں کو اسلام کے ہندوستان آنے سے پہلے ہندو راجہ تباہ کر چکے تھے اور مسلمان صوفیاء نے کبھی ہندو یا بدھ مت کے مندروں یا خانقاہوں کو اپنی رقامت گاہ نہیں بنایا، نچلے ہندوؤں کا قبول اسلام، اسلام کے مساوات کے متاثر ہوکر اور ہندو مذہب میں ذات پات کی جکڑ بندیوں سے نفرت کی بناء پر تھا۔(تاریخ بنگالہ سر جادو ناتھ سرکار، ص:70-68) (۲) پریچنگ آف اسلام، ص:280۔

سید احمد بریلوی سے بیعت وحصول سلوک واحسان

اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے والد سے اجازت لے کر سید احمد بریلوی کی خدمت میں پہنچے، اور سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی، اول ہی ہفتہ ان کے شیخ نے کہہ دیا کہ اب ہدایت کے کام میں لگ جاؤ، اور خلافت نامہ مع شجرہ بتوسط شاہ اسماعیل دہلوی عطا کیا۔

بنگال اور آسام میں دعوت وتبلیغ کا کام

جونپور، اعظم گڑھ، غازی پور، فیض آباد اور سلطان پور میں تبلیغ واشاعت اور دعوتی واصلاحی کام کرنے کے بعد اپنے مرشد سید احمد بریلوی کے حکم کے مطابق بنگال وآسام کا رخ کیا، کرامت علی جونپوری کو جہاد بالسیف کا بہت شوق تھا، اور اس کے لئے فنون سپہ گری وشمشیر زنی کو محنت سے حاصل کیا تھا، جب ان کے مرشد نے جہاد کا ارادہ کیا تو کرامت علی جونپوری نے بھی جہاد پر آمادگی ظاہر کی اور ساتھ چلنے کو کہا، سید صاحب نے ان سے کہا کہ تم سے خدا کو وراثت نبوی اور تبلیغ دین کا کام لینا منظور ہے، اور تمہارے اندر اس کی استعداد ودیعت فرما دی ہے، تمہارے لئے یہی جہاد اکبر ہے اور تمہاری زبان وقلم میری ہدایت کی توسیع وترجمانی کریں گے۔

دعوتی کام کا آغاز

مولانا نے کلکتہ پہنچ کر کچھ روز قیام کیا، اس کے بعد بنگال وآسام کا دورہ بذریعہ کشتی شروع کر دیا، اس وقت سواری کی سہولتیں زیادہ نہ تھیں، اور بنگال میں ندیاں اور نہریں زیادہ ہونے کی وجہ سے بوٹ سے سفر کیا کرتے تھے، ہر طرح کی پریشانیوں اور مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے پورے اکیاون برس تک بنگال میں دعوت وتبلیغ اور اشاعت کا کام کرتے رہے، ردشرک وبدعت صبح سے شام تک کا مشغلہ تھا، جا بجا مساجد ومدرسے قائم کئے؛ چوں کہ خود بوٹ پر سفر کرتے تھے، اس لئے اپنے ہمراہ سفری مدرسہ قائم کر کے وہاں کے لوگوں کو تعلیم دی، ان کے اخراجات کو برداشت کیا، اور ان کو تعلیم دے کر بنگال وآسام میں دعوت وتبلیغ اور تدریس کے لئے مقرر کر دیا، مولانا نے پورے بنگال اور آسام میں دعوت وتبلیغ کا کام کیا، مگر خصوصیت سے ڈھاکہ، میمن سنگھ، رنگ پور، دیناج پور، فرید پور، بریسا اور آسام میں گوالپاڑہ، کامروپ، دھوبڑی ونوا کھالی میں ان کا کام سب سے زیادہ نمایاں تھا۔

سفری مدرسہ

کرامت علی جونپوری کا سارا وقت اور سارا مال چوں کہ دورہ وسیاحت میں صرف ہوتا تھا، اس لئے ضرورت وقت کی بنا پر اپنے ہمراہ ایک بوٹ پر سفری مدرسہ قائم کیا، جس میں مقامی باشندوں کو تعلیم وتدریس کے ذریعہ

پابند عمل وعقائد بنا کر اور احکام شریعت سے خوب واقف کرا کر اطراف و جوانب میں اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت حق کے لئے بھیجتے، اس سفری مدرسہ کے سارے اخراجات نیز طلبہ کے مصارف خکو راک کے مولانا خود خفیل ہوتے، مدرسہ کے لئے ایک بوٹ مخصوص تھا جس پر ظاہری تعلیم، تزکیہ واخلاص اور ذکر واذکار کا طریقہ اور سلوک کی بھی تعلیم ہوتی تھی، اس سفری مدرسہ سے جو حضرات فارغ ہو کر نکلے وہ خود ایک زبردست داعی ومبلغ ثابت ہوئے اور انھوں نے بنگال کے گوشہ گوشہ میں اسلام کی تبلیغ کی اور لوگوں کی اصلاح کی۔

کرامت علیؒ جونپوری کی دعوتی واصلاحی جدوجہد کے اثرات

کرامت علیؒ جونپوری نے 75 برس کی عمر پائی جس میں تقریباً اکیاون سال بنگال اور آسام اور قرب وجوار میں دعوت وتبلیغ کا کام کرتے ہوئے گزارے، ان کی بعض کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بعض جزائر تک بھی گئے، اس درمیان ایک دو بار جونپور بھی آنا ہوا؛ لیکن زیادہ مدت تک قیام نہ رہ سکا، ان کی دعوتی وتبلیغی کوششوں کی پوری تفصیل کتابوں میں مذکور نہیں ہے، مگر بعض تذکرہ نگاروں اور بعض دوسرے بیانات سے ان کے کام کی وسعت اور تبلیغی مساعی کا اندازا لگایا جاسکتا ہے، صوبۂ بنگال جو مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں بھی مسلم اکثریتی نہ ہوسکا، مسلم سلطنت کے زوال کے بعد اس کے مسلم اکثریتی صوبہ ہونے میں کرامت علی جونپوری اور ان کے خلفاء کی کوششوں کا بڑا دخل ہے، الحاج محمد اجمل خاں اپنی کتاب ''سوانح حیات خواجہ معین الدین چشتی'' میں لکھتے ہیں :

> اور زوال سلطنت اسلامیہ کے باوجود بلکہ اس کے بعد کثرت سے مسلمان ہونا شروع ہوئے کہ مشرقی بنگال پورا پورا مسلمان ہو چکا ہے، یہ کوشش صرف جونپور کے ایک بزرگ کی تھی جنھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں ایک کروڑ سے زیادہ غیر مسلموں کو مسلمان بنادیا، آپ کا نام مولانا کرامت علی صاحب جونپوری تھا۔

سید ابوالحسن علی ندوی نے نواب بہادر یار جنگ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :

> میری معلومات یہ ہیں کہ جن لوگوں کو مولانا کرامت علی صاحب جونپوری کے ذریعہ مشرقی بنگال میں ہدایت نصیب ہوئی یا ان کی اصلاح ہوئی، ان کی تعداد دو کروڑ تک پہنچتی ہے۔

شیخ کرامت کے باب میں تمام معلومات وکی پیڈیا سے ماخوذ ہیں، وکی پیڈیا میں ان کی سیرت سوانح کے ذکر کردہ تمام باتیں حوالہ جات کے ساتھ مذکور ہیں، تفصیل وہاں سے ملاحظہ کی جائے۔

یہ مختلف علاقوں میں اسلام کی پرامن اشاعت کی مختصر جھلکیاں تھیں، تفصیل کے لئے مختلف ملکوں اور قوموں کی

تاریخ کا مطالعہ کیا جائے ،ضرورت اس بات کی ہے کہ آرنلڈ کی اشاعت اسلام کے کام کو آگے بڑھایا جائے اورمختلف علاقوں میں پرامن طور پر اسلام کو اشاعت کی تاریخ مرتب کی جائے ،اس سے ایک جانب جہاں قبول اسلام کی تاریخ مرتب ہوگی ،وہیں اسلام کی اشاعت میں ہمارے بزرگوں نے کن ذرائع اور طریقوں سے کام لیا، وہ معلوم ہوگا اورمزید یہ کہ اسلام کو اس وقت جس طرح دہشت گردی سے جوڑا جارہا ہے،اس کی بھی بالواسطہ طور پر بخوبی تردید ہوجائے گی۔

●●●

عہد نبوی ﷺ میں جہاد کا پس منظر

ڈاکٹر اسلام الدین مجاہد ◆

میحائے انسانیت رحمت اللعالمین محمد مصطفیٰ ﷺ کی مرغ زار عرب میں بعثت ایک ایسے وقت ہوئی، جب کہ انسانیت زندگی کی آخری سانس لے رہی تھی، ایک صحرائے عرب کیا سارا سینۂ گیتی بدامنی اور ابتری کی آخری حدوں کو چھو چکا تھا، خوف ودہشت کا دور دورہ تھا، اعلیٰ انسانی قدروں کا جنازہ اُٹھ چکا تھا، حقوق انسانی کی پاسداری کا کوئی تصور نہیں تھا، ایسے پر آشوب ماحول میں خاتم النبین محمد ﷺ کی ولادت باسعادت دراصل انسانیت پر رب العالمین کا احسان عظیم تھا، اس نعمت کبریٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے :

> لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ (آل عمران: ۱۶۴)
>
> درحقیقت اہل ایمان پر اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان خود ان ہی میں سے ایک ایسا رسول اُٹھایا جو اس کی آیات انھیں سناتا ہے اور ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے، اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے؛ حالاں کہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کا ایک ایک ورق انسانی بقاء وترقی کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، یہی ہستی ہے، جس کے وجود سے دنیا امن وسکون کا گہوارہ بن سکی، آپ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ ہی انسانیت کے عروج کا سب سے اہم ذریعہ بنا، زندگی کے ہر شعبہ میں آپ ﷺ کی ذات بابرکت نے مکمل رہنمائی فرمائی، آپ ﷺ جہاں اخلاق عالیہ کا بہترین نمونہ رہے، وہیں آپ نے میدان جنگ کے لئے جو اُصول وضابطے وضع فرمائے وہ تا قیام قیامت مستقل مینارۂ نور بن گئے، آپ ﷺ نے اعلان فرمادیا کہ: ''انا نبی الرحمة ، انا نبی الملحمة'' (میں رحمت کا نبی ہو، میں معرکوں کا بنی ہوں)۔

◆ اسوسی ایٹ پروفیسر سیاسیات: اُردو آرٹس ایوننگ کالج، حیدرآباد۔

بقول شہرہ آفاق محقق اور مورخ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صدیقی مرحوم :

> آپ ﷺ نے 10 سال کے قلیل عرصہ میں جزیرہ نمائے عرب کے نراج (لاحکومتی) میں جہاں زیادہ تر خودسر خانہ بدوش قبائل میں خانہ جنگیاں ہی رہا کرتی تھیں، ایک خوب مستحکم اور بڑی مملکت قائم کردی، بحیثیت سپہ سالار کے آپ ﷺ کی لڑائیوں میں فریقین کے بمشکل چند سو آدمی مارے گئے؛ لیکن 10 سال کے عرصے میں 12 لاکھ مربع میل کا رقبہ مطیع و ماتحت ہوگیا اور عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسی حکومت قائم ہوئی، جو پورے جزیرہ نما کو حلقہ بگوش بنا سکی۔

یہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھا کہ عرب جیسی گم نام اور جاہل قوم نے بہت مختصر سے عرصہ میں اپنی جہاں بانی اور قیادت کو منوایا۔

منفی پروپیگنڈہ

جب ہم محسن انسانیت ﷺ اور آپ کی انقلابی جماعت کے حالات کا گہرائی سے تجزیہ کرتے ہیں تو ہر پہلو سے یہی شہادت ملتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے لئے سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز جنگ وجدال تھی، آپ ﷺ انسانی قتل وخون کو انتہائی ناگوار تصور کرتے تھے، اور ہر مرحلہ پر احترام آدمیت کو ملحوظ رکھتے تھے؛ لیکن مستشرقین یورپ نے عہد نبوی کے غزوات کی تشریح اس انداز میں کی کہ عام قاری جب انھیں پڑھتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسلام دہشت گردی کا مذہب ہے اور پیغمبر اسلام خود بھی خون خرابے میں مصروف رہے، اسلام کے تصور جہاد کے خلاف اس انداز میں پروپیگنڈا کیا گیا کہ جہاد کرنے والے مذہبی دیوانے ہیں، جو داڑھیاں چڑھائے ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے افراد اور قوموں کے سر چڑھ جاتے ہیں کہ اسلام قبول کرو ورنہ قتل کردیئے جاؤ گے، اس قسم کا الزام اسلام کے تصور جنگ کے تعلق سے ایک بہت بڑی تاریخی غلطی ہے اور حضور اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں پر ایک بہت بڑا ظلم ہے؛ لیکن افسوس کہ موجودہ دور میں میڈیا کی قوت کے بل بوتے پر مغربی مصنفین اور ہمارے ملک کے بعض متعصب غیر مسلم مؤرخین بھی یہ بات دہراتے جارہے ہیں کہ دہشت گردی، تخریب کاری، انتہاء پسندی اور تشدد محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین کی بنیادیں ہیں، الزام بھی لگایا جارہا ہے کہ اسلام میں اور نبی ﷺ کی تعلیمات میں پرامن بقائے باہم کا کوئی بین الاقوامی تصور موجود نہیں ہے؛ لہٰذا مسلمانوں کے تعلقات غیر مسلموں سے خوشگوار نہیں ہوں گے؛ کیوں کہ اسلام کے ماننے والے دوسری قوموں اور مذاہب کو کسی طرح برداشت نہیں کرسکتے، بے سروپا اور بے بنیاد الزامات اس مخصوص گوشے کی جانب سے کئے جارہے ہیں جو دانستہ طور پر اسلام اور رسول اکرم ﷺ سے بغض وعناد رکھتے ہیں، ایک مشہور عراقی مسیحی

مصنف مجید خدوری نے 30 سال پہلے اپنی تصنیف "Peace in the Law of Islam War and" میں اس بات پر زور دیا کہ اسلام میں تعلقات کی بنیاد جنگ ہے، امن وصلح ایک عارضی چیز ہے جو دو جنگوں کے درمیان وقفہ سے عبارت ہے، اس مصنف نے اپنے غلط دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے قرآن وحدیث کے علاوہ فقہ اسلامی سے ایسے اقتباسات جمع کئے ہیں جن سے توڑ مڑوڑ کر یہ مفہوم نکالا جاسکتا ہے کہ واقعی اسلام جنگ کی طرف راغب کرتا ہے اور امن سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اِسی طرح ایک اور اہم تالیف "The New Educational Encyclopedia" کے نام سے اہل علم کے سامنے آئی ہے، اس کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ :

> جب محمد ﷺ کے پیرواؤں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو انھوں نے اپنے عقائد بزور شمشیر منوانے کی ٹھانی اور جنگ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا، بالاخر انھوں نے پورا ملک عرب فتح کر ڈالا۔

منفی پروپیگنڈہ کا اثر

اس قسم کی من مانی تعبیروں اور طرز ادا نے اسلام اور مسلمانوں کو ساری دنیا میں معتوب کر کے رکھ دیا، عہد حاضر میں ہر چھوٹے بڑے دہشت گردی کے واقعہ کو مسلمانوں سے جوڑ کر اسلام دشمن طاقتیں دنیا کو یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ 21 ویں صدی میں بھی مسلمان اپنے چودہ سو سال پرانے دین کو بزور طاقت ودہشت دیگر اقوام پر مسلط کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے لئے دنیا کے امن کو نیست ونابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں، اس سارے پروپیگنڈہ کے پیچھے مبالغہ آمیزی، تعصب اور دانستہ حقائق سے چشم پوشی کا عنصر کارفرما ہے، جس کی وجہ سے معاصر دنیا اسلام اور رسول اکرم ﷺ پر لعن طعن کرنا اپنا شیوہ بنا چکی ہے، وقفہ وقفہ سے آزادی اظہار رائے کے نام پر کھلم کھلا نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کی جارہی ہے، آپ ﷺ کے تصور جہاد کو مسخ کر کے پیش کیا جارہا ہے، رسائل اور جرائد میں آپ ﷺ کی اہانت پر مبنی کارٹونس شائع کئے جارہے ہیں، یہ گستاخی انسانی تاریخ کی سب سے عظیم ہستی کے ساتھ کی جارہی ہے جو بلاشبہ ایک ہمالیائی جرم ہے اور ناقابل معافی ہے، اس سے جہاں نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کو حد درجہ مجروح کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، وہیں پوری امت محمدیہ کے جذبات کو برانگیختہ کیا جارہا ہے، اس معاندانہ عمل کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ دورِ حاضر میں نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات انسانیت کے لئے ضرر رساں بنتی جارہی ہیں؛ حالات کے اس تناظر میں یہ ناگزیر ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے عالم گیر پیام امن وسلامتی کو واشگاف انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ رسول اکرم ﷺ کی دعوت کے پیش نظر ایک عظیم بین الانسانی مشن رکھنے والی جماعت کی تشکیل تھی جو تمام دنیا کی بھلائی کے لئے صبر وایثار کی منزلوں کو طے

کرتے ہوئے آگے بڑھی، اس کا سرمایہ حیات حق کی گواہی تھا، حق کے غلبہ کے لئے اس مقدس جماعت کے افراد جاہلیت کے علمبرداروں سے اس وقت ٹکرائے جب وہ حق کی راہ میں سدراہ بنے اور انھوں نے اس دعوت حق کو ختم کرنے کی سازشیں رچیں، حضور اکرم ﷺ کو تبلیغ اسلام کی راہ کے موانع کو دور کرنے اور دشمنوں کے جارحانہ عزائم کو ناکام بنانے کے لئے جنگ کے مرحلے طے کرنے پڑے؛ لیکن ایسے موقع پر بھی آپ ﷺ نے انسانی قدروں کا لحاظ ہر موڑ پر ملحوظ خاطر رکھا، جنگی میدان میں آپ ﷺ کی ماہرانہ قیادت، آپ ﷺ کی دعوت کی کامیابی کی ضامن بنی، جس بصیرت و دانائی سے آپ ﷺ نے کفار ومشرکین اور مخالفین اسلام کے فتنوں کے دروازے بند کئے وہ آپ اپنی مثال ہے۔

جہاد کا مقصد

عہد نبوی ﷺ میں جہاد کے پس منظر کو دیکھنے سے یہ پہلو بہت ہی نمایاں ہو کر اُبھرتا ہے کہ دشمن فوجوں کی کثرت، سامان حرب وضرب کی افراط اور ادھر قلیل فوج اور مختصر سامان حرب کے باوجود نبی اکرم ﷺ کو بالآخر فتح حاصل ہوئی اور دشمنان اسلام کو مکمل شکست سے دو چار ہونا پڑا، آپ ﷺ کے غزوات کا یہ پہلو بھی اہم ہے کہ جو لوگ مقابلہ پر آئے، ان کو امن و راحت کی دولت ملی، وہ برباد و تباہ نہیں کر دیئے گئے اور پھر مفتوح قوم فاتحین کی دوست اور شکر گزار بن گئی، جب کہ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جس قدر بھی جنگیں ہوئیں، اس کا نتیجہ مفتوح کی تباہی و ہلاکت ہوئی اور فاتح قوم سے نفرت اور دشمنی بڑھنے لگی، عہد نبوی ﷺ میں جہاد کی غرض وغایت، دین کی اشاعت وحمایت، حق کی نصرت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامت عدل، رد ظلم اور احکام الٰہی کی تعمیل تھی، جو بدطینت طاقتیں اسلام کے خلاف سر اُٹھا رہی تھیں، ان کی سرکوبی بھی اعلائے کلمۃ اللہ کے فریضہ میں داخل تھی؛ اسی لئے ان تمام لڑائیوں کا نام ''جہاد'' ہوا، جو دین حق کی حمایت میں دشمنوں سے ہوئیں، ان جنگوں کا واحد مقصد مخلوق خدا کو طاغوتی طاقتوں کے پنجوں سے آزاد کر کے اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر عدل و انصاف کو قائم کرنا تھا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ :

> انّ من اعظم الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر ۔(1)
>
> سب سے بڑا جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے میں کلمہ عدل کا کہنا ہے۔

ارشاد رسول کی اس روشنی میں اگر عہد نبوی کے غزوات کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی ساری جنگی مہمات ظلم اور جبر کے خاتمے اور حق کی سربلندی کے لئے تھیں، تاریخ اسلام ایسے ہزاروں واقعات سے

(1) ترمذی، باب ماجاء افضل الجہاد، حدیث نمبر: ۲۱۷۴۔

پُر ہے کہ آپ ﷺ نے جنگوں کے دوران بھی دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کیا، آپ ﷺ کا طرزِ عمل جنگ کے بعد بھی ایسا ہوتا کہ دشمن کا خون بہانے کے بجائے ان کے سامنے انسانی اخلاق اور شرافت کا نمونہ پیش کیا جاتا کہ دشمن اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہوجاتے، آپ کی پوری حیات طیبہ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو کہ آپ ﷺ نے اپنے طور پر جنگ کی پہل کی ہو، یا معاشرہ میں امن وسلامتی کو ختم کرنے کے اقدامات کئے ہوں، آپ ﷺ نے دشمن کو مغلوب سمجھ کر اس کی جان و مال پر حملہ کر کے یا عزت وآبرو کو لوٹ کر اس کو ذلیل وخوار نہیں کیا؛ بلکہ اس پر اپنے اخلاق سے فتح حاصل کی اور ان کے قلوب کو مسخر کیا، اگر جہاد محض زر وزمین یا جاہ وحشمت کے حصول کے لئے ہوتا تو نبی اکرم ﷺ مفتوح اقوام کے اموال واملاک وضبط کر لیتے اور ان کی جانب سے دی جانے والی ایذا رسانیوں کا پورا پورا انتقام لیتے؛ لیکن آپ ﷺ نے ظالموں کو معاف کر دیا اور کسی سے کوئی بدلہ نہیں لیا اور ان کی جان ومال کے تحفظ کا بھی اعلان کر دیا، فتح مکہ کے موقع پر — جو ایک عظیم الشان فتح تھی — آپ ﷺ کی زبان مبارک سے دشمنوں کے تعلق سے جو الفاظ نکلے، وہ یہ تھے :

لا تثریب علیکم الیوم ، اذھبو فأنتم الطلقاء۔
تم سے آج کوئی باز پرس نہیں ہوگی، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

یہ تاریخی جملے ان لوگوں کے لئے کہے جا رہے تھے؛ جنھوں نے پیغمبر اسلام کو ہر طریقہ سے ستایا تھا اور ان کی جان کے درپے ہوئے تھے، آپ ﷺ چاہتے تو ایک ایک دشمن اسلام سے انتقام لیتے؛ لیکن ان کے ساتھ عفو ودرگزر کا معاملہ کر کے آپ نے دنیا کے حکمرانوں کو بتا دیا کہ قوت واقتدار کے ہوتے ہوئے حق کے علمبردار کا کردار کیسا ہوتا ہے، ان معافی پانے والوں میں حضرت حمزہؓ کا قاتل وحشی اور ہندہ بھی تھی، اور بھی کئی ایسے دشمنان اسلام تھے جن سے فتح مکہ کے موقع پر بدلہ لیا جا سکتا تھا؛ لیکن سوائے تین یا چار افراد کے سب معاف کر دیئے گئے، فتح مکہ کے موقع پر ہی عام خیال یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو ان کے مکانات کا قبضہ واپس دلایا جائے گا جن پر مشرکین مکہ نے قبضہ کر لیا تھا؛ لیکن رسول اکرم ﷺ نے یہ مکانات بھی اہل مکہ سے واپس نہیں لئے، اُم المومنین حضرت زینبؓ کے بھائی نے سب کے سامنے اپنے مکان کا مطالبہ کیا، حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: تم اپنے مکان کا دعویٰ چھوڑ دو، میں جنت میں ایک محل کا وعدہ کرتا ہوں، یہ سن کر حضرت زینبؓ کے بھائی نے فوراً اپنے دعویٰ سے دستبرداری اختیار کر لی، ایسے فیاضانہ سلوک کی مشرکین مکہ کو بھی توقع نہیں تھی۔

مخالفین کے لئے آپ ﷺ کی پالیسی

رسول اکرم ﷺ نے جتنی جنگیں لڑیں، ان میں جنگ کی حکمت عملی یہ رہی کہ آپ ﷺ نے دشمن کو ہلاک

کرنے کے بجائے اس کو اسلام کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ کرنا پسند فرمایا، ایک مستقل ریاست کے قیام وبقاء کے لئے جس میں ہر لمحہ مسلمان خطرات سے گھرے ہوئے تھے، دشمنان اسلام نے جنگ کو لازمی عنصر بنا دیا تھا، ان جنگوں میں قریش مکہ کی کارستانیاں اور دشمنان اسلام کی جارحیت کو ایک طرف رکھ کر حضور اکرم ﷺ کے برتاؤ کا موازنہ کیا جائے تو پتہ چل جائے گا کہ اسلام دشمن طاقتیں اپنی جارحانہ کاروائیوں کے ذریعہ اپنی چودھراہٹ کو مسلط کرنا چاہتی تھیں، جب کہ نبی اکرم ﷺ کا مقصد امن کا قیام تھا؛ چنانچہ جہاں جہاں اسلام کو کامیابی حاصل ہوئی، وہاں وحشت اور بربریت کی جگہ انسانی مجد وشرف نے لے لی، زندگی سرتاسر رحمت بن گئی اور وہ قوم جو ہر قسم کے ظلم اور عدوان میں مبتلا تھی، وہ دنیا کی ہادی ورہبر بن گئی۔

حرب وضرب میں اُسوہ

خاتم النبیین ﷺ کی عسکری اور حربی زندگی میں بہت سارے راز پنہاں ہیں، ایک جنگی مدبر، ایک کامیاب سپہ سالار اور بہترین فاتح کی حیثیت سے آپ ﷺ نے جو یادگار نقوش چھوڑے ہیں وہ ہر دور کی جنگی مہمات کے لئے مشعل ہدایت ہیں، ہماری سیرت کی محفلوں، سمیناروں، جلسوں اور کانفرنسوں میں جہاں حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے دیگر پہلوؤں پر تفصیلی بیانات ہوتے ہیں، وہیں نادانستہ طور پر سہی، حضور ﷺ کی سیرت کے اُن پہلوؤں کو بہت کم بیان کیا جاتا ہے جن کا تعلق شمشیر وسنان سے ہے؛ اسی لئے آج ہماری نوجوان نسل سکندر اعظم، نپولین، چنگیز خان اور ہلاکو کے فوجی کارناموں سے واقف ہے؛ لیکن اُمتِ مسلمہ کے نوجوانوں کو یہ نہیں معلوم کہ حضور اکرم ﷺ نے غلبہ اسلام کے لئے اور دنیا میں امن کے قیام کے لئے اور انسانیت کی بھلائی کے لئے کیا جنگی حکمت عملی اختیار کی تھی اور وہ کیا تدابیر تھیں جس کے نتیجہ میں اس وقت کی دو Super power طاقتیں قیصر اور کسریٰ اسلام کے زیر اثر آ گئیں، حضور اکرم ﷺ کی سیرت لکھنے والے آپ ﷺ کے جنگی کارناموں اور حربی معرکوں کو بہت اختصار سے بیان کرتے ہیں، سیرت نگار شائد رسول اکرم ﷺ کو —— جو خاص طور پر رحمت اللعالمین بنا کر بھیجے گئے اور فاتح قلوب تھے —— فاتح جنگ بنا کر پیش کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں؛ لیکن حضور ﷺ اپنی حربی زندگی میں بھی رحمت اللعالمین رہے اور آپ ﷺ نے دلوں کو میدان جنگ میں بھی فتح کرنا نہیں چھوڑا، بعض مورخین حضور ﷺ کی فتوحات کو اس طرح پیش کرتے ہیں گویا وہ معجزات کا نتیجہ تھیں، اگر ہم رسول ﷺ کی جنگی کامیابیوں اور حربی کارناموں کو صرف معجزات کا نتیجہ مان لیں تو ایک کامیاب جرنیل اور فاتح کی حیثیت سے آپ ﷺ کی قدر ومنزلت کم کر دیتے ہیں اور پھر وہ اُسوۂ حسنہ جن کو اپنانے اور جس پر عمل کرنے کے لئے ہمیں ہدایت دی گئی، وہ معجزات پر کیسے مبنی ہو سکتا ہے، اِسی خیال کو رد کرتے ہوئے دکن کے ممتاز محقق ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم رقم طراز ہیں :

If he had achieved his successes by Miracles only, his life could not be an"Uswa-e-Hasana", a practicle example to follow by the common man" (Ref: The Battlefields of Prophet Mohammed") by Dr. Mohd. Hameedullah.

جنگ — آخری راستہ

اگر مان لیں کہ آپ ﷺ کو جو کامیابیاں حاصل ہوئیں وہ معجزات اور کرشموں کا نتیجہ تھیں تو آپ ﷺ کی سیرت ایک عام آدمی کے لئے عملی طور پر اُسوہ اور نمونہ نہیں رہ جاتا ہے، نبی ﷺ دنیا میں سب سے بڑا انقلاب برپا کرنے آئے تھے، جس نے انسانی سوچ کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا، یہ انقلاب ذہنی، علمی، معاشی، سماجی وسیاسی نوعیت کا تھا، اس ہمہ گیر انقلاب کو برپا کرنے میں حائل قوتوں کے خاتمہ کے لئے جنگی تیاری ناگزیر تھی، اسلامی مملکت کے قیام اور اس کے انتظام کے سلسلہ میں کفار ومشرکین کی جانب سے جوڑ کاوٹیں کھڑی کی جارہی تھیں، اس کے قلع قمع کے لئے جنگ ایک لازمی حیثیت رکھتی تھی، ہجرت کے بعد کے واقعات اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ قریش مکہ نے نہ صرف مسلمانوں سے جنگ کی ٹھانی؛ بلکہ کھلم کھلا اعلان جنگ بھی کر دیا، اب حضور اکرم ﷺ نے ضروری سمجھا کہ قریش مکہ پر یہ بات واضح کردی جائے کہ مدینہ ایک آزاد اسلامی ریاست ہے اور اس کے تحفظ کی ذمہ داری مسلمانوں کے لئے لازمی ہے، اِسی لئے آپ ﷺ نے مشرکین مکہ کو دندان شکن جواب دینے کے لئے صحابہ کرامؓ میں جذبہ جہاد کے تصور کو پروان چڑھایا، آپ ﷺ نے جنگ کا ماحول گرم نہیں کیا؛ بلکہ بسا اوقات امن اور مفاہمت کو ترجیح دی؛ لیکن جب اسلام دشمن طاقتوں نے امن کے معاہدوں کو توڑا اور عہد شکنی کی اور جنگ مسلط کر دی گئی ایسے ناگہانی حالات میں آپ ﷺ نے جنگی مرحلے طے کئے، آپ ﷺ جنگ نہ کرتے تو اسلام کی روشنی ماند پڑ جاتی اور انسانیت پھر ایک مرتبہ نعمت ایمان اور ہدایت کے سرچشموں سے محروم ہو جاتی، مدینہ کی نئی مملکت کا دفاع آپ ﷺ کا وہ زبردست کارنامہ ہے جو سارے اسلامی جہاد کے پس منظر کو واضح کر دیتا ہے، ایک طرف پورا عرب اپنی تمام تر طاقت کے ساتھ صف آرا تھا اور دوسری طرف حضور ﷺ کے شیدائی چند مجاہد تھے؛ لیکن اس بے سروسامانی کے عالم میں آپ ﷺ کی فراست، دور اندیشی، معاملہ فہمی، صبر واستقلال، خلق عظیم اور اللہ پر کامل بھروسے کے ساتھ ساری جنگی تدابیر کا استعمال معرکہ بدر میں دنیا نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا، جس میں 313 مجاہدین اسلام 1000 کے لشکر جرار پر فتح پائے، یہ فتح ونصرت کا مژدہ ہجرت کے دوسرے سال ہی اہل ایمان کو سنایا گیا، اگر اہل اسلام کو جنگ بدر میں بغیر کسی تیاری کے حریف طاقتوں کے مقابل کھڑا کر دیا جاتا تو نظام حق کے کسی

برگ وبار لائے بغیر ختم ہوجانے کے امکانات تھے، مدینہ ہجرت کے بعد محسن انسانیت کی نبض شناس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ لازماً جہاد کے ذریعہ ہی دشمنوں کی طاقت کو تہس نہس کیا جاسکتا ہے اور اس کے بغیر اسلام کے نظام حق کو نافذ کرنا ممکن نہیں ہے، ایک نوخیز ریاست اور نوتشکیل شدہ معاشرہ کی بقاء اور نشونما کے لئے محض دعوت وتبلیغ کی حکمت عملی کافی نہیں تھی؛ بلکہ قافلہ اسلامی کے نقیبوں کو تلواروں کی چھاؤں سے بھی گزارنا لازمی تھا، مقابلہ میں فتح یاب ہوئے، قریش سچائی کی دعوت کی مخالفت کے سارے مرحلے طے کر چکے تھے، انھیں زیر کرنے کے لئے حضور اکرم ﷺ کو چاروناچار میدان جنگ میں اُترنا پڑا؛ لیکن آپ ﷺ نے کوئی جنگجو یانہ پالیسی اختیار نہیں کی۔

جنگ سے متعلق ہدایات

آپ ﷺ نے جنگ سے متعلق جو ہدایات اہل اسلام کو دیں ان میں چند اہم یہ تھیں :

(۱) دشمن سے مقابلہ کی تمنامت کرو؛ بلکہ اللہ سے امن وعافیت کی دُعا کرتے رہو، مگر جب دشمن سے مقابلہ ناگزیر ہوجائے تو پھر جم کر لڑو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔

(۲) نہ کسی بوڑھے ضعیف کو قتل کرو، نہ چھوٹے بچوں اور عورتوں پر ہاتھ اُٹھاؤ۔

(۳) اموالِ غنیمت میں چوری نہ کرو، جنگ میں جو کچھ ہاتھ آئے سب ایک جگہ جمع کرو۔

(۴) نیکی واحسان کرو؛ کیوں کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔

(۵) معابد کے بے ضرر خادموں اور ان کے نگران کاروں کو قتل نہ کرو۔

(۶) آگ کا عذاب دینا سوائے آگ کے پیدا کرنے والے کے کسی اور کو سزاوار نہیں ہے؛ اس لئے کسی دشمن کو آگ میں نہ ڈالو۔

(۷) کسی لاش کا مثلہ نہ بناؤ اور نہ لاشوں کی بے حرمتی کرو۔

(۸) کسی مجروح پر حملہ نہ کرو، کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کرو اور کسی قیدی کو بے وجہ قتل نہ کرو۔

(۹) اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے، اُسے امان دے دو۔

ان نکات کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آپ ﷺ زمین کے ٹکڑوں کے بجائے اقلیم دل کو فتح کرنا چاہتے تھے، آپ ﷺ تلوار کے زور سے جسموں کو مطیع بنانے کے بجائے دلیل سے دماغوں کو اور اخلاق سے دلوں مسخر کرنا چاہتے تھے، مدینہ کی دس سالہ جنگی کاروائیوں کی تفصیل دیکھی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس میں کم سے کم جانی نقصان ہوا، قاضی سلیمان منصور پوری نے اپنی تصنیف ''رحمت اللعالمین ﷺ'' کی جلد دوم صفحہ 265 پر تحریر کیا کہ :

مسلم شہدا اور دشمن مقتولین کی کل تعداد جو تکمیل انقلاب کے لئے کام آئی ،
وہ علی الترتیب 255 اور 759 ہے۔

ان اعداد وشمار کو سامنے رکھ کر معترضین حضور ﷺ کے نظریہ جہاد کو حقیقت کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں، اگر حضور اکرم ﷺ محض فاتحانہ عزائم کے ساتھ اُٹھتے تو دیگر بڑے بڑے جنگجوؤں کی طرح خوں ریزیاں کرتے ہوئے کرۂ ارض کو لالہ زار کر دیتے اور ریگستان عرب کے ذرہ ذرہ کو انسانی خون سے نہلا دیتے ، نبی ﷺ کی جنگی پالیسی کا بنیادی اُصول یہ تھا کہ مخالف عنصر کا خون بہانے کے بجائے اُسے بے بس کر دیا جائے ، یہاں تک کہ یا تو وہ تعاون کرے یا مزاحمت چھوڑ دے ، ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے اپنی مشہور تصنیف ''عہد نبوی ﷺ کے میدان ہائے جنگ'' میں لکھا کہ اصل میں آنحضرت نے دشمن کو نیست و نابود کرنے کی جگہ مجبور کرنا پسند فرمایا ، اپنی ایک دوسری تصنیف ''عہدی نبوی ﷺ میں نظام حکمرانی'' میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے تحریر فرمایا کہ :

آنحضرت ﷺ کی سیاست قریش کو تباہ و برباد کرنے کی نہیں تھیں ؛ بلکہ بالکل محفوظ رکھ کر بے بس اور مغلوب کر دینے کی تھی ۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کو انسانوں کا بے بلا وجہ خون بہانا ہرگز پسند نہیں تھا ؛ بلکہ آپ ﷺ کے سینے میں انسانیت کے لئے ہمدردانہ جذبہ اصلاح کارفرما تھا ، آپ ﷺ کے اندر کسی فاتح کے بجائے جو جذبہ غیض وغضب کا مظہر ہوتا ہے ، ایک معلم کی سی ہمدردی اور خیر خواہی پائی جاتی تھی ، اس پر بیسوں واقعات بطور ثبوت پیش کئے جاسکتے ہیں ، مکی دور سے لے کر فتح مکہ تک انسانیت کا معمار اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی صلہ رحمی سے پیش آتا ہے ، بدر کے معرکہ میں عظیم الشان کامیابی کے بعد زبان رسالت سے ان الفاظ کا نکلنا کہ بنو ہاشم کو قتل نہ کرنا ؛ کیوں کہ وہ اپنی مرضی سے لڑنے نہیں آئے چار ونا چار ان کو یہاں لایا گیا ، کیا کسی جنگجو سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ قیدیوں کے تعلق سے پریشان ہو جائے ؛ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ بدر کے قیدیوں کی بے چینی سے متاثر ہو کر مدینہ کا فتح مند حاکم سکون سے سو نہ سکا اور رات کی تاریکی میں جا کر ان کی بندشیں ڈھیلی کرائیں اور کیا کسی فاتح سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ تشدد کی گرم بھٹی میں اذیت پر اذیت برداشت کرنے کے بعد فتح و کامرانی کے موقع پر دشمن سے انتقام نہ لے اور ان کے وحشیانہ مظالم کے زخموں کی بھاری تاریخ کو طاق عفو پر ڈال کر معافی عام کا اعلان کر دے ، یہ چند نمایاں اشارے بطور نمونے کے پیش کئے گئے ہیں ، تاریخ اسلام میں ایسے شواہد کی کمی نہیں ، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا نظریہ جہاد انسانیت کی بقاء و ترقی کے لئے تھا نہ کہ قتل وخون کا بازار گرم کر کے انسانیت کو ذلیل وخوار کرنا تھا ، معروف اسلامی اسکالر اور مورخ مولانا نعیم صدیقی اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''محسن انسانیت'' میں لکھتے ہیں :

کسی انقلابی نظریہ پر بغیر ایک قطرہ خون بہائے نظام ریاست کو یوں استوار کر دینے

کی مثال شائد پوری تاریخ میں نہ مل سکے گی، صحیح معنی میں غیر خونی (Bloodless) انقلاب ہمیں یہی ایک ملتا ہے، جس کی بنیادوں پر انسانی خون کا ایک قطرہ نہ گرا اور جس کے نیو کے پتھروں میں کسی ایک فرزند آدم کا لاشہ شامل نہیں ہے، یہ محیر العقول واقعہ خود مزاج نبوت کی مخصوص شان کا ترجمان ہے۔(۱)

سریہ اور غزوہ کا مفہوم

عہد نبوی ﷺ میں جہاد کے پس منظر میں دو خاص اصطلاحات سیرت النبی ﷺ اور تاریخ اسلام میں ملتی ہیں، ایک غزوات اور دوسرے سرایا، ان دونوں کا اپنا اپنا الگ اور متعین مفہوم ہے، سریہ کا مقصد دشمنوں کی نقل وحرکت کی غرض وغایت کا پتہ چلانا ہوتا؛ تاکہ دشمن مسلمانوں کو بے خبر پاکر اچانک حملہ نہ کر بیٹھے، اس کا ایک مقصد دعوت اسلام بھی تھا اور دوسرا مجرموں کی سرزنش بھی تھی، مختلف ضرورتوں کے تحت آنحضرت ﷺ نے جب بھی کوئی جماعت چاہے وہ دو ہی آدمیوں پر مشتمل کیوں نہ ہو، کہیں روانہ فرمائی تو اس کو رائج اصطلاح میں ''سریہ'' کہا گیا اور جس میں حضور اکرم ﷺ بہ نفس نفیس شریک ہوئے، اس کو''غزوہ'' کہا گیا، علاوہ ازیں اگر کچھ مسلم افراد کو اتفاقیہ کسی تصادم یا سرحدی چھڑپ سے دو چار ہونا پڑا تو ایسے واقعات کو بھی سریہ کے زیر عنوان درج کیا گیا، نبی اکرم ﷺ نے مدینہ کی 10 سالہ زندگی میں کم وبیش 88 مہمات بھیجی تھیں جن میں کچھ ایسی تھیں جن کی قیادت کسی صحابی کے سپرد تھیں جو سرایا کہلاتی ہیں اور بعض کی قیادت خود حضور سرور عالم ﷺ نے کی تھی جو غزوات کے نام سے مشہور ہوئیں ان کی تعداد 27 ہے، ان میں 9 غزوات ایسے ہیں جن میں حضور ﷺ نے دشمنوں سے جنگ کی تھی، باقی 18 میں شمشیر کا استعمال ہی نہیں ہوا تھا، اس حقیقت کے باوجود نبی اکرم ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب کو شمشیر سے جوڑ دینا ایک کھلی بددیانتی ہے، بدر، اُحد، احزاب، موتہ، خیبر، فتح مکہ، حنین اور تبوک یہ ساری رسول اکرم ﷺ کی قیادت میں برپا ہوئے معرکے ہیں، جس میں ایک صالح نظام کو برپا کرنے کے لئے اور باطل طاقتوں کی سرکوبی کے لئے رسول اکرم ﷺ کو میدان جنگ میں آنا پڑا، یہ ساری جنگیں قریش اور دشمنان اسلام نے اہل ایمان پر مسلط کی تھیں، ان کی جارحانہ کاروائیوں کا تدارک اسلامی قافلہ کے لئے ضروری تھا، فتح کا سلسلہ جو بدر کے میدان سے شروع ہوا، خلافت راشدہ کے دور میں بھی جاری رہا یہاں تک کہ اسلامی اقتدار ایشاء، یورپ اور افریقہ کے براعظموں پر چھا گیا؛ لیکن اس میں عسکری طاقت سے زیادہ اخلاقی اُصول کارفرما تھے اور اسلامی فوج نے دشمن کو ذہنی شکست دے کر ان کو اسلام سے وابستہ کر دیا۔

---

(۱) محسن انسانیت:۴۰۲۔

عہد نبوی ﷺ میں جہاد کے پس منظر کا اجمالاً جائزہ لینے سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ انسانیت کی عظیم ترین ہستی نے حق وصداقت کے پیغام کو پورے عرب میں اور پھر اقطاعِ عالم میں پھیلانے کے لئے جہاد کا راستہ اپنایا اور انتہائی جنگجویانہ ذہنیت رکھنے والے حریفوں کی مزاحمت کو پاش پاش کر کے نظام عدل وقسط کو نہ صرف برپا کیا؛ بلکہ اس کی تکمیل فرمادی، اس تاریخ ساز ہستی نے تصادم وٹکراؤ سے گریز کرتے ہوئے انسانی خون کے کم سے کم نقصان کے ساتھ اسلامی انقلاب کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا، یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر کوئی طاقت محض جاہ ومال یا اقتدار کے لئے میدان جنگ میں آتی ہے تو اُسے کبھی دوامی کامیابی نہیں مل سکتی، نبی ﷺ نے حق اور سچائی کو فروغ دینے کے لئے بزور شمشیر اسلامی دعوت کو پھیلانے کے بجائے دلیل اور اخلاق سے دنیا کو متاثر کیا اور انتقام کے بجائے معاہدہ لکھنے والے قلم سے مسائل حل کرنے کو ترجیح دی، انقلاب دشمن حریفوں نے سخت مجبور کر کے آپ ﷺ کو میدان جنگ میں اس قدر الجھا دیا کہ 8، 9 برس میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا کہ آپ کو اطمینان اور سکون حاصل ہوا ہو؛ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس شدید اور سنگین دور میں بھی آپ ﷺ نے وہ تعمیری کام انجام دیئے، جس نے تاریخ کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا اور انسانیت کو ایک نئے نقشہ پر ڈھال دیا، آپ ﷺ نے ایک طرف ظلم وفساد کی ہر طاقت کو ختم کر دیا اور دوسری طرف معاشرہ کو امن ومساوات کی بنیادوں پر استوار کیا، متعصب مورخین عموماً یہ طعنہ دیتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا، یہ الزام کئی دلائل کی بنیاد پر بے بنیاد ہے، جس کی طرف اس مقالہ میں اشارے بھی کر دیئے گئے، خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو وحی کے ذریعہ یہ پیغام دیا کہ: ''لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ''، یعنی دین میں کوئی جبر نہیں ہے، خالق کائنات کی اس ہدایت کی روشنی میں حضور اکرم ﷺ نے اپنی جنگی مہمات طے کی ہیں، جس میں کہیں بھی انسانیت کے ساتھ بدسلوکی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

غزوات خاتم الرسل ﷺ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ملتِ اسلامیہ عصر حاضر میں اپنی اور اپنے دین کی نگہبانی کے فرائض انجام دیتی ہے تو دنیا میں کامیابی اور آخرت میں سرخروئی اس کا مقدر بن سکتی ہے، دور خیر البشر ایسا دور ہے جس میں اہل اسلام کے مادی وسائل نہایت محدود تھے اور افرادی قوت بھی کوئی زیادہ نہیں تھی، ایسے حالات میں جب اس دور کی طاقتور قوتوں نے اسلام کے خلاف طبل جنگ بجا دیا تو مدینہ کی نوزائیدہ مملکت کے رہنما نے کس دانشمندی اور بصیرت کے ساتھ ان مخالف قوتوں پر قابو پانے کے لئے جنگی تدابیر اختیار کی، اس کو جاننا اور اس پر عمل پیرا ہونا اُمتِ مسلمہ کی بقاء اور اس کی دفاع کے لئے لازمی ہے۔

آج چودہ سو سال بعد بھی ملتِ اسلامیہ تاریخ کے انتہائی نازک اور دشوار ترین دور سے گزر رہی ہے، ہر چہار سو اسلام پر یلغار جاری ہے، دنیا کا کوئی خطہ اہل اسلام کے لئے محفوظ نہیں ہے، ظلم تشدد اور خون آشامی کے مظاہرے ہر طرف دیکھے جا رہے ہیں، مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا ایک لامتناہی سلسلہ عالمی سطح سے لے کر ملکی سطح

تک جاری ہے، جمہوریت نواز ممالک سے لے کر آمر حکمراں بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی میں لگے ہوئے ہیں، مقام فکر ہے کہ ہر طرف اسلام اور مسلمانوں کے لئے زمین کیوں تنگ کر دی گئی ہے؟ علم وفن کے اس دور میں یورپ کی مہذب اور متمدن قوموں کے لئے اُمتِ مسلمہ نرم چارہ کیوں بن گئی؟ فلسطین، افغانستان اور عراق سے لے کر شام تک کی صورتحال اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ اسلام دشمن طاقتوں نے اسلام اور مسلمانوں کو نگل جانے کی ساری تیاری کر لی ہیں، ایسے سینکڑوں واقعات کو دیکھنے کے بعد بھی اُمتِ مسلمہ اپنے لئے کامیابی اور کامرانی کی راہیں تلاش کرنے میں ناکام کیوں ہے؟ آج اُمت فخر رسل محمد ﷺ کے اس اُسوۂ حسنہ کو جو عزیمت کا پہلو اپنے اندر رکھتا ہے، اگر اپنے لئے حرزِ جاں بنالے تو حالات تبدیل ہو سکتے ہیں، اُمت مرحومہ اگر اب بھی شکست وریخت اور ذلت ونکبت کے اس دور میں مایوسی اور محرومی کو گلے لگانے کے بجائے عہد نبوی ﷺ کے غزوات کو اپنے لئے مشعل راہ بنائے تو ناکامیوں کو کامیابیوں میں بدلا جا سکتا ہے، محسن انسانیت ﷺ نے ظلم کی تلواروں کے سامنے مٹھی بھر نفوس قدسیہ کو سینہ سپر کر کے ثابت کر دیا کہ حق کے غلبہ کے لئے اکثریت اور اقلیت کوئی معنی نہیں رکھتی، وسائل کی کمی یا فراہمی کسی گروہ کو کامیابی یا ناکامیابی سے دوچار نہیں کرتی؛ بلکہ نظریہ حق جہاں ہوگا، وہاں کامیابی اور سربلندی ہوگی، نبی ﷺ نے حق کے غلبہ کے لئے شجاعت اور دوراندیشی کا ثبوت دیا اور ہر دور کے حریف کے چیلنج کو قبول کر کے پوری استقامت کے ساتھ اپنے فرض منصبی کو ادا کیا، آپ ﷺ کا یہی اُسوۂ حسنہ اُمتِ مسلمہ کی کامیابی کے لئے مہمیز کا کام دیتا ہے، آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ دشمنوں کی جانب سے آپ ﷺ کی دعوت کی بھرپور مخالفت کی جائے گی آپ ﷺ کو شدید کشمکش اور سخت ترین حالات سے دوچار ہونا پڑے گا؛ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کو اپنا فرض نبھانا ہے، جنگی مہمات دراصل اُسی فرض کی ادائیگی کے لئے بپا کی گئی، مزاحمتوں اور نت نئے طوفانوں کے باوجود ایک قلیل مدت میں اولادِ آدم اسلام کے نظامِ حق کے سائے میں ان مہمات کے ذریعہ آ گئی، یہ عظیم کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک کہ اہل حق انسانی فلاح کے نفاذ کے لئے جنگی معرکے طے نہ کرتے، عرب جیسے صحرا کو زندگی کے ایک مدرسۂ فلاح میں بدل دینا اور تمام بکھرے ہوئے اور سرپھرے انسانوں کو ایک مرکز توحید پر جمع کر دینا انسانی تاریخ کا نادر واقعہ ہے، جو صرف نبی کریم ﷺ نے انجام دیا، اس کے لئے آپ کو حریفوں کی شمشیر جنگ پسند کا مقابلہ بھی مجبوراً کرنا پڑا، موجودہ دور بھی مسلمانوں کے لئے آزمائش کا دور ہے؛ لیکن حالات سے مایوسی ایمان کا تقاضہ نہیں ہے، حالات کو بدلنا اُمتِ مسلمہ کے ہاتھوں میں ہے؛ لیکن اس کے لئے شرط ہے کہ نبی کریم ﷺ کے جہاد کے تصور کو اس کے حقیقی معنی میں سمجھا جائے، تب ہی راستہ کی ہر رکاوٹ ایک سنگ میل بن سکتی ہے، اور راستہ کا ہر کانٹا دور کیا جا سکتا ہے اس بات کو دنیا کے سامنے بار بار پیش

کرنے کی ضرورت ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا جہاد کسی مادی مقصد کے لئے نہیں تھا؛ بلکہ یہ محض امن وامان کے قیام اور عدل وانصاف کے نفاذ کے لئے تھا، ظلم وجبر، دہشت وبربریت، ناانصافی وتعصب، عدم رواداری اور جانبداری، حق تلفی اور استحصال جیسی لعنتوں کے خاتمہ کے لئے عہد نبوی ﷺ کے غزوات سے یقیناً انسانیت درس بصیرت حاصل کرسکتی ہے، اوراسی میں انسانیت کی فوز وفلاح ہے :

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

• • •

جہاد میں رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ

مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی ◆

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو ہمارے لئے بہترین مثال اور نمونہ (Ideal) قرار دیا ہے، ارشاد باری ہے: ''لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ'' (الأحزاب:۲۱) ''اللہ کے رسول میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے'' آنحضرت ﷺ کی یہ مثالیت کسی ایک امر کے ساتھ خاص نہیں ؛ بلکہ شعبہ ہائے زندگی کے تمام اُمور کے ساتھ متعلق ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے اُمت کے سامنے بذات خود اس مثالیت کو اس انداز میں برت کر پیش کیا ہے، جس کی نظیر نہ تو تاریخ کے خزاں رسیدہ کسی ورق میں مل سکتی ہے اور نا ہی بہار دیدہ کسی صفحہ میں۔

میدانِ حرب وضرب میں عمومی طور پر کسی رو رعایت کے بغیر تمام طرح کے اعمال کی انجام دہی کو زمانہ جاہلیت میں بھی جائز سمجھا جاتا تھا اور آج بھی سمجھا جاتا ہے؛ حتیٰ کہ بعض ایسے غیر اخلاقی اُمور کا بھی ارتکاب کیا جاتا ہے، جس سے انسانیت کی جبین مارے شرم کے عرقِ ندامت سے تر ہو جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ رزم گاہ میں بھی ہمارے لئے اُسوہ ہیں؛ لہٰذا آیئے! ہم اپنے سر کی آنکھوں سے جہاد میں رسول اللہ ﷺ کے اُسوہ اور نمونہ کا مشاہدہ کرتے چلیں۔

عصبیت اور مفاد پرستی سے پاک

نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی میں جتنی بھی جنگیں لڑی ہیں، ان کا واحد مقصد اُس خالق کے کلمہ کو چہار دانگِ عالم میں بلند اور غالب کرنا تھا، ان جنگوں میں نہ تو ذاتی مفاد کا دخل تھا اور نا ہی کسی تعصب کا اثر، یہی وجہ ہے کہ نبوت ملنے کے بعد تیرہ سال کی طویل مدت تک اہل مکہ کے ظلم وستم اور اُن کے جور و جفا پر صبر کی سل چھاتی پر رکھ کر بیٹھے رہے؛ حالاں کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے تھے کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسے شجاع افراد آپ ﷺ کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے، نیز اُن جنگوں کو خاندانی لڑائی بنا کر پیش کرنا بھی کوئی مشکل امر نہ تھا کہ (عمومی طور پر تمام اور خصوصی طور پر آپ کے خاندان کے) لوگ نہ صرف یہ آپ ﷺ کو صادق وامین سمجھتے تھے؛ بلکہ بائیکاٹ جیسی مشکل گھڑی میں آپ ﷺ کے خاندان کے لوگ آپ ﷺ کے دوش بدوش بھی تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔

◆ استاذ : جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور، کرناٹک۔

اس کے برخلاف جب ہم تاریخ کے صفحات پلٹتے ہیں اور جنگوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر نظر آتا ہے کہ ان کی لڑائیاں مفاد پرستی اور تعصب کا شکار رہی ہیں، کہیں قومی تعصب کی جنگ ہے تو کہیں لسانی تنگ نظری کی لڑائی، کہیں معدنی تیل کے لئے معرکہ ہے تو کہیں زمین داری کے لئے ہنگامہ، کہیں بادشاہت کا مفاد کارفرما ہے تو کہیں صدارت کی غرض درپیش، کہیں ٹکنالوجی کی ترقی کا حسد ہے تو کہیں معاشی استحکام کی جلن، کہیں ملک کو وسعت دینے کی خواہش ہے تو کہیں نظریاتی فلسفہ کو تھوپنے کی اُمنگ، کہیں مسلکی جھگڑا ہے تو کہیں مشربی جدال، غرض کسی نہ کسی مفاد اور تعصب کے تحت جنگیں لڑی گئی ہیں اور موجودہ زمانہ میں تو ہم کھل کر اس کا مشاہدہ کررہے ہیں، کاش! جنگ کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کے اُسوہ کو اپنایا جاتا تو آج دنیا جنگ کی بھٹی میں نہ تپ رہی ہوتی اور بالخصوص مشرقِ وسطیٰ جنگ کے جس آتشیں گولے پر بیٹھی ہوئی ہے، وہ گولہ ہی وجود میں نہ آتا۔

انسانیت کا احترام

۲ رہجری میں کفارِ قریش اور مسلمانوں کے درمیان ایک اتفاقی جنگ ہوئی، جو ''جنگِ بدر'' کے نام سے تاریخ کے صفحات میں مذکور ہے، اس جنگ میں تقریباً ستر مشرکین کام آئے، جب یہ جنگ ختم ہوگئی تو آپ ﷺ نے ان مقتولین کو کنوئیں میں ڈلوادیا اور اوپر سے مٹی پاٹ دی گئی، یہ محض انسانیت کے احترام میں تھا — کیا آج کی جنگوں میں انسانیت کے اس احترام کو ملحوظ رکھا جاتا ہے؟ ہماری جنگوں میں تو قصداً نعشوں کو بے گور وکفن چٹیل میدان میں چھوڑ دیا جاتا ہے؛ تاکہ انسانیت کا جو تھوڑا احترام باقی رہ گیا ہے، اسے جانور مل کر ختم کردیں، چیر پھاڑ کرنے والے پرندے اور درندے اُسے گھسیٹتے پھریں، اس کے بغیر ہمارا کلیجہ ٹھنڈا ابھی تو نہیں ہوتا، کاش! حضور ﷺ کے اس عمل کو سامنے رکھ کر میدانِ جنگ میں بھی انسانیت کا احترام کرنا سیکھتے۔

عورتوں کو ہلاک کرنے کی ممانعت

اسلام ایک ایسا دین ہے، جس نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت کسی دوسرے دین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کیا ہے، انھیں میں سے ایک ''جنگ میں ان کو قتل کرنے'' کی ممانعت بھی ہے؛ چنانچہ بخاری کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی جنگ میں ایک خاتون کو مقتول پایا تو سختی کے ساتھ جنگ میں کسی خاتون کو قتل کرنے سے منع فرمادیا، (۱) اسی ممانعت کا نتیجہ تھا کہ کسی بھی غزوہ میں ایک بھی خاتون کو قتل نہیں کیا گیا؛ حالاں کہ عربوں کے رواج کے مطابق مردوں کی جرأت وبے باکی میں شعلہ زنی کے لئے بہت سارے غزوات میں کفارِ مکہ اور دوسرے قبائل کی خواتین نے بھی شرکت کی تھی۔

---

(۱) بخاری، باب قتل النساء فی الحرب، حدیث نمبر: ۳۰۱۵۔

بچوں کو قتل نہ کرنے کا حکم

بچے ایسے پھول کی مانند ہوتے ہیں، جسے ہر شخص محبت کی نظر سے دیکھتا ہے، آنحضرت ﷺ کو بھی بچوں سے بے انتہا محبت تھی، آپ ﷺ کبھی ان کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کا معاملہ بھی نہیں فرماتے تھے، اگر وہ کوئی غلطی کرتے تو انھیں پیار سے سمجھاتے، بچوں کے ساتھ محبت کے اس معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی تفریق نہ تھی، نیز آنحضرت ﷺ نے ہر مسلمان کو بچوں کے ساتھ محبت کے اس طریقہ کو سکھایا تھا؛ چنانچہ آغازِ اسلام میں جب اہل مکہ اسلام لانے والوں پر ظلم کی انتہا کر رہے تھے، ایسے میں غزوۂ بدر کے بعد حضرت خبیبؓ مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ مشرکین مکہ کی خبر دریافت کرنے کے لئے گئے؛ لیکن اتفاق سے گرفتار کر لئے گئے، گرفتاری کے بعد بنوحارث نے اپنے باپ کے بدلہ میں (جس کو حضرت خبیبؓ نے غزوۂ بدر میں قتل کیا تھا) قتل کرنے کے لئے خرید کر قید کر دیا، حضرت خبیبؓ کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ ضرور قتل کئے جائیں گے؛ چنانچہ انھوں نے اپنے رب سے ملاقات کے لئے تیاری کی اور تنظیف وتطہیر کے لئے ایک استرا اُدھار لیا، اسی دوران بنوحارث کے کسی خاتون کا چھوٹا بچہ کھیلتے کھیلتے ان کے پاس پہنچ گیا، انھوں نے پیار سے اس بچہ کو اپنی گود میں بٹھالیا، ماں نے جب اپنے بچے کو ایسے دشمن کی گود میں دیکھا، جسے کل قتل کیا جانا تھا اور وہ اس حال میں کہ ہاتھ میں استرا تھا تو وہ حواس باختہ ہوگئی، حضرت خبیبؓ نے ماں کی اس گھبراہٹ کو پہچان لیا اور کہا: تم ڈر رہی ہو کہ میں اسے قتل کر دوں گا، میں اسے قتل نہیں کروں گا اور بچے کو ماں کے سپرد کر دیا، (۱) بچوں کے ساتھ اس محبت کو اللہ کے رسول ﷺ نے میدانِ جنگ میں بھی باقی رکھا اور حکم جاری کیا کہ ''کسی بچہ کو قتل نہ کیا جائے'' (۲) اس حکم کو آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ نے برت کر بھی دکھایا؛ چنانچہ جہاد کی پوری تاریخ میں کسی بچے کو قتل کرنے کی روایت ہمیں نہیں ملتی۔

مُثلہ نہ کرنے کی ہدایت

حضور اکرم ﷺ نے جتنی بھی جنگیں لڑیں، ان میں کہیں بھی مقتولین کے ساتھ اس طرح کی بے حرمتی کا جرم نہیں کیا گیا ہے؛ حتیٰ کہ آپ کے محبوب چچا حضرت حمزہؓ کی شہادت کے بعد ان کا مثلہ کیا گیا، اگر آپ چاہتے تو اس کا بدلہ بعد کی جنگوں میں لے لیتے؛ لیکن آنحضرت ﷺ نے غم کا کڑوا گھونٹ تو پینا پسند فرمایا، انتقاماً بھی ایسی حرکت کو گوارا نہیں فرمایا؛ بلکہ صراحتاً اس کی ممانعت فرمائی؛ چنانچہ حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں کہ: ''حضور اکرم ﷺ جب بھی ہمارے درمیان خطیب کی حیثیت سے کھڑے ہوئے تو صدقہ کا حکم دیا اور مثلہ کرنے سے منع فرمایا'' (۳) کاش! جنگ کی آگ بھڑکانے والے آپ ﷺ کے اس طرز عمل کو اختیار فرماتے!

(۱) قصص من التاریخ الاسلامی: ۵۷۔ (۲) بخاری، کتاب الجہاد، باب قتل الصبیان فی الحرب، حدیث نمبر: ۳۰۱۴، مسلم، حدیث نمبر: ۴۶۵۴۔

(۳) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۰۰۹۷۔

مذہبی پیشواؤں کو نہ مارنے کا حکم

فاتح قوم دورانِ جنگ طیش وطنطنہ میں سب کچھ بھول جاتی ہے، اس کے سامنے مخالفین میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک لڑائی کرنے والے کی ہوتی ہے، خواہ معابد کے ربی ہوں یا صوامع کے راہب، مندر کے پجاری ہوں یا مسجد کے امام، بکریوں کے ریوڑ کی طرح ایک ہی ڈنڈے سے سب کو ہانک دیتے ہیں؛ حالاں کہ عموماً یہ لوگ معتدل مزاج اور جنگ وجدال سے دُور رہنے والے ہوتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی جنگوں میں ان چیزوں کی رعایت ہوتی تھی، ایک ہی ڈنڈے سے سب کو نہیں ہانکا جاتا تھا؛ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے لشکر کو بھیجتے تو حکم دیتے ہوئے فرماتے تھے: ''...... نہ تو مثلہ کرو، نہ بچوں کو قتل کرو اور نہ ہی صوامع والوں (مذہبی پیشواؤں) کو قتل کرو''(۱) کاش! جنگوں میں آپ ﷺ کے اس اُسوہ کو اپنایا جاتا!

دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک

غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت حبابؓ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے بدر کے چشمہ پر قبضہ کرلیا تھا، اگر چاہتے تو کسی کافر کو، جو خود اُنھیں کے ساتھ مقابلہ آرائی کے لئے بھی آیا ہوا ہو، ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتے؛ لیکن قربان جایئے رسول اللہ ﷺ پر! کہ کافروں کو پانی لینے کی عام اجازت دے دی۔

دشمن کے ساتھ احسان مندی

غزوۂ بدر میں گھمسان کا رن پڑنے سے پیشتر آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ بنو ہاشم اور دیگر قبائل کے کچھ لوگ بادلِ نخواستہ اِس جنگ میں شریک ہوئے ہیں؛ لہٰذا اُنھیں قتل نہ کیا جائے، ابوالبختری بن ہشام اور عباس بن عبدالمطلب کو قتل نہ کیا جائے، بنو ہاشم نہ صرف یہ کہ طوعاً وکرہاً جنگ میں آئے تھے؛ بلکہ شعب ابی طالب میں بھی آپ ﷺ کے لئے تکلیفیں برداشت کی تھیں، ابوالبختری نے کئی مرتبہ شعب ابی طالب میں کھانا پہنچایا تھا، نیز بائیکاٹ کے ختم کرنے میں بھی اس کا اہم رول تھا، یہ سارے آپ ﷺ اور مسلمانوں کے محسنین تھے؛ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے ان کے احسان کا اس طرح بدلہ چکایا۔

قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

غزوۂ بدر سے فارغ ہوکر آپ ﷺ مدینہ پہنچے اور قیدیوں کو صحابہ کے درمیان یہ حکم دیتے ہوئے تقسیم فرمایا:

---

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۷۲۸۔

''استوصوا بالأساری خیراً'' (قیدیوں کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو) جس کا نتیجہ تھا کہ صحابہ ان کی رسیوں کو ہلکی گرہ لگاتے؛ تاکہ تکلیف نہ ہو، نیز خود تو موٹا جھوٹا کھاتے؛ لیکن قیدیوں کو حسبِ استطاعت عمدہ کھلانے کی کوشش کرتے اور ان کا ہر طرح سے خیال رکھتے؛ چنانچہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ماں شریک بھائی ابوعزیز کہتے ہیں: ''میں بدر کے قیدیوں میں انصار کے حصہ میں تھا، وہ لوگ آپ ﷺ کے اس حکم کی وجہ سے صبح و شام مجھے روٹی کھلاتے، جب کہ خود کھجور کھاتے تھے۔(۱)

اس کے برخلاف آج قیدیوں کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے، ان پر کتے چھوڑے جاتے ہیں، بجلی کا شاٹ دیا جاتا ہے، ناخن کھینچ لئے جاتے ہیں، پتھر کی سلوں پر مسلسل لٹایا جاتا ہے، تیز روشنی کر دی جاتی ہے؛ تاکہ قیدی پلک بھی نہ جھپکا سکے، مسلسل کھڑے رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے، کھانے پینے کے لئے ترسایا جاتا ہے، سخت سردی کے موسم میں ٹھنڈے پانی میں کمر تک ڈوبے رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے، بے لباس کر دیا جاتا ہے؛ حتیٰ کہ اخلاقی سطح سے مکمل طور پر نیچے اُتر کر ہم جنس پرستی پر بھی مجبور کیا جاتا ہے۔

دورانِ جنگ دشمن کے حق میں دُعا

غزوۂ اُحد میں عبداللہ بن قمئہ کے حملہ کی وجہ سے آنحضرت ﷺ زخمی ہو گئے اور آپ ﷺ کے سامنے کے دو دانت بھی ٹوٹ گئے، ایسے وقت میں بھی آپ دُعا دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اے اللہ! میری قوم کو بخش دے، وہ نہیں جانتی'' (۲) اسی طرح محاصرۂ طائف کے دوران بعض نے محصورین کے حق میں بدعا کی درخواست کی، جس کے جواب میں آپ ﷺ نے یہ دُعا دی: ''اللّٰھم اھد ثقیفاً، وائت لھم (۳) ''اے اللہ! ثقیف کو ہدایت دے اور میرے پاس آنے کی توفیق دے''۔

سخت جان دشمن کے ساتھ بھی عفو و درگزر

اہل مکہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے اہل اسلام کو تکلیف دینے میں کسی طرح کی کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی، صحابہؓ کے جسموں سے اُن زخموں کے داغ مٹے نہیں تھے، جو اہل مکہ نے ان پر لگائے تھے؛ بلکہ بعض صحابہ کے زخم تو رِس ہی رہے تھے، اہل مکہ وہ لوگ تھے، جنھوں نے آپ ﷺ کے قتل کی سازش رچی تھی، جنھوں نے صحابہ کے گھر بار اور دولت و جائداد پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا، جنھوں نے اُن کو دیارِ غیر جانے پر مجبور کر دیا تھا، ۸ ہجری میں اُنھیں

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر: ۹۷۷۔

(۲) مسلم، باب غزوۃ اُحد، حدیث نمبر: ۱۷۹۲۔

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ، ماجاء فی ثقیف، حدیث نمبر: ۳۳۱۶۳۔

لوگوں پر فتح حاصل ہورہی تھی، ان کے دلوں میں بھی کیا کیا اُمنگیں بدلہ لینے کی نہیں اُٹھی ہوں گی؟ انتقام لینے کی کیا کیا تدبیریں اِن کے حاشیۂ خیال میں گردش نہیں کررہی ہوں گی؟ لیکن صفح وعفو کی ایسی مثال قائم کی گئی، جس کی نظیر قدیم وجدید تاریخ کے اوراق میں ملنی مشکل ہے۔(۱)

آگ میں جلا کر مارنے کی ممانعت

دورانِ جنگ ہر فریق کا مقصد اپنے مخالف کو ختم کرنا ہوتا ہے، خواہ اس کے لئے کوئی سا بھی طریقہ اختیار کرنا پڑے؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دورِ حاضر میں اس کے لئے مختلف کے قسم کے کیمیائی ہتھیار استعمال کئے جاتے ہیں، ایسے ہتھیار، جس سے انسان کا سارا بدن جل کر خاک ہوجاتا ہے؛ بلکہ آج کل زیادہ تر استعمال ہونے والے ہتھیاروں کا تعلق اسی قبیل سے ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے کسی جنگ میں اس طرح سے اپنے مخالفین کو نہیں مارا ہے؛ بلکہ آنحضرت ﷺ نے صراحتاً اس طرح مارنے سے منع فرمایا ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک سریہ (وہ جنگ، جس میں حضور ﷺ خود شریک نہ ہوئے ہوں) میں بھیجتے وقت فرمایا: ''اگر فلاں فلاں کو قابو میں کرلو تو ان دونوں کو جلا دینا'' دوسرے دن ایک قاصد کے ذریعہ سے پیغام بھیجا کہ ''میں نے ان دونوں آدمیوں کو جلانے کا حکم دیا تھا؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے طریقے پر عذاب دینا درست نہیں؛ اس لئے اگر ان دونوں پر قابو پالو تو انھیں قتل کرنا'' (۲) آپ ﷺ کا اُسوہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ ہم غیظ وغضب میں اس قدر آگے نہ بڑھ جائیں کہ لوگوں کو جلا کر مارنا شروع کردیں۔

انتقامی جنگ سے دوری

حضرت سعد بن عبادہؓ نے فتح مکہ کے موقع سے وفورِ جذبات میں سرشار ہوکر یہ کہہ دیا: ''**اليوم يوم الملحمة ، اليوم تستحل الكعبة**'' (آج لڑائی کا دن ہے، آج کعبہ میں جنگ وجدال جائز ہوگا) حضرت ابوسفیانؓ نے آپ ﷺ سے حضرت سعدؓ کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''**كذب سعد ، ولكن هذا اليوم يعظم الله فيه الكعبة ، ويوم تكسى فيه الكعبة**'' (۳) ''سعد نے غلط کہا، آج خانۂ کعبہ کی عظمت کا دن ہے، آج اس کو غلاف پہنایا جائے گا'' چوں کہ حضرت سعدؓ کی اس بات سے انتقام کی بو آرہی تھی؛ اس لئے ان سے علم لے کر ان کے بیٹے قیس کو دے دیا۔

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/ ۴۱۲۔ (۲) مصنف ابن ابی شیبہ، من نہی عن التحریق بالنار، حدیث نمبر: ۳۳۸۱۴۔

(۳) بخاری، باب أین رکز النبیؐ الرایۃ یوم الفتح، حدیث نمبر: ۴۰۳۰۔

دورانِ جنگ عہد کا لحاظ

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کے مقابلہ میں نہایت ہی کم تھی اور ایک آدمی کا اضافہ بھی باعث تسکین ہوتا، ایسے موقع پر حضرت حذیفہ اور حضرت ابوحسیل رضی اللہ عنہما کو کہیں سے آتے ہوئے کفار راہ میں روکتے ہیں کہ محمد (ﷺ) کی مدد کو جارہے ہیں، یہ انکار کرتے ہیں اور عدم تعاون کا وعدہ کرتے ہیں، کفار انھیں جانے کی اجازت دے دیتے ہیں، یہ دونوں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر پوری بات بتاتے ہیں، تو آپ ﷺ ان سے ہر حال میں وعدہ وفا کرنے کو کہتے ہیں اور جنگ میں شریک ہونے کی اجازت مرحمت نہیں فرماتے۔(۱)

قیدیوں کی سزاؤں میں تخفیف

غزوۂ بدر کے اختتام کے بعد قیدیوں کو مدینہ لایا گیا اور رسیوں سے باندھ کر مسجد نبوی میں رکھا گیا، رات کو بعض قیدیوں کی کراہ سنائی دی، قیدیوں کی کراہ سن کر آنحضرت ﷺ بے چین ہوگئے اور بقیہ رات آنکھوں میں کاٹی، جب صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے ان کی بندشوں کو ڈھیلا کرنے کا حکم دیا۔

قیدیوں کی رہائی

قیدی اس لئے نہیں ہوتے کہ ان کے بال بچوں کو جیتے جی یتیم کرکے موت تک ان کو بند کرکے رکھا جائے؛ بلکہ قید اس لئے کیا جاتا ہے؛ تاکہ ان کی مناسب فہمائش ہوجائے، پھر ان سے وعدہ وعید یا بطور تنبیہ کے کچھ تاوان وصول کرکے چھوڑ دیا جائے، آنحضرت ﷺ نے غزوۂ بدر میں ان جنگی قیدیوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرمایا، جنھوں نے آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو بے سروسامانی کی حالت میں وطن چھوڑنے پر مجبور کردیا تھا، آپ ﷺ نے کچھ قیدیوں سے فدیہ لے کر اور جو فدیہ دینے کے قابل نہیں تھے، انھیں بغیر فدیہ کے رہا فرمادیا۔

حضور ﷺ نے چودہ صدیاں قبل ہی جنگی قیدیوں کے حقوق اور ان کے انسانی احترام کا نہ صرف نظریہ پیش کیا؛ بلکہ اس کو برت کر بھی دِکھایا، دنیا کو اب جاکر جنگی قیدیوں کے حقوق کا خیال آیا ہے اور اس سلسلے میں جنیوا کنونشن میں قوانین بنے ہیں، حضور ﷺ کی عظمت اسی ایک بات سے ثابت ہے کہ دنیا باوجود اپنی بے پناہ ترقیوں کے جہاں آج پہنچی ہے عبداللہ کا لاڈلا اور آمنہ کا جگر گوشہ چودہ صدی قبل ہی اس کی نشاندہی کرچکا تھا۔(ﷺ)

• • •

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۲۹/۴۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علماء اہل کتاب

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

مغربی اہل علم نے پیغمبر اسلام کی نبوت سے انکار کے لئے بڑی ناکام کوششیں کی ہیں اور اس کے لئے علم واستدلال کے ہتھیار بھی بار بار بدلے ہیں، کبھی آپ کی تعلیمات کو حالات کے تحت اندر سے اُٹھنے والا ردعمل اور کبھی مرض و بیماری کا نتیجہ قرار دیا، اور کبھی اہل کتاب علماء سے اور بالخصوص سفر شام میں راہبوں سے ملاقات اور ان سے استفادہ کا ثمرہ ٹھہرایا؛ چوں کہ یہ آخری صورت ان کو نسبتاً زیادہ قرین قیاس محسوس ہوئی؛ اس لئے عموماً ان حضرات نے اس کو ایک ناقابل تردید علمی تحقیق کا رنگ دے کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

وہ مستشرق علماء — جو اسلام کے بارے میں ایک حد تک منصف مزاج مانے جاتے ہیں — بھی آپ کی تعلیمات کو اہل کتاب علماء سے تاثر کا نتیجہ قرار دینے سے نہیں چوکتے، مثلاً ڈاکٹر ڈریپر ان علماء میں ہیں، جن کو معتدل اور اسلام کے بارے میں مہذب اور انصاف پسند سمجھا جاتا ہے؛ لیکن وہ بھی اسلام کو عیسائیت کا ''نسطوری فرقہ'' قرار دینے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیتے اور کہتے ہیں :

> بُحَیرىٰ راہب نے بُصریٰ کی خانقاہ میں حضرت محمد کو نسطوری عقائد کی تعلیم کی اور اپنے مظالم کی داستان شروع سے آخر تک حرف بہ حرف کہہ سنائی، یہ ان ہی ملاقاتوں کا نتیجہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں کلیسائے مشرق کی بت پرستانہ رسموں کی طرف سے عموماً اور اوثان واصنام کی پرستش کی طرف سے خصوصاً وہ نفرت بیٹھ گئی، جس کو کوئی قوت مٹا نہ سکی اور بحیرہ راہب ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ آپ نے اس عجیب وغریب زندگی کے دوران جس کے کارناموں نے دنیا کو محو حیرت کر دیا، حضرت مسیح کو کبھی خدا کا بیٹا کہہ کر نہ پکارا؛ بلکہ ہمیشہ مسیح ابن مریم کے لقب سے یاد فرمایا، آپ کے ناتربیت یافتہ؛ لیکن مستعد اور اخّاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیقوں کے مذہبی؛ بلکہ فلسفیانہ خیالات کا نہایت گہرا اثر قبول کیا، اور یہ وہ اتالیق تھے، جنھیں ارسطو کے جانشین

اور حکمت مشائیہ کے سبق آموز ہونے کے لحاظ سے اپنی ذات پر ناز تھا اور بجا ناز تھا، بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی صاف شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا؛ چنانچہ اس ارادت ومحبت کا جو آپ اس فرقہ کے ساتھ رکھتے تھے، آپ نے متواتر ثبوت دیا ہے، اس سے بڑھ کر اور ثبوت اس انس وعقیدت کا کیا ہوگا آپ کہ نے اپنی زندگی کو نسطوریوں کے دینی عقائد کی توسیع واشاعت کے لئے وقف کر دیا اور جب یہ مقصد پورا ہو چکا تو آپ کے جانشینوں نے ان کے علمی مشائی اُصول اختیار کر لئے اور نہایت سرگرمی سے ان کی اشاعت میں حصہ لیا۔

جب حضرت محمد ﷺ سن رشد کو پہنچے تو آپ نے ارض شام کے اور بھی سفر کئے، یہ خیال کرنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ ان موقعوں پر آپ نسطوری خانقاہ میں جا کر اس کے مہمان نواز مکینوں سے —جنھیں آپ نے فراموش نہ کیا تھا— ضرور ملے ہوں گے۔(۱)

بحیری راہب سے ملاقات

ان راہبوں سے ملاقات کے واقعات کو کس طرح رائی کا پہاڑ بنایا گیا ہے، اس کا اندازہ اصل واقعہ سے ہوگا، سیرت کی اکثر کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر ملتا ہے کہ آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب کے بعد حضرت ابوطالب نے شام کا تجارتی سفر فرمایا، پیغمبر اسلام ﷺ کے اصرار پر کم عمری کے باوجود حضرت ابوطالب نے آپ کو ساتھ لے لیا، اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟ اس سلسلہ میں روایتیں مختلف ہیں، کچھ لوگوں نے سات سال کہا ہے، (۲) بعض روایتوں میں عمر مبارک بارہ سال ذکر کی گئی ہے یہی رائے طبری کی ہے، بعض لوگوں کی رائے ہے کہ اس وقت آپ کی عمر نو سال کی تھی، سہیلی نے اسی کو ترجیح دیا ہے اور طبری نے یہی رائے ابن شہاب سے نقل کی ہے۔(۳)

صحاح ستہ میں اس واقعہ کو صرف امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے، ترمذی کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوطالب کے ساتھ رسول اللہ ﷺ قافلہ قریش میں شامل ہو کر شام گئے، راستہ میں ایک راہب کی خانقاہ (صومعہ) ملی، حضرت ابوطالب نے اسی خانقاہ کے قریب رخت سفر کھولا، یہ راہب جو اس سے پہلے کبھی قافلہ عرب کے خیر مقدم

(۱) معرکہ مذہب وسائنس، ۱۰۹تا۱ (مترجم، مولوی عبدالحق صاحب)۔

(۲) تاریخ ابن خلدون، بقیۃ المجلد الثانی: ۴۔

(۳) تاریخ طبری: ۱/۴۵۶، ۴، الروض الانف: ۱/۲۰۶۔

کے لئے نہیں نکلا تھا، خلاف توقع ان حضرات کے پاس آیا، رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگا! ''یہ تمام عالم کے سردار اور پروردگار عالم کے رسول ہیں، خدا نے ان کو تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے'' شیوخ قریش نے دریافت کیا کہ تمہیں یہ کیوں کر معلوم ہوا؟ اس نے کہا: میں نے تمام درختوں اور پتھروں کو آپ کو سجدہ کرتے ہوئے پایا ہے اور یہ دونوں کسی نبی ہی کو سجدہ کرتے ہیں، نیز میں نے آپ کے مونڈھے پر ختم نبوت دیکھی ہے۔

راہب اتنی گفتگو کے بعد لوٹ گیا اور ان حضرات کی ضیافت کی تیاری کرنے لگا؛ چنانچہ لوگ کھانے پر آ گئے اور آپ کو اونٹیوں میں چھوڑ دیا، راہب نے آپ کو بلوایا، آپ تشریف لائے تو اس طرح کہ ایک بادل آپ پر سایہ فگن تھا، درخت کی سایہ دار جگہ لوگوں نے پہلے ہی سے سنبھال رکھی تھی، آپ بے سایہ جگہ پر تشریف فرما ہوئے؛ لیکن ہوا یہ کہ درخت کا سایہ آپ کی طرف جھک آیا؛ چنانچہ راہب نے حضرت ابوطالب کو سمجھایا کہ آپ کا ان کو روم لے جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے، اہل روم ان کو پہچان لیں گے اور قتل کر دیں گے: یہاں تک کہ حضرت ابوطالب نے آپ کو واپس کر دیا، حضرت بلالؓ کو حضرت ابوبکرؓ نے آپ کے ساتھ کر دیا، نیز خود راہب نے بھی کچھ سامان سفر پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔(۱)

خیال رہے کہ حضرت ابوطالب آپ کو شام لے گئے اور اپنے ساتھ ہی واپس لائے،(۲) طبقات ابن سعد کی روایت میں صرف آپ کی بحیری راہب سے ملاقات کا ذکر ہے،(۳) خود بحیری راہب کے بارے میں بعض اہل سیرت کہتے ہیں کہ وہ ایک یہودی عالم تھا(۴) اور اکثر اہل سیرت کی رائے ہے کہ وہ ایک عیسائی عالم تھے اور اس خانقاہ میں عیسائی کتابوں کا درس ہوا کرتا تھا،(۵) اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ بحیری کہاں سکونت پذیر تھا؟ بعض کہتے ہیں کہ مقام کفر کا تھا، جو بصری سے چھ میل کی دوری پر ہے، اور بعض حضرات کی رائے ہے کہ سرزمین شام کے ایک گاؤں بلقاء(۶) بعض روایت میں یہ بات بھی آئی ہے کہ کچھ اہل روم اسی وقت آپ کی تلاش میں اس خانقاہ کو پہنچ گئے؛ لیکن راہب کے سمجھانے پر وہ لوگ آپ پر کسی تعدی سے باز رہے اور ان لوگوں نے بیعت کر لی، یہ بات مبہم ہے کہ انھوں نے کس سے کی، راہب سے یا آپ سے؟ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے آپ کو امن دینے پر راہب سے بیعت کی ہوگی،(۷) اسی طرح کے بعض اور اختلافات اور تضادات اس واقعہ کی روایت میں موجود ہیں۔

---

(۱) امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور لکھا ہے: ہذا حدیث غریب لانعرفہ الامن ہذا الوجہ، کتاب المناقب، باب ماجاء فی بدء النبوۃ۔

(۲) عیون الاثر: ۲/۷۵، صفتہ الصفوہ: ۱/۶۹۔ (۳) طبقات بن سعد: ۱/۱۲۰۔

(۴) صفتہ الصفوہ: ۱/۶۶۔ (۵) الوفاء: ۱۲۸۔

(۶) سیرت حلبیہ: ۱/۱۹۵۔ (۷) سیرت حلبیہ: ۱/۱۹۶۔

اس واقعہ کے سلسلہ میں حقیقت حال کو سمجھنے کے لئے دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہییں، اول یہ کہ خود یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے کس درجہ مستند اور قابل اعتبار ہے؟ دوسرے: پیغمبر اسلام کی مذکورہ راہب کے ساتھ یہ ملاقات کتنے وقت کی تھی؟ اور کیا آپ کی عمر اس بات کی متحمل تھی کہ آپ مذہب کے مابعد الطبیعی تصورات اور فلسفۂ الٰہیات کو سمجھ سکیں؟

روایات پر ایک ناقدانہ نظر

اس واقعہ میں متعدد ایسی باتیں موجود ہیں، جو اس روایت کے ضعف کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ امام ذہبی نے اس حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ مجھے اس کے موضوع یعنی من گھڑت ہونے کا خیال ہوتا ہے، (۱) مثلاً حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ ﷺ سے دو سال چھوٹے تھے، اس طرح اس واقعہ کے وقت ان کی عمر سات سال یا زیادہ سے زیادہ دس سال قرار پاتی ہے یہ بات کسی طرح بھی قرین قیاس نظر نہیں آتی کہ اتنے طویل سفر پر اور وہ بھی حفاظتی اقدام کے تحت ابوطالب نے آپ سے بھی کم عمر لڑکے کو آپ کے ساتھ بھیج دیا ہو، نیز حضرت بلالؓ کا آپ کے ساتھ آنا تو اور بھی عجوبہ ہے اس لئے کہ اس واقعہ کے تیس سال کے بعد حضرت ابوبکر نے حضرت بلالؓ کو اُمیہ بن خلف سے خرید کر آزاد کیا؛ اس لئے اس سفر میں حضرت بلالؓ کی حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ رفاقت اور حضرت ابوبکرؓ کا حضرت بلالؓ کو بھیجنا ناقابل قیاس ہے؛ اسی لئے ابن سید الناس نے لکھا ہے کہ سند کے صحیح ہونے کے باوجود اس روایت کا متن قابل اعتماد نہیں۔ (۲)

علامہ ابن کثیر نے بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ کے ساتھ آپ کی واپسی کے ناقابل قیاس ہونے کے علاوہ ایک خامی اس میں یہ بھی ہے کہ بادل کے آپ پر سایہ فگن ہونے کا جو ذکر اس روایت میں ہے، وہ دوسری صحیح روایات میں موجود نہیں ہے، نیز یہ حدیث حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی مرسل ہے اور حضرت ابوموسیٰ سنہ ۷ ھ میں مدینہ تشریف لائے ہیں، اس طرح جس راوی نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے، وہ خود اس کا چشم دید نہیں ہے، (۳) جہاں تک اس روایت کے مرسل ہونے کی بات ہے، جس پر علامہ شبلی نے بھی کلام کیا ہے تو یہ کوئی قوی وجہ ضعف نہیں ہے؛ کیوں کہ صحابہ کی مرسل روایات بالاتفاق معتبر ہیں؛ لیکن روایت کے مضمون میں مختلف نکات —— راویوں کا اختلاف واضطراب، بعض ناقابل قیاس اُمور کا ذکر، خود آپ سے اس واقعہ کا منقول نہ ہونا، محمد بن اسحاق اور واقدی جیسے متکلم فیہ راویوں سے اس واقعہ کا مروی ہونا اور اس بات کا احتمال پایا جانا کہ شاید اس واقعہ کی سند کسی غیر مسلم راوی پر منتہی ہوتی ہو، راہب کا کہنا کہ شجر وحجر سجدہ کر رہے تھے اور رفقاء سفر کا اس کو محسوس نہ کر پانا، یہ مختلف باتیں ہیں —— اس روایت کی صحت کو مشکوک کر دیتی ہیں۔

---

(۱) قال الذہبی فی الحدیث: اظنہ موضوعاً، سیرت حلبیہ: ۱/۱۷۹۔

(۲) ومع ذالک ففی متنہ نکارۃ، عیون الاثر: ۱/۵۶۔

(۳) البدایہ والنہایہ: ۲/۲۸۵۔

اس ملاقات کا عرصہ

کتب سیرت میں جتنی روایات اس واقعہ کی بابت ہیں، وہ سب اس امر پر شاہد ہیں کہ بحیریٰ راہب سے آپ ﷺ کی ملاقات ایک پہر سے زیادہ کی نہ تھی، ایک وقت راہب مذکور نے قافلہ کی ضیافت کی، قافلہ کی آمد اور کھانے کے وقت راہب کی آپ سے اور اہل قافلہ سے مختصر سی گفتگو ہوئی، اس گفتگو کا خلاصہ محض اتنا تھا کہ فضل خداوندی سے آپ کو نبوت ملنے والی ہے، آپ کی عمر اس وقت بارہ سال اور زیادہ صحیح روایت کے مطابق صرف نو سال کی تھی، اتنی کم عمر میں کسی غامض فکر وتصور اور اعلیٰ دینی واخلاقی تعلیمات نیز تاریخی قصص و واقعات کی حفاظت ناقابل تصور ہے؛ اس لئے کوئی بھی معقول اور منصف مزاج شخص اس بات کا خیال تک نہیں کرسکتا کہ کم سنی کے زمانہ میں اتنے کم وقت کی مختصر ملاقات میں آپ نے بحیریٰ راہب سے ایسا مذہبی اور علمی استفادہ کیا ہوگا کہ ان ہی تعلیمات پر آپ ﷺ نے اپنی نبوت کی بنیاد رکھی۔

نسطورا سے ملاقات

پیغمبر اسلام ﷺ کا دوسرا سفر شام اس وقت ہوا، جب کہ عمر مبارک پچیس سال تھی، (۱) یہ سفر آپ نے حضرت خدیجہؓ کی خواہش پر اور ان ہی کا مال لے کر تجارت کی غرض سے کیا تھا، اس سفر میں حضرت خدیجہ کا غلام میسرہ بھی آپ کے ساتھ تھا، اس موقع سے نسطورا نامی راہب سے آپ کی ملاقات کا ذکر ملتا ہے، روایت میں ہے کہ جب حضور ﷺ اس راہب کی خانقاہ کے قریب پہنچے تو ایک درخت کے نیچے بیٹھے، راہب نے آپ کی اس نشست سے اندازہ کیا کہ آپ نبی ہیں اس لئے کہ بقول اس کے اس درخت کے نیچے ہمیشہ انبیاء ہی بیٹھا کئے ہیں ''**ما نزل تحت هذه الشجرة قط إلا نبي**''، (۲) ابن کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ میسرہ نے اس سفر میں دو فرشتوں کو بھی دیکھا، جو آپ پر سایہ فگن رہتے تھے اور دھوپ سے آپ کو بچایا کرتے تھے، بعض روایات میں ہے کہ ان فرشتوں کا مشاہدہ خود اس راہب نے کیا تھا، (۳) تاہم اس موقع سے اہل سیر صرف اسی قدر صراحت کرتے ہیں کہ راہب نے میسرہ کو بتایا کہ آپ کو نبی ہونا چاہئے، نیز اس نے میسرہ سے پوچھا: کیا آپ کی آنکھ میں سرخی بھی رہتی ہے؟ میسرہ نے کہا: ہاں، آپ کی آنکھ ہمیشہ سرخ رہتی ہے، اس پر راہب نے کہا: ''**نعم لا تفارقه**''، ہاں یہ نبی ہیں، کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑنا، (۴) سیرت کی کسی کتاب میں اس موقع سے آپ کے اور نسطورا کے درمیان گفتگو اور تبادلہ خیال کا ذکر نہیں۔

---

(۱) صفتہ الصفوہ: ۱/ ۱۷۔ (۲) سیرت بن ہشام مع الروض: ۱/ ۲۱۳، البدایہ والنہایہ: ۲/ ۲۹۴۔

(۳) البدایہ والنہایہ: ۲/ ۲۹۴۔ (۴) عیوان الاثر: ۱/ ۶۱۔

روایت کی فنی حیثیت

اس کے علاوہ کہ اس کی سند میں بعض ایسے راوی آئے ہیں، جن کا مقبول ہونا محدثین اور علماء، رجال کے نزدیک متفق علیہ نہیں ہے، اس روایت کے مضمون میں بھی بعض ایسی باتیں جمع ہوگئی ہیں، جو اس روایت کی صحت کو مشکوک کردیتی ہیں، مثلاً یہ کہنا کہ یہ ایسا درخت ہے جس کے نیچے نبی ہی بیٹھا کئے ہیں، دو ایسی باتوں کو شامل ہے، جو عادۃً ناممکنات میں سے ہیں، ایک یہ کہ اس درخت کی عمر اتنی طویل رہی ہو کہ کم سے کم حضرت مسیح سے لے کر آپ کے زمانہ تک وہ قائم رہا ہو، دوسرے یہ کہ اس صحرائی علاقہ میں جہاں کہ سایہ دار جگہ کی بڑی کمی ہوتی ہے، کوئی راہگیر اس درخت کے نیچے بیٹھا ہی نہ ہو، ابن ہشام کے شارح سہیلی نے گو اس مسئلہ میں تاویل وتوجیہ کی راہ اختیار کی ہے؛ لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کو بھی مضمون حدیث میں اس سقم کا احساس ہے :

والشجرة لا تعمر فی العادة هذا العمر الطویل حتی یدری انه لم ینزل تحتها الا عیسی او غیره من الانبیاء و یبعد فی العادة ایضاً ان تکون شجرة تخلو من ان ینزل تحتها احد ۔(۱)

دوسرے نسطورا اور بحیریٰ راہبوں سے ملاقات کی دونوں روایتوں سے جو مکمل تصویر ابھر کر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان راہبوں کی پیشین گوئی کی وجہ سے خود آپ اور عرب کے متعدد شیوخ ورؤساء اور تجار بھی مستقبل میں آپ کے نبی بنائے جانے سے واقف ہو چکے تھے، میسرہ کے ذریعہ حضرت خدیجہ بھی اس سے آگاہ ہو چکی تھیں اور ان ہی بشارتوں اور برکات کو دیکھ کر انھوں نے آپ کو نکاح کا پیغام دیا تھا، یہ ایک ایسی غیر معمولی خبر تھی، جو یقیناً اس بات کی مقتضی ہے کہ اہل مکہ میں اس نے ایک تعجب انگیز اور معروف خبر کی حیثیت سے حاصل کر لی ہوتی اور وہ آپ کی نبوت کے لئے چشم براہ ہوتے؛ لیکن سیرت کے واقعات اس کے عین برعکس ہیں، آپ جب نبی بنائے جاتے ہیں تو خود آپ کے لئے یہ ایک گھبرا دینے والی بات ہوتی ہے؛ خود قرآن ناطق ہے کہ نبوت ملنے سے پہلے تک آپ کو اس کا کوئی تصور بھی نہ تھا کہ آپ اس منصب پر سرفراز ہونے والے ہیں: ''وما کنت ترجوا ان یلقی الیک الکتاب''۔(۲)

پھر جب آپ ﷺ حضرت خدیجہؓ کو ماجرا سناتے ہیں تو وہ آپ کو دلاسا ضرور دلاتی ہیں اور آپ کے اخلاق کریمانہ اور کمزوروں اور یتیموں کے ساتھ آپ کے سلوک مشفقانہ کا ذکر ضرور کرتی ہیں، مگر اس مژدہ نبوت کو یاد نہیں کرتیں اور اپنے ایک بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس جاتی ہیں، جو عیسائی عالم تھے، ورقہ آپ کی نبوت کو سمجھ گئے، مگر آپ کے نبوت سے سرفرازی پر وہ انداز اختیار کرتے ہیں، جو کسی غیر متوقع واقعہ کے پیش آنے پر ہوتا ہے،

(۱) الروض:۱/۲۱۱۔ (۲) القصص صفہ:۸۶۔

اہل مکہ کے سامنے آپ جب اپنی نبوت کا اعلان کرتے ہیں تو ان کے لئے بھی یہ ایک نا قابل یقین اور یکسر نا مانوس خبر ہوتی ہے، یہاں کہ حضرت ابو طالب جن کے ساتھ آپ نے سفر فرمایا تھا، ان کو بھی راہب کا واقعہ یاد نہیں آتا اور وہ حالت کفر ہی میں دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

یہ پہلو اس روایت کے مضمون کی صحت کو کس درجہ مشکوک کر دیتا ہے؟ وہ محتاج اظہار نہیں؛ لیکن خود ان روایتوں میں نسطورا راہب سے جس ملاقات کا ذکر ہے، اس میں راہب اور پیغمبر اسلام کے درمیان کسی گفتگو کا ذکر نہیں ہے، نہ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام اور میسرہ کا ایک دو دن بھی یہاں قیام رہا ہو، حقیقت یہ ہے کہ اس موقع سے اس امر کی قطعاً کوئی نشاندہی نہیں ہوتی کہ آپ کا اتنے وقت کے لئے اس خانقاہ کے پاس قیام رہا ہو کہ مذہبی موضوعات پر آپ نے ان سے تبادلہ خیال کیا ہو۔

دوسرے قرائن

ان حقائق کے علاوہ جو اوپر مذکور ہوئے، تین نکات خاص طور پر قابل غور ہیں: اول یہ کہ پیغمبر اسلام کے دعوئ نبوت اور ان کے اِن اسفار کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ دوسرے: جو شخص اتنا ذہین ہو کہ وہ چند لمحات کی مختصر ملاقات کے ذریعہ اتنے بلند مذہبی افکار کی تخلیق کر سکتا ہو، اس کو ضرور اس امر سے بھی واقف ہونا چاہئے کہ وہ کیا تدریجی طریقہ اختیار کرے، جس سے اس کے دعویٰ کو قبول عام حاصل ہو، کیا پیغمبر اسلام ﷺ کے عمل سے اس کی تصدیق ہوتی ہے؟ تیسرے آپ کی تعلیمات اور ان راہبوں کی تعلیمات میں کس درجہ مماثلت ہے؟

تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ بحیریٰ راہب سے آپ کی ملاقات ۱۲ ر سال اور نسطورا سے ۲۵ سال کی عمر میں ہوئی، اس دوسرے سفر سے واپسی کے ساتھ ہی مکہ کی ایک سرمایہ دار اور شریف خاتون حضرت خدیجہؓ سے آپ کا نکاح ہوتا ہے، اگر آپ کی تعلیمات ان راہبوں سے تاثر پر مبنی ہوتیں، تو ضرور تھا کہ اس سفر سے واپسی کے ساتھ ہی آپ نے اپنی دعوت لوگوں کے سامنے پیش کی ہوتی اور حضرت خدیجہؓ سے ازدواجی رشتہ کی بنا پر آپ کو جو معاشی خوش حالی اور فراغ دستی حاصل تھی، اس کا استعمال کرتے ہوئے آپ نے اپنی دعوت کو مقبول بنانے کی سعی کی ہوتی، ان اسفار کے بعد ۲۸ اور ۱۵ سال تک مکمل خاموشی، مذہبی مسائل اور عقائد و رسوم پر سکوت اور اتنا عرصہ گذرنے اور ۴۰ سال عمر ہونے کے بعد اچانک دعویٰ نبوت اس بات کو غلط ثابت کرتا ہے کہ آپ نے ان حضرات سے کوئی مذہبی اثر قبول کیا تھا، ان راہبوں کے مذہبی افکار و تصورات نے اگر آپ کے دل و دماغ پر اس درجہ گہری چھاپ ڈالی ہوتی تو فطری طور پر آپ بار بار ان سے ملاقات کی کوشش کرتے، یا ان سے ملاقات کے متمنی اور آرزومند ہوتے، مگر آپ کی سیرت میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا؛ بلکہ آپ کبھی ان کا نام بھی اپنی زبان پر نہیں لائے۔

آپ کا دعویٰ نبوت اگر نعوذ باللہ امر الٰہی کے بجائے داخلی انفعال کا نتیجہ ہوتا، تو اس کے لئے آپ نے کمال ذہانت کے ساتھ ایک منصوبہ مرتب کیا ہوتا، اس منصوبہ میں چند باتیں ضرور شامل ہوتیں، اول یہ کہ آپ اپنے مشن کا آغاز کسی ایسی بات سے کرتے جو عربوں کے لئے قابل قبول ہو اور نقطہ اشتراک کا درجہ رکھتی ہو، مثلاً قریش یا عربوں کی قومیت کے احساس کو آپ پروان چڑھاتے، یا کم سے کم عقیدہ کی بجائے اخلاقی تعلیمات پر زور دیتے اور سماجی ناانصافی کے خاتمہ کی تحریک چلاتے، یہ وہ باتیں تھیں جو اختلاف اور ٹکراؤ کے بغیر عربوں کو ایران وروم کے مقابلہ میں آپ کے زیر قیادت مجتمع کر سکتی تھیں، مگر آپ نے ان سب کو چھوڑ کر اپنے دعویٰ نبوت کا آغاز عقیدہ توحید سے کیا، جو ان کے صدیوں پرانے تصورات اور زندگی کے تمام اُصولوں کی اساس پر ضرب کاری کا درجہ رکھتا تھا، دوسرے آپ نے عام مصلحین کے انداز پر تدریج کی راہ اختیار نہیں کی کہ آہستہ آہستہ قوم میں قبولیت کی صلاحیت پیدا کی جائے پھر ان کے سامنے اپنے مشن کا لب لباب رکھا جائے؛ بلکہ آپ نے مکمل خاموشی کے بعد ان کو اپنے قدیم عقائد وتصورات سے مکمل بغاوت کی دعوت دی، تیسرے: آپ کے دعویٰ نبوت کے بعد سال دو سال نہیں؛ بلکہ پورے ۱۳ سال مکہ میں اس طرح گذرے کہ اس میں ہر آنے والا دن پچھلے دن کے مقابلہ سخت ہوتا گیا اور آپ کے مشن کی کامیابی بظاہر موہوم ہوتی چلی گئی، اگر آپ کے دعویٰ کی پشت پر زبردست اعتماد ویقین کی قوت اور ایمان کی کیفیت نہ ہوتی اور وہ محض کسی فکر مستعار یا روا و نا روا داخلی جذبات کا نتیجہ ہوتی، تو اس موقع پر آپ کا دو میں سے کوئی ایک رویہ ہونا چاہئے تھا، یا تو ابتلائیں اور آزمائشیں اور اہل مکہ کی طرف سے مایوس کن ردعمل کی وجہ سے آپ اپنی تحریک کو ختم کر دیتے، یا ''لو'' اور ''دو'' کی پالیسی اختیار کر کے اہل مکہ کے لئے اسلام کو قابل قبول بناتے جیسا کہ عیسائیوں نے یونانیوں میں عیسائیت کو مقبول بنانے کے لئے کیا؛ بلکہ یونان کو اپنے افکار دیئے کم اور ان کے عقائد وتصورات قبول کئے زیادہ، یہاں تک کہ حضرت مسیح کی پیش کی ہوئی توحید کی جگہ سینٹ پال کی تثلیث نے لے لی، جو یونانیوں میں پہلے سے موجود عقیدہ تثلیث کی معمولی سی بدلی ہوئی شکل تھی۔

اہل مکہ کا سکوت

ان کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ شرک کی تردید اور توحید کے اثبات کے عقیدہ نے اہل مکہ کے قلوب میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جو آگ لگا دی تھی، وہ اس درجہ تیز اور شعلہ ریز تھی کہ یہ اسلام پر اعتراض کے لئے ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیتے تھے اور قرآن کو کبھی شاعری کبھی معمولی قصہ کہانی اور کبھی سحر وجادو کا نتیجہ قرار دیتے تھے، اور چوں کہ خود ان کے دل اس کے خلاف حقیقت ہونے پر مطمئن تھے، اس لئے بار بار ان کو اپنے اعتراضات اور اشکالات کا پیرہن تبدیل کرنا پڑتا تھا، مکہ میں بعض یہودی اور عیسائی غلام موجود تھے؛ غالباً وہ لوگوں

کوتورات وغیرہ کے بعض واقعات بھی کبھی کبھی سنایا کرتے تھے، رازی قرطبی اور زمخشری نے اس سلسلہ میں تین غلاموں حویطب بن عبدالعزی کے غلام عداس، علاء بن حضرمی کے غلام یسار اور ابوفکیہہ رومی کا ذکر کیا ہے، جو آپ کے دعویٰ نبوت کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے اور اسی نسبت سے قبول اسلام کے بعد آپ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے، اہل مکہ میں سے نضر بن حارث نے اس واقعہ کو لے کر یہ پروپگنڈا بھی کرنے کی سعی کی کہ آپ ان ہی اہل کتاب سے سیکھ کر قرآن مجید کی تصنیف فرماتے ہیں،(۱) مگر یہ اعتراض اس درجہ غلط اور نا قابل قبول تھا کہ خود اہل مکہ نے اس کو قبول نہیں کیا اور لوگوں نے آپ کو ساحر و مجنون وغیرہ تو کہا اور مسحور بھی قرار دیا، مگر اس اعتراض کو نہ دہرایا۔

غرض کہ اس کے باوجود کہ اہل مکہ آپ پر اعتراض کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتے تھے، انھوں نے ان راہبوں سے ملاقات کو اپنے اعتراض کی بنیاد نہیں بنایا اور قرآن کو ان کی تعلیمات کا نتیجہ قرار نہیں دیا، غالباً وہ موجودہ زمانہ کے ''منصف مزاج'' مغربی علماء سے زیادہ حقیقت پسند تھے اور اگر اس عہد کے مستشرقین نادانستہ اس طرح کے اعتراض کر رہے ہیں تو ان سے زیادہ اصحاب دانش بھی کہ وہ اس بات کا بخوبی شعور رکھتے تھے کہ کسی فکر کا اس درجہ گہرا اثر قبول کرنے کے بعد (جس نے اس کو گرد و پیش پھیلی ہوئی دنیا سے باغی بنا دیا ہو) پندرہ بیس سال کی طویل مدت اظہار خیال سے باز نہیں رہا جا سکتا۔

اسلامی تعلیمات اور عیسائیت کا تقابلی مطالعہ

اب میں تیسرے نکتہ کی طرف آتا ہوں، کوئی تحریک کسی اور تحریک اور اس کے لٹریچر سے تاثر کے نتیجہ میں اُبھری ہو تو چند باتیں ضرور پائی جائیں گی، اول: یہ کہ دونوں کے تصورات میں قابل لحاظ حد تک یکسانیت ہو، دوسرے: واقعات کے بیان میں دونوں کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی ہو، تیسرے: ایک لٹریچر جو دوسرے لٹریچر سے ماخوذ ہو، وہ پہلے لٹریچر کی تلخیص تو ہو سکتا ہے؛ لیکن وہ اس کے بیان کئے ہوئے تاریخی حقائق میں اضافہ نہیں کر سکتا۔

اب غور کیجئے کہ عیسائیت اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات میں کس قدر تفاوت ہے؟ اسلام میں اعتقادات کی اساس توحید ہے اور عیسائیت میں تثلیث، اسلام میں جزا و سزا کا مدار صرف اعمال صالحہ پر ہے، جس کا حساب قیامت کے بعد ہوگا، عیسائیت میں جزا و سزا کے تصورات کا ایک اہم رکن کفارہ کا عقیدہ ہے، اسلام خدا کے لئے توالد و تناسل کے عقیدہ کا سخت مخالف ہے، عیسائیت کی اساس حضرت مسیح کو خدا کا فرزند تسلیم کرنے پر ہے۔

---

(۱) مفاتیح الغیب: ۲۴/۵۰، کشاف: ۳/۸۸، الجامع لاحکام القرآن: ۷/۳۔

قرآن مجید میں بہت سے واقعات ایسے ضرور ہیں کہ بائبل میں بھی ان ذکر موجود ہے اور ایسا ہونا فطری تھا؛ اس لئے کہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے؛ لیکن چوں کہ بائبل انسانی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکی اور اس کے بہت سے مضامین میں خدا ناترس لوگوں نے تحریف کردی تھی؛ اس لئے ایسے مواقع پر قرآن بائبل کے بیان سے اختلاف کرتا ہے، مثلاً گوسالہ پرستی کے واقعہ میں حضرت ہارون علیہ السلام کو بری قرار دیتا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کی حیات طیبہ پر جوغبار ڈالا گیا تھا، اس کو صاف کرتا ہے، حضرت مسیح کے صلیب پر چڑھائے جانے کی تردید کرتا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک پاکیزہ اور پاکباز پیغمبر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور اس طرح کے بہت سے مضامین ہیں کہ ان میں بائبل اور قرآن مجید کے بیان میں اختلاف نمایاں ہے۔

قرآن مجید بعض ایسے تاریخی حقائق سے بھی پردہ اُٹھاتا ہے کہ بائبل ان کے بارے میں خاموش ہے، مثلاً سورہ بقرہ کے شروع میں گائے والا واقعہ، اصحاب کہف کا واقعہ اور احسن القصص حضرت یوسف علیہ السلام کی مفصل عبرت خیز داستان وغیرہ، یہ تمام شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ پیغمبر اسلام کی نبوت اور آپ کی تعلیمات میں سوائے وحی الٰہی کے کوئی اور محرک اور موثر کارفرما نہیں تھا، مگر افسوس کہ علماء مغرب کھلے دلوں پیغمبر اسلام کی نبوت کی صداقت پر غور کرنے اور حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرنے کی بجائے اپنی بحث وتحقیق کی پوری بنیاد ہی اس مفروضہ پر اُٹھاتے ہیں کہ آپ نبی نہیں تھے اور پھر اس حقیقت ناشناسی کو ''حقیقت'' اور جھوٹ '' کو سچ'' ثابت کرنے کے لئے ایسے دوراز کار، اور ناقابل فہم اسباب ووجوہ بیان کرتے ہیں کہ عقل ودانش خندہ زن اور جبین انصاف عرق آلود ہوئے بغیر نہ رہے۔

مگر اہل ایمان کے لئے یہی انکار عین زیادت ایمان اور کمال ایقان کا باعث ہے، اہل علم کی طرف سے ایسی حقیقت ناشناسی ان کو یقین دلاتی ہے کہ علم کے باوجود گمراہی کی جو اطلاع قرآن مجید نے پیغمبر اسلام کے معاصر اہل کتاب کے بارے میں دی تھی، مسلمان ہمیشہ اس کی صداقت وواقعیت کا بہ چشم سر مشاہدہ کرسکتے ہیں :

اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ ۔(الجاثیہ:۲۳)

● ● ●

پیغمبر اسلام ﷺ اور یہود

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اور اُسوۂ حیات کو اسلام میں اساس و بنیاد کی حیثیت حاصل ہے؛ چوں کہ اسلام کو ابد تک باقی رہنا تھا؛ اس لئے قدرت کی طرف سے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ، آپ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ، آپ ﷺ کی زندگی کی ایک ایک ساعت، ایک ایک صبح اور ایک ایک شام کی حفاظت کا ایسا حیرت انگیز اور تعجب خیز نظم کیا گیا کہ آپ ﷺ کی پوری سیرت مکمل روشنی میں ہے اور ایسی بے داغ ہے کہ کسی کو کہیں انگلی رکھنے کا موقع نہیں ہے؛ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ معاندین اسلام نے ہمیشہ سب سے زیادہ آپ ﷺ ہی کی ذات قدسی صفات کو ہدف بنایا ہے اور اس کے لئے علم و تحقیق کے دامن کو تحریف و تصحیف سے داغ دار کرنے میں بھی کچھ پس و پیش نہیں کیا گیا۔

سیرت نبوی ﷺ پر علی العموم مستشرق اہل قلم نے جو اعتراضات کئے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا، وہ غیر منصفانہ اور غیر انسانی تھا، آپ ﷺ نے اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ تشدد کی راہ اختیار کی، پھر اس کی دلیل میں بنوقینقاع اور بنونضیر سے جنگ اور ان کی جلاوطنی، نیز بنوقریظہ کی سزائے موت کے واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ اس پر غور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اولاً قوم یہود کی تاریخ اور ان کی عادات و اخلاق پر بحیثیت مجموعی ایک نظر ڈال لی جائے، جس سے ان کے قومی مزاج اور نفسیات کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور اندازہ ہو سکے گا کہ اپنے سماج اور پڑوسی کے ساتھ ان کا رویہ کس طرح کا ہوتا ہے؟ دوسرے: اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ مدینہ میں جو یہود آباد تھے، وہ یہاں کس طرح آئے اور اپنے عرب پڑوسیوں کے ساتھ ان کا کیا رویہ رہا؟ تیسرے: مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان آویزش اور جنگ کی نوبت کن حالات میں آئی؟ اور آپ ﷺ نے جو اقدام کیا، وہ اخلاق، مذہب اور مہذب قانون جنگ کی رو سے صحیح تھا یا غلط اور منصفانہ تھا یا غیر منصفانہ؟

تاریخِ یہود کے مآخذ

غالب گمان ہے کہ ''یہود'' کی نسبت حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے ''یہوداہ'' کی طرف ہے،

افسوس کہ یہود کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے قرآن مجید کے سوا کوئی اور مستند اور قابلِ بھروسہ ذریعہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے، تاہم ان کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ خود بائبل کا عہدِ عتیق ہے، جو یہود کے نزدیک وحی الٰہی ہے اور اپنی صحیح روح کے ساتھ محفوظ ہے، اس کے بعد دوسرا ذریعہ تورات کی شرح اور یہودی قانون کی سب سے اہم کتاب ''تالمود'' ہے، تیسرا ذریعہ بائبل کے ''عہدِ جدید'' کا حصہ ہے جو حضرت مسیح کے دور میں یہودی اخلاقیات کو ظاہر کرتی ہے اور اس کا نمونہ پیش کرتی ہے، چوتھا اور سب سے مستند ماخذ ''قرآن مجید'' ہے، جس میں جستہ جستہ بنی اسرائیل کے واقعات بیان کئے گئے ہیں، ہم تو قرآن کو ''وحی الٰہی'' ہی مانتے ہیں ؛ لیکن اس سے صرف نظر کر کے خالص تاریخی اعتبار سے بھی یہ ایک اہم ذریعہ ہے ؛ کیوں کہ یہود کے سامنے قرآن مجید نازل ہوا اور پڑھا گیا ؛ لیکن یہودیوں کو اس سے انکار اور تردید کی ہمت نہ ہوئی۔

انبیاء کے ساتھ سلوک

بائبل کے ادنیٰ مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہود شروع سے تین قومی بیماریوں میں مبتلا رہے ہیں: (۱) انبیاء اور رسولوں کے ساتھ گستاخی اور بدسلوکی ، (۲) اعتقادی بگاڑ ، (۳) اخلاقی وسماجی پستی ـــ انبیاء کے ساتھ بدسلوکی اور معاندانہ رویہ کا صرف بائبل میں اس کثرت سے ذکر ہے کہ ان سب کا اکٹھا ذکر کیا جائے تو ایک کتاب ہوجائے، یہاں بائبل کے دونوں حصوں سے چند نمونے ذکر کئے جاتے ہیں، تورات میں ہے :

- انھوں نے خداوند کے پیغمبروں کو ٹھٹھوں میں اُڑایا اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا اور اس کے نبیوں کی ہنسی اُڑائی ، یہاں تک کہ خداوند کا غضب اپنے لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا۔(۱)
- تمہاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کی طرح تمہارے نبیوں کو کھا گئی۔(۲)
- وہ نافرمان ہوکر تجھ سے باغی ہوئے اور انھوں نے تیری شریعت کو پیٹھ پیچھے پھینکا اور تیرے نبیوں کو جو ان کے خلاف گواہی دیتے تھے ؛ تا کہ ان کو تیری طرف پھرا لائیں، قتل کیا اور انھوں نے غصہ دلانے کے لئے بڑے بڑے کام کئے۔(۳)

ایک دو نمونے عہد جدید سے بھی ملاحظہ ہوں :

- اے گردن کشو تمہارے دل اور کان دونوں نامختون ! تم ہر وقت روح القدس کی

(۱) تواریخ:۳۶:۱۶۔ (۲) یرمیاہ:۲:۳۰۔ (۳) نحمیاہ:۹:۲۶۔

مخالفت کرتے ہو، جیسے تمہارے باپ دادا کرتے تھے، ویسے ہی تم بھی کرتے ہو، نبیوں میں سے کس کو تمہارے باپ دادا نے نہیں ستایا؟ انھوں نے تو اس راست باز کے آنے کی پیش خبری دینے والوں کو قتل کیا اور اب تم اس کے پکڑنے والے اور قاتل ہوئے۔(۱)

● اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو اور کہتے ہو، اگر ہم اپنے باپ دادا کے زمانہ میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں اس کے شریک نہ ہوتے، اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو، غرض اپنے باپ دادا کا پیمانہ بھر دو، اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچوگے، اس لئے دیکھو، میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں، ان میں سے تم بعض کو قتل اور مصلوب کروگے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے ماروگے اور شہر بہ شہر ستاتے پھروگے۔(۲)

یہود کی سرزمین مقدس یروشلم کو ان الفاظ میں مخاطب کیا گیا:

● اے یروشلم! اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتا اور جو تیرے پاس بھیجے گئے، ان کو سنگسار کرتا ہے۔(۳)

یہود بنیادی طور پر حضرت موسیٰ کی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں اور ان ہی کی شریعت کے متبع ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی نے ان کو فرعون اور اہل مصر کی غلامی سے نجات دلائی اور آزادی کی زندگی عطا فرمائی؛ اس لئے ان سے سب سے زیادہ حضرت موسیٰ کے احترام وتعظیم کی توقع کی جاسکتی ہے؛ لیکن خود حضرت موسیٰ کی شان میں قدم قدم پر اس قوم نے جو گستاخی اور بدسلوکی کی، وہ سامانِ عبرت ہے! —— مصر کی عبودیت اور غلامی کی زندگی سے نجات کے لئے بنی اسرائیل ایک نہیں دو نبیوں —— حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون —— کے ساتھ بحر قلزم کی طرف رواں ہیں اور سر کی آنکھوں سے مصر میں حضرت موسیٰ کے معجزات و برکات اور پیغمبر وقت کے ساتھ فساد وعداوت کی بنا پر قبطیوں پر خدا کے عذاب کا مشاہدہ کر چکے ہیں، مگر جونہی فرعون کا لشکر تعاقب میں آتا ہے، پائے ثبات میں تزلزل آجاتا ہے اور اپنے نبی سے اس طور مخاطب ہوتے ہیں:

(۱) اعمال:۷:۵۱،۵۲۔ (۲) متی:۲۳:۲۹،۳۵۔ (۳) متیٰ:۲۳:۳۷۔

کیا مصر میں قبریں نہ تھیں، جو تو ہم کو وہاں سے مرنے کے لئے بیابان میں لے آیا ہے، تو نے یہ ہم سے کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا، کیا ہم تجھ سے مصر میں بھی یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں؛ کیوں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہوتا۔(۱)

بحر قلزم عبور کرتے ہوئے خدا کی اس نشانی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے لئے سمندر کے بیچوں بیچ راہِ نجات بنتی ہے اور وہی راستہ فرعون اور اس کی قوم کے لئے ہلاکت وتباہی کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے، سمندر عبور ہو چکا ہے اور بنی اسرائیل تین دنوں سے بیابانِ شور میں ہیں، پانی کا کوئی چشمہ تین دنوں سے میسر نہیں آیا ہے، ایک چشمہ ملا تو وہ بھی کڑوے پانی کا، قوم کی فطرت پھر رنگ لائی اور بائبل کی زبان میں ''وہ لوگ موسیٰ پر بڑ بڑا کر کہنے لگے کہ ہم کیا پئیں؟'' (۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے پانی کا مسئلہ حل ہوا؛ لیکن اشیاءِ خوردنی کی قلت بنی اسرائیل کے لئے اب بھی قابلِ برداشت نہ تھی، اس لئے ہوا یوں کہ اس بیابان میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت موسیٰ اور ہارون پر بڑبڑانے لگی اور بنی اسرائیل کہنے لگے :

کاش، کہ ہم خداوند کے ہاتھ سے ملکِ مصر میں جب ہی مار دیئے جاتے، جب ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھ کر دل بھر روٹی کھاتے تھے؛ کیوں کہ تم تو ہم کو اس لئے لے آئے ہو کہ سارے مجمع کو بھوکا مارو۔(۳)

حضرت زکریا علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر نے جب ان کو نصیحت کی اور خدا کی طرف بلایا تو عین عبادت گاہ میں ان کو سنگسار کر دیا، (۴) تورات کا بیان ہے :

● تب خدا کی روح یہویدع کاہن کے بیٹے زکریاہ پر نازل ہوئی، سو وہ لوگوں سے بلند جگہ پر کھڑا ہو کر کہنے لگا: خدا یوں فرماتا ہے کہ تم کیوں خداوند کے حکموں سے باہر جاتے ہو کہ یوں خوش حال نہیں رہ سکتے؛ چوں کہ تم نے خداوند کو چھوڑ دیا ہے، اس نے بھی تم کو چھوڑ دیا، تب انھوں نے اس کے خلاف سازش کی اور بادشاہ کے حکم سے خداوند کے گھر کے صحن میں اسے سنگسار کرایا۔(۵)

---

(۱) خروج:۱۴:۱۱، ۱۳۔ (۲) خروج ۱۶:۲۴۔

(۳) خروج:۱۶:۲، ۳۔ (۴) حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بدبختوں نے آپ کو آرے سے دولخت کر دیا تھا، (المقاصد الحسنۃ:۱/۲۰۲، قرطبی:۱۰/۲۱۹) تاہم سنگسار کرنے کے تو گویا یہود اقراری مجرم ہیں۔

(۵) تواریخ ۲۴:۲۰، ۲۱۔

● حضرت یحییٰ علیہ السلام کی نبوت پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے تھے، مگر ان کی پیغمبری کی شناخت اور اس پر یقین کے باوجود ہوا یوں کہ ایک ادنیٰ رقاصہ ہیرودیس کی خواہش پر پہلے تو باندھ کر آپ کو قید خانہ میں رکھا اور پھر جب بادشاہ کی سال گرہ کے موقع سے جشن رقص وسرود منعقد ہوا اور اس رقاصہ نے اپنے فن کا مظاہرہ کر کے حاضرین اور خود بادشاہ کا دل جیت لیا تو حکم ہوا کہ آدھی سلطنت تک جو چاہے مانگ لے، یہ طلب گار ہوئی کہ حضرت یحییٰ کا سر ابھی ایک طشت میں میرے سامنے پیش ہو؛ چنانچہ ایک رقاصہ کی خواہش کے احترام میں ایک پیغمبر وقت کا سر مظلومانہ قلم کیا گیا اور ایک تھال میں کر کے اس بد بخت کی طبع خوں آشام کی سیری کی گئی۔(۱)

● عاموس نامی بزرگ جن کو تورات کے بیان کے مطابق نبوت ملی تھی، جب نہی عن المنکر کا فرض ادا کرنے کھڑے ہوئے، تو شاہ اسرائیل ''یربعام'' کو خود علماء یہود نے بہکایا اور نوبت بایں جارسید کہ آپ کو ملک بدر کر دیا گیا اور یہاں دعوتِ دین کی اجازت نہ دی گئی۔(۲)

حضرت مسیح پر ان ہی یہودی علماء نے ناحق مقدمہ کیا، ان کو باندھ کر حاکمِ وقت پیلاطس کے پاس لے گئے، آپ پر تھوکا، کوڑے لگوائے، سرکنڈے سے مارا، تمسخر کیا، یہ عید کا دن تھا، بالآخر حاکم نے پھانسی کا فیصلہ کیا؛ چوں کہ اس کو حضرت مسیح کی بے گناہی کا اندازہ تھا، اس لئے آخری بار پھر فقیہانِ یہود کی خوشامد کی کہ آج کے دن ایک مجرم کی سزائے موت معاف کی جاسکتی ہے، کہو تو مسیح کی جان بخشی کر دی جائے، ورنہ ''براتا'' ڈاکو کی، علمائے یہود نے اس نبی برحق کے مقابلہ ڈاکو کو معاف کر دیا، حاکم نے اب بھی ان سے عفو ودرگذر کی خواہش کی، مگر یہ کسی طور تیار نہ ہوئے، انجیل کا بیان ہے :

> جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا؛ بلکہ اُلٹا بلوا ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا: میں اس راست باز کے خون سے بری ہوں تم جانو، سب لوگوں نے جواب میں کہا: اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر، اس پر اس نے براتا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا کہ مصلوب ہو۔(۳)

---

(۱) ملاحظہ ہو: مرقس: ۶: ۱۷، ۱۹۔ (۲) عاموس: ۷: ۱۲، ۱۵۔ (۳) متی: ۲۷، ۲۴، ۲۷۔

اس طرح گویا یہود نے اپنے گمان کے مطابق حضرت مسیح کو نذر صلیب کر دیا۔(۱)

حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے ان محسنوں میں ہیں، جن کے اندر خدا نے نبوت اور حکومت کو جمع کر دیا تھا، تورات نے خود آپ کی بڑی توصیف کی ہے۔(۲)

حضرت داؤد علیہ السلام کی فرماں روائی کی وجہ سے یہود آپ کے خلاف کوئی اور سازش نہ کر سکے تو تورات کے محرفین نے ایک بدترین تہمت ہی آپ پر لگا دی کہ :

> شام کے وقت داؤد اپنی پلنگ پر سے اُٹھ کر بادشاہی محل کی چھت پر سے اس ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی اور وہ عورت نہایت خوبصورت تھی، اور داؤد نے لوگ بھیج کر اسے بلایا اور وہ اس کے بعد آئی اور اس نے اس سے صحبت کی، پھر وہ اپنے گھر چلی گئی اور وہ عورت حاملہ ہوئی۔(۳)

تورات میں یہ بھی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے پہلے اس پر پردہ ڈالنے کے لئے :

> ''حتی اور یاہ'' کو میدانِ جنگ سے بلوایا؛ تاکہ وہ اپنی بیوی سے ہم بستر ہو اور حمل کا الزام ان پر نہ رہے؛ لیکن جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ نہ سویا تو ایک تدبیر کر کے اس کو قتل کرا دیا۔(۴)

حضرت سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل کے عظیم الشان اور انصاف پرور فرماں رواؤں میں ہیں اور منصب نبوت پر سرفراز ہیں، آپ ہی نے حکم خداوندی سے ہیکل سلیمانی کی تعمیر فرمائی؛ چنانچہ تورات میں آپ کی بہت مدح وتوصیف کی گئی ہے؛(۵) لیکن ان ہی پیغمبر کے متعلق یہود نے یہ افسانہ طرازی کی کہ آپ اجنبی عورتوں سے صحبت کرنے لگے اور جب آپ بوڑھے ہوئے تو بیویوں نے آپ کے دل کو ''غیر معبودوں کی طرف مائل کر دیا'' (۶) گویا ——نعوذ باللہ—— آپ شرک میں مبتلا ہو گئے :

---

(۱) یہ یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ہے، یہی عقیدہ عیسائیوں کا بھی ہے، مگر اس اضافہ کے ساتھ کہ حضرت مسیح مدفون ہوئے اور تین دنوں کے بعد آسمان پر اُٹھا لئے گئے، قرآن کے نزول تک یہ معمہ حل نہ ہو سکا، قرآن مجید نے اس قضیہ کی عقدہ کشائی کی کہ جس شخص کو پھانسی دی گئی وہ مسیح نہ تھے؛ بلکہ آپ کی مخبری کرنے یا گرفتار کرنے کی نیت سے آنے والا شخص تھا، وہ قدرتِ خداندی سے بالکل مسیح کا ہم صورت کر دیا گیا اور صلیب پر چڑھا دیا گیا، آپ کو اس سے قبل ہی مع تن وروح اُٹھا لیا گیا تھا، قرب قیامت میں پھر آپ کا نزول ہوگا، یہ بات گو عجیب معلوم ہوتی ہے، مگر آپ کی پیدائش اور وجود کا کون سا مرحلہ ہے جو معجزہ نہ ہو اور انسان کی عقلِ کوتاہ کے لئے باعث تعجب نہ ہو، واللہ علیٰ کل شیٔ قدیر! (۲) دیکھئے: سموئیل، باب: ۷۔ (۳) سموئیل: ۱۱، ۲، ۵۔

(۴) دیکھئے: ۲ سموئیل، باب: ۱۱: ۳۔ (۵) ملاحظہ ہو: سلاطین: ۱/ ۲: ۶۔ (۶) دیکھئے: سلاطین: ۱/ ۱۱: ۳، ۴۔

حضرت ہارون علیہ السلام جن کو خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نبوت سے مشرف فرمایا اور دعوت توحید میں شریک کیا، خود ان پر بھی شرک وبت پرستی کی تہمت لگانے سے نہ چوکے اور کہا کہ انھوں نے ہی زیورات جمع کر کے طلائی گائے بنائی اور لوگوں کو اس کی پرستش کی دعوت دی۔(۱)

افسوس کہ اس قوم کی جسارت نے صرف معاصر انبیاء ہی کو ہدف نہ بنایا؛ بلکہ انبیاء ماقبل کے بارے میں بھی بہتان تراشی کی اور ان کی پاک زندگیوں کو داغ دار کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی، حضرت نوح علیہ السلام پر تہمت دھری کہ آپ نے شراب پی اور برہنہ ہو گئے، (۲) حضرت لوط علیہ السلام پر خود اپنی دو صاحبزادیوں کے ساتھ زنا اور اس کے ذریعہ دو بچوں ''موآب'' اور ''بنی عمی'' کی پیدائش کی تہمت باندھی، (۳) —— یہ چند نمونے ہیں انبیاء اور خدا کے پیغمبروں کے ساتھ قومِ یہود کے برتاؤ اور سلوک کے، جو مختلف عہد اور زمانہ سے متعلق ہیں اور جس سے یہ بات واضح ہے کہ انبیاء کے ساتھ بدسلوکی اور گستاخی اس قوم کے مزاج میں داخل ہے، اگر ایک ایسی قوم کسی غیر اسرائیلی نبی کے ساتھ گستاخی کرے اور اپنی قومی بداطواری کو روا رکھے تو ہرگز تعجب نہ ہونا چاہئے۔

اعتقادی بگاڑ

یہ بھی ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ یہود میں انبیاء ورسل کی کثرت کے باوجود اعتقادی بگاڑ ہر دور میں قائم رہا اور شرک وبت پرستی کے خلاف ہر نبی اور مصلح کو آواز اُٹھانی پڑی، جائے حیرت ہے کہ بنی اسرائیل ابھی فراعنہ مصر کے طوقِ غلامی سے آزاد ہوئے ہیں اور بحر قلزم عبور کر کے بیابانِ شور میں پہنچے ہیں، مصر میں قدم قدم پر خدا کی نشانیاں دیکھ چکے ہیں، پھر بحر قلزم عبور کرتے ہوئے ''رب اعلیٰ'' ہونے کا دعویٰ کرنے والے فرعون کی ہلاکت وتباہی ابھی آنکھوں میں ہے، یہ ساری آیات اللہ ایسی ہیں کہ ان میں سے ایک کا شہود وظہور بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کے لئے کافی ووافی ہے، مگر عین اس وقت جب شریعتِ الٰہی سے سرفرازی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جبلِ طور پر طلبی ہوتی ہے تو اسی خانہ بدوشی کی حالت میں ایک ایک کا زیور جمع کیا جاتا ہے اور ایک طلائی گائے تخلیق کی جاتی ہے، پھر اس کی پرستش کی جاتی ہے اور اسی پر قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں۔(۴)

---

(۱) خروج: ۲۳:۱، ۳۔ (۲) تکوین: ۲۰، ۲۱۔

(۳) انبیاء کرام کی ذات انسانیت میں سب سے بالاتر ہوتی ہے، وہ معصوم ہوتے ہیں اور من جانب اللہ گناہوں سے ان کی حفاظت ہوتی ہے، ان کی طرف ایسے شرمناک گناہوں کی از راہ نقل نسبت کرتے ہوئے بھی ایک صاحبِ ایمان کا کلیجہ منھ کو آتا ہے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں؛ لیکن یہاں ان کا ذکر محض اتمام حجت کے لئے ہے، ورنہ ہم مسلمان ان انبیاء کو ان تہمتوں سے یکسر بری اور بہت ہی اعلیٰ وارفع یقین کرتے ہیں، فدا اهم روحی وابی وامی —— قرآن پاک نے اپنا ایک وصف ''مصدقاً لما بین یدیه'' بتایا ہے کہ یہ پچھلوں کی تصدیق کرتا ہے، پس یہ قرآن کی شانِ تصدیق ہے کہ بائبل نے پیغمبروں پر جو جو تہمتیں لگائیں، قرآن پاک نے ان کی نفی کی اور ان کی برأت وپاکیزگی کی ایسی شہادت دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھنے کے باوجود تمام انبیاء ورسل پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔(پیدائش: ۱۹: ۳۰، ۳۷) (۴) دیکھئے: خروج: ۳۲: ۱، ۵۔

خدا کی طرف سے اس جرم کی پاداش میں حکم ہوا :

> تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر پھاٹک پھاٹک گھوم کر سارے لشکر میں اپنے بھائیوں اور اپنے ساتھیوں اور اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو؛ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے قریباً تین ہزار مرد کھیت آئے۔(۱)

کم سے کم قوم نے اس مواخذۂ خداوندی ہی کو یاد رکھا ہوتا، مگر ایسا بھی نہ ہوسکا، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی نفسیات کو سامنے رکھ کر پہلے ہی ارشاد فرمادیا تھا کہ :

- دیکھ تو اپنے باپ دادا کے ساتھ ہوجائے گا اور یہ لوگ اُٹھ کر اسی ملک کے اجنبی دیوتاؤں میں جن کے بیچ وہ جا کر رہیں گے، زنا کار ہوجائیں گے، اور مجھ کو چھوڑ دیں گے اور اس عہد کو جو میں نے ان کے ساتھ باندھا ہے، توڑ ڈالیں گے۔(۲)
- حضرت موسیٰ کے بعد حضرت یوشع کو بھی یہی نصیحت کرنی پڑی کہ اب تم اجنبی معبودوں کو جو تمہارے درمیان ہیں، دور کرو اور اپنے دل کو خداوند اسرائیل کے خدا کی طرف مائل کرو۔(۳)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شرک بنی اسرائیل میں جڑ پکڑتا چلا گیا، بائبل میں یرمیاہ نبی کے الہامات کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے عہد میں مشرک قوموں اور یہودیوں میں ادنیٰ فرق بھی باقی نہ رہ گیا تھا اور یہودی علماء اور پیشوا بھی اس میں مبتلا تھے، ارشاد ہوتا ہے :

> اور جان لے کہ یہ برا اور نہایت بے جا کام ہے کہ تو نے خداوند اپنے خدا کو ترک کیا اور تجھ کو میرا خوف نہیں،...... ہاں، ہر ایک اونچے پہاڑ پر اور ہر ایک درخت کے نیچے تو بدکاری کے لئے لیٹ گئی...... تو تو تیز رو اونٹنی کے مانند ہے جو ادھر ادھر دوڑتی ہے، مادہ گورخر کی مانند جو بیابان کی عادی ہے، جو شہوت کے جوش میں ہوا کو سونگھتی ہے،(۴) ......جس طرح چور پکڑا جانے پر رسوا ہوتا ہے، اسی طرح اسرائیل کا گھرانہ رسوا ہوا، وہ

---

(۱) خروج:۲:۳۲-۲۶،۲۷۔ (۲) استثناء:۱۶:۳۱۔ (۳) یشوع:۲۳:۲۴۔

(۴) بائبل کی یہ اور اس طرح کی عبارتوں میں بدکاری سے مراد بت پرستی ہے، گویا شرک کو ''زنا'' قرار دیا گیا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی ایک حدیث میں شرک کی شناعت کو زنا سے سمجھایا ہے اور بتایا ہے کہ ایک غیرت مند شوہر کو اپنی بیوی کی بدچلنی پر جتنی غیرت آتی ہے، خدا کو اپنے بندوں کے مبتلائے شرک ہونے پر اس سے زیادہ غیرت آتی ہے۔(مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۸۱۹۳)

> اور اس کے بادشاہ اور امراء اور کاہن اور نبی،(۱) جو لکڑی سے کہتے ہیں کہ تو میرا باپ ہے اور پتھر سے کہ تم نے مجھے جنم دیا؛ کیوں کہ انھوں نے میری طرف منھ نہ کیا؛ بلکہ پیٹھ کی۔(۲)

حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے یہودی مملکت دو حصوں میں منقسم تھی اور ایک اسرائیل اور دوسری یہود یہ سے موسوم تھی، یہ دونوں ہی اپنی بت پرستی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لئے کوشاں تھے —— یرمیاہ کے صحیفہ میں اس طرح خطاب کیا گیا ہے :

> کیا تو نے دیکھا، برگشتہ اسرائیل نے کیا کیا ہے، وہ ہر ایک اونچے پہاڑ پر اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے گئی اور وہاں بدکاری کی، اور جب یہ سب کچھ کر چکی تو میں نے کہا: وہ میری طرف واپس آئے گی، پر وہ نہ آئی...... جب برگشتہ اسرائیل کی زناکاری کے سبب سے میں نے اس کو طلاق دیدی اور اسے طلاق نامہ لکھ دیا تو بھی اس کی بے وفا بہن یہوداہ نہ ڈری؛ بلکہ اس نے بھی جا کر بدکاری کی، اور ایسا ہوا کہ اس نے اپنی بدکاری کی برائی سے زمین کو ناپاک کیا اور پتھر اور لکڑی کے ساتھ زناکاری کی۔(۳)

بنی اسرائیل کی مشرکانہ حرکتوں نے کہیں کہیں طرز تخاطب میں بہت شدت کا رنگ پیدا کر دیا ہے، تورات کا بیان ہے :

> تو نے بہت سے یاروں کے ساتھ بدکاری کی ہے ...... پہاڑوں کی طرف اپنی آنکھیں اُٹھا اور دیکھ، کون سی جگہ ہے جہاں تو نے بدکاری نہیں کی ...... تیری پیشانی فاحشہ کی ہے اور تجھے شرم نہیں آتی۔(۴)

اخلاقی بگاڑ

یہود کی تاریخ اور ان کے صحائف پر نظر ڈالی جائے تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اخلاقی برائیاں بھی پوری طرح ان کے اندر سرایت کر چکی تھیں، تورات کے عہد عتیق میں اس کثرت سے بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کا ذکر ہے کہ ان کا احاطہ آسان نہیں، حزقی ایل بنی کے ایک خطاب میں ان کا اجمالی ذکر موجود ہے، فرماتے ہیں :

---

(۱) یہاں ''نبی'' سے جھوٹے مدعیانِ نبوت مراد ہیں، بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایسے مدعیانِ نبوت کی بھی کثرت تھی اور چوں کہ سلسلہ نبوت باقی تھا؛ اس لئے ان کی شناخت بہت مشکل تھی —— غرض اس حمام میں سبھی...... ایک جیسے نظر آتے ہیں۔

(۲) یرمیاہ:۲:۱۹، ۲۷۔ (۳) یرمیاہ:۳:۲-۱۰۔ (۴) یرمیاہ:۳۰۔

خداوند یوں فرماتا ہے کہ اے شہر تو اپنے اندر خون ریزی کرتا ہے — اور تو اپنے واسطے بتوں کو اپنے ناپاک کرنے کے لئے بناتا ہے — تیرے اندر انھوں نے ماں باپ کو حقیر جانا ہے، تیرے اندر انھوں نے پردیسیوں پر ظلم کیا، تیرے اندر انھوں نے یتیموں اور بیواؤں پر ستم کیا ہے، تو نے میری پاک چیزوں کو ناچیز جانا اور میرے بستیوں، (۱) کو ناپاک کیا، تیرے اندر وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کر کے خون کرواتے ہیں اور تیرے اندر وہ ہیں جو بتوں کی قربانی سے کھاتے ہیں، تیرے اندر وہ ہیں جو فسق وفجور کرتے ہیں، تیرے اندر وہ بھی ہیں جنھوں نے اپنے باپ کی حرم شکنی کی، تجھ میں انھوں نے اس عورت سے جو ناپاکی کی حالت میں تھی، مباشرت کی، کسی نے دوسرے کی بیوی سے بدکاری کی اور کسی نے اپنی بہو سے بدذاتی کی اور کسی نے اپنی بہن — اپنے باپ کی بیٹی کو — تیرے اندر رسوا کیا، تیرے اندر انھوں نے خون ریزی کے لئے رشوت خواری کی، تو نے بیاج اور سود لیا اور ظلم کر کے اپنے پڑوسی کو لوٹا اور مجھے فراموش کیا۔ (۲)

یسعیاہ قوم یہود کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

خطاکار گروہ، بدکاری سے لدی ہوئی قوم، بدکرداریوں کی نسل، مکار اولاد۔ (۳)

زنا کا ایسا عموم تھا کہ پیشوایانِ مذہب کے لڑکے عبادت کے لئے آنے والی عورتوں سے ہم آغوشی کرتے۔ (۴)

اخلاقی سطح اس درجہ گر چکی تھی کہ کسی کے یہاں مہمان آتا تو لوگ فعل خلافِ فطرت کے لئے ٹوٹ پڑتے، ایک ایسے ہی واقعہ میں آخر نو وارد مہمان کو اپنی حرم کو اوباشوں کے حوالہ کرنا پڑا اور یہ اوباش بائبل کے الفاظ میں :

● ساری رات صبح تک اس کے ساتھ بدذاتی کرتے رہے، اور جب دن نکلنے لگا تو اس کو چھوڑ دیا۔ (۵)

---

(۱) ہفتہ کے دن کو ''سبت'' کہتے ہیں، بنی اسرائیل کی شریعت میں یہ دن عبادت کے لئے مخصوص تھا اور کسب معاش کی اجازت نہ تھی، مگر بنی اسرائیل اس کی پروا نہ کرتے تھے، بعض کھل کر اس حکم کی بے حرمتی کرتے، اور بعض اس کے لئے حیلے اختیار کرتے، قرآن مجید کے بیان کے مطابق اسی جرم میں ایک گروہ بنی اسرائیل کی صورتیں مسخ کر دی گئی تھیں۔

(۲) حزقی ایل: ۲۲: ۳، ۱۲۔ (۳) یسعیاہ ۱: ۴۔

(۴) سموئیل: ۲: ۲۲۔ (۵) قضاۃ ۲: ۲۵۔

غالباً یہی اخلاقی برائی تھی، جس کی بنا پر بنی اسرائیل نے بعض انبیاء اور ان کی اولاد کی طرف ایسی گھناؤنی اخلاقی برائیوں کی نسبت کی کہ طبع سلیم کسی طور اس کو گوارا نہیں کرتی، یہاں تک کہ ''یہوداہ'' جن کی طرف یہود اپنا انتساب کرتے ہیں، ان کو بھی نہیں بخشا گیا، کہ انھوں نے اپنی بہو سے زنا کیا تھا۔(۱)

بائبل اور تالمود کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سماجی اعتبار سے زنا، معاشی اعتبار سے سود اور مذہبی اعتبار سے مصنوعی مذہبیت ——جس کو حضرت مسیح نے ''اونٹوں کے نگلنے اور مچھروں کے چھاننے'' سے تعبیر فرمایا ہے—— قوم یہود کا خاص مزاج ہے۔

یہود حجاز ویمن میں

یہودیوں کی سرگرمیوں کا اصل مرکز مصر و فلسطین رہا ہے، مصر و فلسطین کے سرسبز وشاداب علاقوں کو چھوڑ کر حجاز کے بیابان میں یہود کیوں کر آئے اور یثرب میں کس طرح آباد ہوئے؟ اس سلسلہ میں مؤرخین سے دو طرح کی روایتیں منقول ہیں: ایک یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں قوم عمالقہ کے کچھ لوگ حجاز کے علاقہ میں آباد تھے، ان کی سرکوبی کے لئے بنی اسرائیل کے ایک قافلہ کو آپ نے یہاں روانہ کیا، ان حضرات نے عمالقہ کا خاتمہ کرنے کے بعد ان کے ایک خوبرو شاہزادہ کی جان بخشی کر دی اور اس کو ساتھ لے کر شام پہنچے، اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہو چکا تھا؛ چنانچہ بنی سرائیل نے اِن لوگوں کے اس جرم کو اتنا سنگین تصور کیا کہ ان کو وہاں بسنے کی اجازت بھی نہ دی (فلا نوویکم) ناچار یہ حجاز کو واپس آ گئے اور وہیں بود و باش اختیار کر لی، یہ ابوالفرج اصبہانی کی روایت ہے جو اغانی میں نقل کی گئی ہے، مگر محققین کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، سہیلی کا بیان ہے: ''لا احسب هذا صحيحاً'' (۲)—— یہ بات دو وجوہ کے تحت قرین قیاس نہیں، اول: اس لئے کہ بنی اسرائیل کی جنگ عمالقہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات میں ہوئی ہی نہیں؛ بلکہ آپ کے جانشین یوشع علیہ السلام کے عہد میں ہوئی ہے، دوسرے: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عمالقہ کے علاقہ حجاز میں فرماں روائی کے دور میں خاصا فرق ہے۔

دوسری رائے ہے کہ بخت نصر نے جب فلسطین و شام کے علاقہ پر قبضہ کیا، پوری اسرائیلی مملکت کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور چن چن کر یہودیوں کا قتل عام کیا، اس وقت یہودیوں کے ایک گروہ نے خیبر و مدینہ وغیرہ کی پناہ لی اور وہیں کے ہو رہے، (۳) یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے، اور عین ممکن ہے کہ یہودیوں کے اس علاقہ کے انتخاب کی وجہ یہ ہو کہ مشرکینِ عرب مذہبا بخت نصر سے قریب تھے اور اس لئے اس کی ہلاکت سامانیوں سے مامون تھے۔

---

(۱) پیدائش: ۳۸:۱۸۔ (۲) الروض الانف: ۱۶/۲۔ (۳) الروض الانف: ۱۶/۔

پھر مدینہ ہی سے یہودیت ''یمن'' کے علاقہ میں پہونچی، یمن کا ایک بادشاہ حجاز کی طرف سے گذرا اور مدینہ بھی آیا، بعض دوست قبائل نے بادشاہ سے یہودیوں کی بدسلوکی اور دوسرے باشندگان شہر کے ساتھ نا مناسب رویہ کی شکایت کی؛ چنانچہ بادشاہ نے احد کے سامنے پڑاؤ کیا، یہود کو طلب کیا اور تین سو پچاس افراد کو باندھ کر قتل کر ڈالا، (قتل منهم ثلاث مائة و خمسين رجلا صبرا) اس موقع سے ایک یہودی بزرگ نے بڑی منت سماجت کی اور بادشاہ کا دل ایسا جیتا کہ کایا پلٹ گئی اور خود بادشاہ نے یہودیت قبول کر لی۔(۱)

اب یہودیت یمن کا سرکاری مذہب بن گیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یمن اور عرب کے دوسرے علاقوں میں یہودیت نے ایک طاقتور شکل اختیار کر لی، گو یہودیت یمن میں حارث بن عمرو (جد امراء القیس) کے واسطہ سے پہنچی؛ لیکن ''ذونواس'' کے عہد حکومت میں اس کو ایسا رسوخ حاصل ہو گیا کہ ایک عیسائی راہب اور اس کی دعوت پر لبیک کہنے والے چند خدا پرستوں کو علانیہ نذر آتش کیا گیا، جن کا قرآن نے ''اصحابُ الاخدود'' کے عنوان سے ذکر کیا ہے، (۲) یہ بات قریب قریب تاریخی مسلمات میں ہے کہ انصار مدینہ سے پہلے ہی یہودیوں نے مدینہ میں توطن اختیار کیا تھا، انصار جو اصل میں ''یمن'' کے علاقہ میں آباد تھے، مشہور سیلاب (سیل العرم) کی تباہی کے بعد مدینہ آئے، (۳) اس کا نتیجہ تھا کہ یہود کو مدینہ میں ایک طرح کی بالادستی حاصل تھی اور معاشی، سماجی، سیاسی اور مذہبی ہر اعتبار سے ان کو اونچا سمجھا جاتا تھا۔

لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی جن اخلاقی کمزوریوں کا بار بار تورات نے ذکر کیا ہے، ہر چند کہ تاریخ کا سینہ ان کو محفوظ نہ رکھ سکا، مگر یہاں بھی وہ اپنے اسی مزاج و مذاق کے ساتھ فروکش رہے؛ چنانچہ ''فطیون'' نامی یہود کا رئیس اعظم اس بے شرمی پر اُترا ہوا تھا کہ اوس وخزرج یا خود یہود کی کسی لڑکی کا نکاح ہوتا تو شوہر سے یکجائی سے پہلے یہ شخص اس کے ساتھ شب باشی کرتا، پھر وہ اپنے اصل شوہر کے پاس جاتی، یہ ایسا معمول بن چکا تھا کہ غالباً اس کی قباحت اور شناعت بھی باشندگان شہر کے ذہن سے رخصت ہو چکی تھی، مگر عرب کی نسلی غیرت رنگ لائی اور خزرج کے مالک بن عجلان نامی ایک شخص کی غیرت مند بہن نے خواتین یثرب کی آبرو کے اس غارت گر کو کیفر کردار تک پہنچایا۔

واقعہ یوں ہوا کہ مالک کی بہن کا نکاح ہوا، وہ قوم کی مجلس سے اس بے حجابانہ انداز سے گذری کہ اپنے کپڑے پنڈلیوں سے اوپر اُٹھا رکھے تھے، مالک کو یہ ناگوار گذرا اور بہن پر خفگی ظاہر کی، بہن اسی موقع کی منتظر تھی،

(۱) بلوغ الارب فی معرفة احوال العرب: ۲/۲۴۰۔

(۲) بلوغ الارب فی معرفة احوال العرب: ۲/۲۴۰۔

(۳) الروض الانف: ۲/۱۶۔

اس نے کہا: یہ کیا ہوا؟ اس سے بڑھ کر تو وہ مرحلہ ہوگا کہ میں اپنے شوہر کی بجائے ''رئیس شہر'' کے ساتھ شب بسری کروں گی، بہن نے بھائی کے تار دل کو صحیح وقت پر چھیڑا تھا؛ چنانچہ مالک ایک خاموش تدبیر کے ذریعہ عورتوں کے ساتھ خود بھی زنانہ لباس میں حجرہ خلوت میں جا گھسا اور اس بے شرم انسان کو پایہ انجام تک پہنچا کر شام کو راہ فرار اختیار کی، نیز شاہ غسان کے ایک ذی اثر مصاحب —— جو خود بھی خزرجی تھا —— ابوجُبَیلۃ سے یہ داستان کہہ سنائی اور کہا کہ اب حجاز واپسی کی ہمت نہیں؛ چنانچہ ابوجبیلہ مالک کے ساتھ یثرب آیا، سرداران یہود کو جمع کیا اور ایک ایک کا سر قلم کر دیا، اس واقعہ کے بعد پانسہ پلٹ چکا تھا اور اب مدینہ پر سیاسی غلبہ اوس وخزرج کو حاصل ہوگیا۔(۱)

مگر ان سب کے باوجود یہود نے اوس وخزرج کو باہم لڑا کر سیاسی اعتبار سے اور سودخواری نیز زرخیز نخلستانوں پر قبضہ کے ذریعہ معاشی اعتبار سے بتدریج پھر اپنا ایک مقام بنالیا تھا اور آسمانی کتاب کے حامل ہونے کی وجہ سے لوگ مذہبی اعتبار سے بھی ان کو قدر واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے، یہاں تک کہ عورتیں نذر مانتی تھیں کہ ان کے بچے زندہ رہ گئے تو انھیں یہودی بنائیں گی :

وکان من نساءھم من تنذر اذا ولدت إن عاش ولدھا ان تھودہ لأن الیھود عندھم کانوا اھل علم وکتاب ۔ (۲)

چنانچہ اگر چہ کہ یہودیت ایک نسلی مذہب ہے، جو بنی اسرائیل تک محدود ہے، تبلیغی ودعوتی مذہب نہیں، پھر بھی قبائل اوس وخزرج میں بہت سے لوگوں نے بطور خود یہودیت اختیار کر لی تھی؛ چنانچہ ابن ہشام نے اسلام کی مخالفت میں سرگرم جن رؤساء یہود کا ذکر کیا ہے، ان میں سے اکثر قبائل عرب سے تعلق رکھتے تھے۔(۳)

یہود اور مسلمانانِ مدینہ

یہود چوں کہ ایک الہامی مذہب کے حامل تھے اور فی الجملہ توحید کے قائل تھے؛ اس لئے فطری طور پر پیغمبر اسلام ﷺ بمقابلہ مشرکین کے اہل کتاب —— یہود ونصاریٰ —— کو اچھی نظر سے دیکھتے تھے؛ چنانچہ شریعت نے کتابی عورت سے نکاح اور ان کے ذبیحہ کو جائز قرار دیا ہے، (المائدۃ: ۵) یہود عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے، آپ ﷺ نے بھی اس کو مسنون قرار دیا، یہودی نعش کے گذرنے پر آپ ﷺ کھڑے ہوئے، مسلمانوں نے توجہ دلائی کہ یہ یہودی کی نعش ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ بھی انسان ہے، مدینہ آنے کے بعد جب تک قبلہ کے متعلق صریح حکم نازل نہ ہوگیا اور آپ ﷺ کے اجتہاد پر موقوف رہا، آپ ﷺ نے بیت المقدس کو قبلہ بنایا، مدینہ میں یہود کے مدرسہ ''بیت المدارس'' کو آپ ﷺ بنفس نفیس تشریف لے گئے، (۴) ایک اسی پر موقوف نہیں، حدیث میں ہے کہ

(۱) الکامل لابن اثیر: ۱/ ۲۷۶، ذکر غلبہ الانصار علی المدینہ۔ (۲) الروض الانف: ۲/ ۲۴۔
(۳) ملاحظہ ہو، سیرت بن ہشام: ۲/ ۲۴۔ (۴) اسباب الواحدی: ۸۵۔

جن باتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی واضح حکم آپ ﷺ کو نہیں دیا جاتا، آپ ان میں اہل کتاب کی موافقت کو پسند فرماتے تھے :

كان يحب موافقة أهل الكتاب في مالم يؤمر فيه بشئي ۔ (۱)

اسی کا اثر تھا کہ مدینہ تشریف آوری کے بعد آپ نے جو بین قومی معاہدہ تحریر فرمایا، اس میں مسلمانوں اور مدینہ کے دوسرے قبائل کے ساتھ یہود کو بھی صراحتاً شریک رکھا، یہاں اس وثیقہ کے بعض فقروں کا نقل کیا جانا عین مناسب ہوگا :

وان اليهود ينفقون مع المؤمنين ما داموا محاربين وان يهود بني عوف أمة مع المؤمنين ، لليهود دينهم وللمسلمين دينهم مواليهم وانفسهم ، إلا من ظلم واثم ، فإنه لا يوتغ إلا نفسه ۔(۲)

پھر آپ ﷺ نے یہود کے ہر خاندان بنونجار، بنوعوف، بنوحارث، بنواوس، بنوقیلہ کا ایک کر کے ذکر فرمایا اور ان کو اس عہد میں شامل فرمایا، اس معاہدہ نے مسلمان اور یہود دونوں فریق پر نہ صرف امن اور بقاء باہم کی ذمہ داری رکھ دی؛ بلکہ مدینہ کی حفاظت اور اس کی حفاظت میں ایک دوسرے کی مدد واعانت کے بھی وہ پابند ہو گئے، اس کا تقاضا تھا کہ یہود صدق دل سے اس معاہدہ پر قائم رہتے اور توحید وحق کے اس پودے کو پروان چڑھنے دیتے، مگر یہ حد درجہ افسوس ناک بات ہے کہ پیغمبروں اور رسولوں کے ساتھ مخاصمت، تضحیک اور ایذاء رسانی کی ان کی پرانی خو نے پھر انگڑائی لی اور انبیاء بنی اسرائیل کے ساتھ انھوں نے جو کچھ کیا تھا 'زفرق تا بقدم' کسی فرق کے بغیر پھر ان کو دہرانا شروع کیا، جس کا اندازہ قرآن مجید کی ان آیات سے ہوتا ہے، جو یہودیوں سے متعلق خاص واقعات کی وجہ سے نازل ہوئی ہیں، یا ان احادیث سے جن میں یہودیوں کی اخلاقی حالت کا ذکر ہے، ان کے اس رویہ کا گہرا تعلق ان کے ایمان اور اعتقاد سے تھا، وہ کہا کرتے تھے کہ اگر آخرت میں ان کو عذاب ہوا بھی تو چند دنوں ہوگا، ان کا خیال تھا کہ دنیا کی کل عمر سات ہزار سال ہے، ہر ہزار سال کے بدلے آخرت میں صرف ایک دن کا یعنی سات دنوں کا عذاب ہوگا: ''لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً''۔(البقرہ:۸۰)(۳)

---

(۱) بخاری کتاب اللباس، حدیث نمبر: ۵۵۷۳۔

(۲) سیرت بن ہشام: ۱/ ۵۰۳۔

(۳) اسباب النزول للسیوطی: ۱۴۔

اللہ کی نشانیوں کے ساتھ تضحیک کا حال یہ تھا کہ کہتے کہ آپ پر ایمان ہم اس لئے نہیں لائیں گے کہ وحی لے کر جبرئیل علیہ السلام نازل ہوتے ہیں، جبرئیل علیہ السلام سے ہماری پرانی دشمنی اور میکائیل علیہ السلام سے دوستی ہے،(۱)(بقرہ:۹۷،۹۸)اپنے بارے میں اس درجہ خوش فہم تھے کہ کہتے تھے ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں: ''نحن أبناء الله واحباؤه'' (۲) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا پرانا مذاق شرک مشرکین عرب اور نصرانیوں کی محبت سے پھرعود کرآیا تھا؛ چنانچہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ حضرت عزیر کو''ابن اللہ''(خدا کا بیٹا) قرار دیتے تھے، قرآن کے اس بیان کی دوطرح تائید ہوتی ہے، ایک تو یہودیوں کی پوری تاریخ جس میں ہر زمانہ میں شرک کا اثر موجود ہے، دوسرے: قرآن کے اس علانیہ اظہار پر یہود کی خاموشی اور ان کا احتجاج نہ کرنا، عربی زبان میں''راعنا'' کے معنی ہیں، ہماری طرف توجہ کیجئے، صحابہؓ اپنی طرف آپ کی توجہ کے طلب گار ہوتے تو اسی کلمہ کے ذریعہ درخواست کرتے، عبرانی زبان میں یہ لفظ بُرے مفہوم میں آتا ہے؛ چنانچہ آپ کی مجلس میں آتے تو ''راعنا'' کہتے اور مضحکہ آمیز ہنسی ہنستے، حضرت سعد بن عبادہؓ نے جو ان کی زبان سے کسی قدر واقف تھے، اس کا احساس کیا اور یہودیوں سے ان کی اس تعبیر پر ناگواری ظاہر کی۔(۳)

علامہ بغویؒ نے سعد بن عبادہ کی بجائے سعد بن معاذؓ کا ذکر کیا ہے؛(۴) چنانچہ بالآخر آپ ﷺ پر قرآن نازل ہوا اور صحابہؓ کو بھی ایسی ذومعنین تعبیر اختیار کرنے کی بجائے''انظرنا''(میری طرف توجہ فرمایئے!) کہنے کا حکم فرمایا گیا،(۵) یہ حضور ﷺ سے ملتے تو''السلام علیکم'' کی جگہ ایک بددُعائیہ کلمہ''السام علیکم''(تم پر موت ہو) کہتے اور لفظی اشتباہ سے دھوکہ دیتے، آپ کمالِ حلم کے ساتھ صبر فرماتے اور'وعلیکم' کہنے پر اکتفا کرتے، حضرت عائشہؓ کے سامنے ایک یہودی نے اسی طرح کہا تو آخر آپ تاب نہ لاسکیں اور برا بھلا کہا۔(۶)

آپ نے ہمیشہ یہود کو سنجیدہ طور پر اسلام کی دعوت دینے کی کوشش کی، غزوہ بدر کے بعد آپ ﷺ نے تلقین کی کہ اہل مکہ کے انکار وکفر کی وجہ سے خدا کا ان پر جو عتاب ہوا، تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے؛ اس لئے تم اسلام قبول کرلو، مگر ان حضرات نے کوئی سنجیدہ جواب دینے کی بجائے کہا کہ ایک ناتجربہ کار اور جنگ سے ناآشا قوم پر فتح مندی تم کو غرور میں مبتلا نہ کردے،(۷) ایک اور موقع پر جب علماء یہود سے آپ کی گفتگو ہوئی اور آپ ﷺ نے

(۱) اسباب النزول للواحدی:۳۶۔ (۲) اسباب النزول للواحدی:۸۹۔ (۳) اسباب النزول للواحدی:۴۰۔
(۴) تفسیر بغوی:۱/۱۳۲۔ (۵) البقرہ:۱۰۴۔
(۶) ترمذی، باب ماجاء فی کراھیۃ التسلیم علی الذمی، حدیث نمبر:۲۷۰۱۔ (۷) مختصر ابن کثیر:۱/۲۶۸۔

فرمایا کہ میں دین ابراہیمی پر ہوں تو انھوں نے ایسا جواب دیا جو یکسر عقل اور واقعات کے خلاف تھا، یعنی یہ کہ ابراہیم بھی یہودی تھے۔(۱)

ہر وقت اس بات کے درپے تھے کہ انصار ومہاجرین اور انصار کے قبائل اوس وخزرج میں کسی طرح دوبارہ جنگ کی آگ بھڑک اُٹھے، ایک بار ایک سن رسیدہ یہودی شاسؔ بنؔ قیس اوس وخزرج کی جنگ کے رجز یہ اشعار سنا کر بالاخر فضاء کو گرم کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا اور فریقین کی طرف سے اسلحہ تک نکل آئے، آپ کی بروقت سعی وکوشش اور موعظت نے اس آگ کو خاکستر کر دیا۔(۲)

خدا کو تسلیم کرنے کے باوجود خدا کے ساتھ بھی ان کی جسارت حیرت انگیز تھی، قرآن میں ایک موقع پر لطیف پیرایہ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ خدا کے بندے، خدا کو قرض دیں یعنی خدا کے بندوں کی مدد کریں، یہ انفاق کی طرف توجہ دلانے کے لئے ایک ایسی لطیف تعبیر ہے کہ اصحاب دانش کو اس پر وجد آ جائے، مگر ایک یہودی عالم "فنحاص بن عازوراء" نے اسی کو خدا کے ساتھ گستاخی کی اساس بنالیا اور کہنے لگا: خدا غریب ومحتاج ہے اور ہم غنی ہیں کہ اس کو ہمارے قرض کی حاجت ہے؟ حضرت ابوبکرؓ آخر جوش حق میں اس کو برداشت نہ کر سکے اور اس کو طمانچہ رسید کر ہی دیا۔(۳)

اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کرتے، تورات میں آخری نبی کے سلسلہ میں جو علامتیں ذکر کی گئی ہیں، ان کو چھپاتے ان کی غلط تعبیر کرتے اور یہ سب محض اس لئے کہ عوام کے نذرونیاز کے دروازے ان پر بند نہ ہو جائیں۔(۴)

اس سازش کی بھی سعی کی گئی کہ کچھ یہود پہلے مصنوعی طور پر اسلام قبول کریں اور پھر مرتد ہو کر یہودیت کی طرف واپس آ جائیں؛ تاکہ دوسروں کو معلوم ہو کہ یہ دین حق نہیں ہے،(۵) ستم ظریفی کی انتہاء یہ ہے کہ بمقابلہ پیغمبر اسلام کے مشرکین کا ساتھ دیتے اور ان کے دین کو اسلام سے فائق وبرتر قرار دیتے،(۶) لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پر تعجب کا کوئی موقع نہیں کہ یہ ان کی مشرکانہ نفسیات کے عین مطابق تھا، حقیر وخسیس مقاصد کے لئے احکام الٰہی میں تحریف ان کے لئے معمولی بات تھی، مدینہ تشریف آوری کے بعد بارگاہ نبوی میں یہودیوں کے زنا کا ایک مقدمہ خود ان کی طرف سے فیصلہ کے لئے پیش ہوا، آپ ﷺ نے ان سے تورات کا حکم دریافت فرمایا تو کمال خیانت کے

---

(۱) اسباب النزول للواحدی:۸۵۔
(۲) اسباب النزول:۹۹۔
(۳) تفسیر قرطبی:۴/۲۹۴، اسباب النزول:۱۱۲۔
(۴) دیکھئے: اسباب النزول:۹۲۔
(۵) اسباب النزول للواحدی:۹۴، للسیوطی:۵۷۔
(۶) البدایہ والنہایہ:۴/۹۴۔

ساتھ علماء یہود نے رجم کے حکم کو ہاتھ سے ڈھک لیا، مگر ایک یہودی عالم (جو اَب دامن اسلام میں آچکے تھے) موجود تھے؛ انھوں نے بروقت ٹوکا اوران کے جھوٹ کی قلعی کھل گئی۔(۱)

مالی لین دین سود اور سود کے معاملہ میں قساوت قلبی اور غرباء کا استحصال ان کا خاص فن تھا، معمولی چیزوں کے لئے معصوم بچوں کا قتل کر دیتے اوران کا زیور چھین لیتے، یہودیوں کی اخلاقی گراوٹ کا یہ حال ہمیں کتاب وسنت سے معلوم ہوتا ہے جس سے زیادہ محفوظ کوئی اور ماخذ تاریخ ہمارے پاس موجود نہیں ہے، اس کے ساتھ کتاب وسنت کے بیان کردہ مواد کی تائید اسرائیل کی پوری تاریخی نفسیات موجود ہیں، جو خود بائبل کے بیانات سے ثابت ہیں اوران کے وہ مذہبی اُصول وقواعد ہیں، جن کا ''تلمود'' میں ذکر کیا گیا ہے، ان سطور سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ یہود کا کیا کچھ رویہ تھا؟

یہی وہ حالات تھے، جن میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان چار جنگیں ہوئی ہیں، غزوہ بنوقینقاع، بنونضیر، بنوقریظہ اور خیبر ـــــ اور خاص طور پر دو اہم رؤساء ـــــ کعب ابن اشرف اور سلام بن ابی الحقیق ـــــ قتل کئے گئے ہیں؛ چنانچہ اب ان میں سے ایک ایک پر علاحدہ گفتگو کی جاتی ہے :

کعب بن اشرف

کعب بن اشرف، یہودیوں کا ممتاز سردار تھا، اس کی ماں بنونضیر کی تھی اور باپ کا تعلق ایک عرب قبیلہ بنوطیؔ سے تھا۔(۲)

عرب اور یہود سے دوطرفہ رشتہ داری نے یقیناً اس کی حیثیت میں اضافہ کیا ہوگا، اہل سیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت متمول اور صاحب ثروت بھی تھا، قد وقامت کے لحاظ سے بھی وجیہہ تھا، شعروسخن میں درک رکھتا تھا اور قادرالکلام شاعر تھا، دولت کا یہ حال تھا کہ مختلف علمائے یہود کا اس کے یہاں سے وظیفہ مقرر تھا اور وہ اس وظیفہ خواری کی قیمت اس طرح ادا کرتے کہ ان علماء کو اس کی ہر صحیح اور غلط کی تائید کرنی ہوتی تھی، آپ ﷺ کی آمد کے بعد اس نے ایک دفعہ اپنے وظیفہ خوار علماء سے آپ کے دعویٰ نبوت کے بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے آپ کی صداقت کی شہادت دی، کعب کو یہ بات گوارہ نہ ہوئی اوران کو خالی ہاتھ لوٹا دیا، آخر اس حرص نے ان علماء احبار کو کذب بیانی پر آمادہ کیا اور آپ کی تکذیب کے بعد ہی ان کو مقررہ وظیفہ مل سکا۔(۳)

---

(۱) اسباب النزول للواحدی: ۱۶۰، تفسیر کبیر: ۱۱/۲۳۶۔

(۲) الدررلابن عبدالبر: ۱۵۰۔

(۳) زرقانی علی المواھب: ۲/۹۔

افسوس کہ اپنی دولت وثروت کے علاوہ شعر گوئی کی قوت کا استعمال بھی یہ ہمیشہ خلاف حق ہی کیا کرتا تھا، مسلمان خواتین پر عشقیہ اشعار کہتا کہ ان کو اذیت پہنچے،خود حضرت عباسؓ کی زوجہ اُم فضل کے بارے میں اہل سیر نے اس کا یہ شعر نقل کیا ہے :

أراحل أنت لم ترحل لمنعبته　　　وتارک أنت أم الفضل بالحرم (۱)

غزوہ بدر کی فتح کے بعد جب آپ نے مدینہ خوشخبری بھیجی اور روساء قریش کے قتل کی اطلاع نے مسلمانوں کو شاد کام کیا،کعب بن اشرف کے لئے اس سے زیادہ کوئی اطلاع تلخ کام نہ تھی، اس نے کہا اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو زمین کا اندرون (یعنی قبر) زمین کی پشت سے بہتر ہے:''لبطن الارض خير من ظهرها''(۲)اس نے اپنے اشعار میں خود پیغمبر اسلام ﷺ پر بھی ہجو کی اور اسی پر اکتفاء نہ کیا؛ بلکہ غزوہ بدر کے بعد اہل مکہ کو اشتعال دلانے، ان کی آتش انتقام کو بھڑکانے اور مسلمانوں کے خلاف نئے جوش وخروش کے ساتھ صف آراء کرنے کی غرض سے مکہ کا سفر کیا اور نہایت جذباتی اور اشتعال انگیز مرثیے کہے اور سنا سنا کر عربوں کی روایتی غیرت کو بھڑکایا۔(۳)

ابن ہشام نے کعب کے بعض مراثی کا ذکر کیا ہے،اس کے ایک مرثیہ کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :

طحنت رحى بدر لمهلک اهله　　　و لمثل بدر تستهل و تدمع (۴)

یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ عرب کے اس عہد کی شاعری کو آج کل کی شاعری پر قیاس نہ کرنا چاہئے، اس زمانہ میں شعر ہی سب سے بڑا مؤثر ذریعہ تشہیر تھا اور کسی قادر الکلام شاعر کا ایک شعر کسی شخص کی کردار کشی کے لئے اسی طرح کفایت کرتا تھا، جیسا کہ ہمارے دور میں صحافتی ذرائع سے شائع ہونے والی خبریں؛ چنانچہ کعب کی یہ ریشہ دوانی ضائع نہ گئی اور شاید اسی کے نتیجہ میں مسلمانوں کی اس چھوٹی سی عسکری قوت کو ایک ہی سال بعد مکہ کی ایک زبردست فوجی طاقت سے میدان اُحد میں نبرد آزما ہونا پڑا۔

ان اسباب کے علاوہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کعب نے بعض یہودیوں کو تیار کیا تھا کہ وہ آپ کو دعوت ولیمہ دیں اور اسی موقع سے آپ کا کام تمام کر دیا جائے،(۵) اور یہود کا آپ کے ساتھ جو رویہ تھا، اس کے تحت اس طرح کا اقدام قطعاً خلاف توقع اور نا قابل قیاس نہیں ہے۔

---

(۱) الروض الانف:۲/ ۱۲۳۔

(۲) زرقانی:۲/ ۱۰۔

(۳) طبقات بن سعد:۲/ ۲۱،القسم الاول۔

(۴) ابن ہشام:۲/ ۱۲۳۔

(۵) زرقانی علی المواهب:۲/ ۱۱۔

یہ عہد شکنی، مسلمان عورتوں کی بے آبروئی، آپ ﷺ کی ہجو اور اہل مکہ کے ساتھ تناصر اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانی کے باوجود اس پر کوئی اقدام نہ کرنا مدینہ کی چھوٹی سی مسلم آبادی کے تحفظ کے لئے زبردست خطرہ بن سکتا تھا؛ چنانچہ کعب کی مدینہ واپسی کے بعد آپ کی زبان مبارک سے یہ فقرہ نکلا :

اللهم أكفنى ابن الاشرف بما شئت في اعلانه الشر و قوله الاشعار (۱)

بعض مخلص صحابہ جن میں محمد بن مسلمہؓ پیش پیش تھے، اس مہم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت حسن تدبیر کے ساتھ اس مہم کو پایہ انجام تک پہنچایا اور کعب بن اشرف کو واصل جہنم کیا، اگرچہ کہ اس واقعہ کی تفصیل ذکر کرنی اس وقت مقصود نہیں ہے؛ لیکن اس واقعہ کا ایک پہلو ایسا ہے کہ جس سے کعب کی اخلاقی حیثیت واضح ہوتی ہے، محمد بن مسلمہ اپنے ساتھیوں کو لے کر کعب کے پاس قرض مانگنے کے بہانہ گئے اور ایک ایسا مبہم جملہ استعمال کیا، جس سے بظاہر آپ ﷺ کی مخالفت معلوم ہوتی تھی؛ تاکہ کعب کو مطمئن کیا جا سکے۔

اس موقع سے قرض کے لئے کعب نے سامان قرض کے طور پر سب سے پہلے جو چیز طلب کی، وہ یہ تھی کہ قرض خواہ اپنی عورتوں کو اس کے حوالہ کردیں، ان حضرات نے حسن تدبیر سے اس مطالبہ کو رد کردیا اور کہا کہ تم عرب کے خوبصورت ترین آدمی ہو، ہمیں خود اپنی عورتوں پر اطمینان نہیں، (۲) خراسانی کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ تم خوبصورت آدمی ہو اور عورتوں کے دلدادہ ہو، ''أنت رجل حسان يحب النساء'' (۳) اس سے کعب کی اخلاقی پستی کا اندازہ ہوتا ہے، خراسانی کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا واقعہ نہ تھا؛ بلکہ کعب کی عیاشی لوگوں میں معروف و مسلم تھی، ان تمام حالات کو سامنے رکھ کر کوئی بھی صاحب انصاف اندازہ کر سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ اقدام کس قدر منصفانہ اور واجبی تھا!

سلاّم بن ابی الحقیق

جن یہودیوں کو خاص طور پر قتل کرایا گیا، ان میں سے ایک سلام بن ابی الحقیق بھی ہے، جو ابورافع کے نام سے معروف تھا، غزوہ خندق کی آگ جن لوگوں نے بھڑکائی تھی اور مسلمانوں کے خلاف عرب کی پوری قوت کو یکجا کر دیا تھا، ان میں کعب بن اشرف کے بعد دوسری نمایاں شخصیت اسی سلام بن ابی الحقیق کی تھی، بنوقریظہ کی مہم کے بعد سلام کا خاتمہ ضروری ہوگیا تھا، جو اس وقت خیبر میں مقیم تھا اور جس سے اس امر کا خطرہ درپیش تھا کہ وہ جنگ بنوقریظہ کا انتقام لینے کی غرض سے مہم جوئی کرے اور مشرکین اور یہودیوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کردے۔

---

(۱) خداوندا! تو کعب بن اشرف کے علانیہ شر کی تشہیر اور شعر گوئی کے مقابلہ اپنی مشیت کے مطابق کافی ہوجا! (طبقات بن سعد: ۲/ ۲۱ القسم الاول)۔

(۲) طبقات بن سعد: ۲/ ۲۳۔ (۳) زرقانی علی المواہب: ۲/ ۱۲۔

ان ہی حالات کے پیش نظر قبیلہ خزرج کی شاخ بنوسلمہ کے لوگوں نے آپ ﷺ سے اس کے قتل میں پیش قدمی کی اجازت چاہی، آپ نے اجازت دی؛ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس مہم میں کسی بچہ یا عورت کا خون نہ ہونے پائے؛ چنانچہ ایک پانچ نفری قافلہ اس ارادہ سے خیبر گیا اور اس نے پیغمبر ﷺ کی ہدایت کا پورا پورا پاس ولحاظ کرتے ہوئے اس مہم کو انجام دیا اور سوائے ابورافع کے کسی اور پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔(۱)

غور کیا جائے تو مسلمانوں کا یہ اقدام بالکل واجبی اور مبنی بر انصاف تھا، غزوہ خندق کی آگ لگانے میں قائدانہ کردار ادا کر کے ابورافع نے اپنے لئے قتل کا مکمل جواز پیدا کر دیا تھا، پھر پچھلے تجربات کی روشنی میں یہ سوچنا بالکل قرین قیاس تھا کہ ایسے لوگوں کو اگر فرصت مل جائے تو یہ اس کو ضائع کئے بغیر کسی دوسری جنگ کی تیاری میں صرف کریں گے اور مدینہ کی اسلامی مملکت کی صیانت وسلامتی کے لئے زبردست خطرہ بن کر اُبھریں گے۔

بنوقَیْنُقَاع

یہودیوں میں ایک اہم قبیلہ ''بنوقینقاع'' کا تھا، زرگری اور تجارت ان کا ذریعہ معاش تھا،(۲) اس قبیلہ میں لڑنے والوں کی تعداد چھ سو تھی،(۳) یہودیوں کے دوسرے قبائل بنونضیر اور بنوقریظہ کا ان سے نباہ نہ ہوتا تھا اور آپ کی تشریف آوری سے قبل ہی ''جنگ بُعاث'' ہو چکی تھی، جس میں اوس کے ساتھ مل کر بنونضیر و بنوقریظہ نے بنوقینقاع کے ساتھ بڑا بے دردانہ سلوک روا رکھا تھا،(۴) مسلمانوں کی پہلی جنگ اسی قبیلہ بنوقینقاع سے ہوئی۔

بنوقینقاع سے جنگ کا ذکر کرتے ہوئے اکثر مصنفین نے اس کی وجہ بنوقینقاع کی طرف سے معاہدہ شکنی کو قرار دیا ہے،(۵) لیکن اس عہد شکنی کی تفصیل نہیں ملتی کہ اس سے غزوہ بدر میں مسلمانوں کا عدم تعاون مراد ہے، یا اس کے علاوہ کوئی اور بات بھی ہے اور زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ اس عہد شکنی کی کوئی اور صورت بھی پیش آئی ہو گی؛ کیوں کہ مسلمانوں سے تعاون کا ہاتھ کھینچنے میں تمام یہود مشترک تھے، پھر محض اسی ایک قبیلہ کو عہد شکنی کی سزا دینے کے کوئی معنی نہیں ہیں، اس کے علاوہ ایک اور واقعہ بھی ایسا پیش آیا، جو اس جنگ کا باعث ہو گیا، ایک انصاری خاتون بنوقینقاع کے بازار میں اپنا سامان فروخت کرنے گئی، انھوں نے چہرہ پر نقاب ڈالا ہوا تھا، بنوقینقاع کے نو جوانوں نے اصرار کیا کہ وہ اپنا چہرہ کھول دیں، مگر وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوئیں؛ لیکن وہ جس زرگر کی دوکان پر تھیں، اس نے پیچھے سے اس کا کپڑا اوپر کی طرف کو کانٹے سے اس طرح باندھ دیا کہ اس کو احساس بھی نہ ہوسکا، اب جو وہ

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۴/ ۱۳۷۔ (۲) زادالمعاد: ۲/ ۷۹۔
(۳) زادالمعاد: ۲/ ۷۹۔ (۴) تاریخ الیہود فی العرب: ۹۔
(۵) ملاحظہ ہو: الدرر فی اختصار المغازی والسیر: ۱۴۹۔

اٹھیں تو جسم بے پردہ ہو گیا اور نو جوان استہزاء کرنے لگے، اس بے ہودہ حرکت پر اس نے مسلمانوں کو آواز دی؛ چنانچہ ایک مسلمان نے اس بے ہودہ شخص کو قتل کر دیا اور یہود نے اس کی مدد کی اور قاتل کو شہید کر دیا، ایک پیغمبر خدا جس نے مسلمان عورت کے چہرے کو بھی غیر محرم مرد کے لئے حرام کر دیا ہو، اس پر اس بے ہودہ واقعہ کا جو اثر پڑا ہوگا، وہ ظاہر ہے، مگر روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے پھر بھی صبر وتحمل کا مظاہرہ فرمایا اور نصح وموعظمت کی راہ اختیار کی۔

بنوقینقاع کے قبیلہ آئے اور ان کو دعوت دی، خدا سے ڈرایا، بنوقینقاع کے لئے قبول کرنے اور نہ کرنے کی راہیں کھلی تھیں اور وہ مسلمان مقتول کے قصاص یا خون بہا پر معاملہ طے کر کے معاہدہ کو باقی رکھ سکتے تھے، مگر انھوں نے خود ہی تصادم کی راہ اختیار کی اور کہنے لگے کہ فنون حرب سے ناواقف اہل مکہ پر فتح کی وجہ سے دھوکہ نہ کھاؤ، ہم تمھیں بتادیں گے کہ ہم مرد ہیں: ''اما واللہ لو حار بتنا لعلمت ان حربنا لیس کحر بھم وانا لنحن الناس''۔(۱)

گویا خود ان حضرات نے طبل جنگ بجادیا، مسلمانوں نے فوج کشی کی اور بنوقینقاع کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا، ۱۵؍دنوں (۱۵؍شوال تا یکم ذیقعدہ) کے محاصرہ کے بعد بنوقینقاع نے ہتھیار ڈال دیئے اور آپ کے فیصلہ پر راضی ہو گئے، آپ نے خود ان کے حلیف عبداللہ بن ابی کے مشورہ پر ان کو جلاوطن کر دیا، پس حقیقت یہ ہے کہ بنوقینقاع اپنی عہد شکنی، غیر اخلاقی طرز عمل اور جنگ میں پہل کی وجہ سے اس سے زیادہ سخت سزا کے مستحق تھے، مگر آپ ﷺ نے اسی پر اکتفا فرمایا۔

بنونضیر

عمرو بن اُمیہ ضمری نے منشاءِ نبوی کے خلاف بنوعامر کے دو افراد کو قتل کر دیا، رسول اللہ ﷺ پر یہ بات گراں گذری کیوں کہ آپ اس وقت تک کسی کے خلاف طاقت کا استعمال مناسب نہیں سمجھتے تھے، جب تک کوئی اسلام اور مسلمانوں سے کھلے ہوئے تصادم کی راہ اختیار نہ کرے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ان کی دیت ادا کروں گا: ''قد قتلت قتیلین لَأُدِیَنَّھُمَا''۔(۲)

دوسری طرف خود مسلمانوں سے بھی ان کا حلیفانہ معاہد تھا، اس کے پیش آپ ﷺ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی رفاقت میں بنونضیر تشریف لے گئے اور ان سے دیت کی ادائے گی میں مدد کی خواہش کی، ان لوگوں نے آپ سے بظاہر پورے توقیر واحترام کا معاملہ کیا؛ مگر بباطن آپ ﷺ پر قاتلانہ حملہ کی اس طرح سازش کی کہ عین اسی فصیل پر ایک شخص چڑھ کر پتھر کی چٹان گرادے، جس سے متصل آپ ﷺ تشریف

(۱) الدرر: ۱۵۰۔ (۲) سیرت ابن ہشام: ۱۸۶/۲۔

فرماتھے، اس کے لئے عمرو بن جحاش بن کعب نامی ایک شخص تیار بھی ہوگیا، (۱) بعض لوگ جن کو حضور ﷺ کی پیغمبرانہ حیثیت کا ادراک تھا اور جن کے ضمیر میں زندگی اور شرافت کے کچھ آثار باقی رہ گئے تھے، اس سے منع بھی کیا، اہل سیَر نے اسی حیثیت سے سلّام بن مشکم کا ذکر کیا ہے، (۲) ادھر رسول اللہ ﷺ کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع ہوگئی، آپ خاموشی سے اُٹھے اور اس طرح چلے آئے کہ اپنے رفقاء کو بھی اطلاع نہ کی، یہی اس وقت قرین مصلحت تھا، ادھر آپ آئے اور اُدھر سازش کرنے والوں کے پیروں سے زمین نکل گئی۔

بنونضیر کی اس سازش کے سلسلہ میں مسلمانوں کے لئے یہ کافی ہے کہ قرآن مجید خود اس پر شاہد (المائدہ:۵) اور آپ ﷺ کی زبان حق ترجمان اس پر ناطق ہے، مگر اس سے قطع نظر بھی اس پر یقین کرنے کے کافی وجوہ ہیں، اول یہ کہ جب آپ نے بنونضیر کو اسی جرم کی پاداش میں شہر بدری کا حکم دیا تو کہیں اس کا ذکر نہیں کہ انھوں نے اس الزام کی تردید کی ہو، اہل سیر سے یہ بات بعید ہے کہ ایسی کوئی بات ہو اور وہ اس کا بالکل ذکر نہ کریں، ہاں یہ ممکن تھا کہ اگر ان کی طرف سے تردید ہوئی ہوتی تو وہ اس کا ذکر کرتے اور ان کی تکذیب بھی کرتے — دوسرے: بعض واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہود اس طرح کی حرکتیں کیا کرتے تھے؛ چنانچہ غزوہ بنوقریظہ کے موقع سے ایک یہودی خاتون محض اس لئے قتل کی گئی کہ اس نے خلاد بن سوید کو ٹھیک اسی طرح شہید کر دیا تھا۔ (۳)

یہ تو ایک خاص واقعہ تھا، بعض دوسرے حالات بھی ایسے تھے کہ مدینہ کی اس اسلامی مملکت کی سالمیت کے لئے بنونضیر کو یہاں سے جلاوطن کیا جانا ضروری تھی؛ کیوں کہ یہ کفار مکہ کے لئے جاسوسی کا فریضہ انجام دیتے تھے اور قریش کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر بھڑکاتے تھے، موسیٰ بن عقبہ کا بیان ہے: ''**کانوا قد دسو إلیٰ قریش فی قتال رسول اللہ فحضوھم علی القتال و دلوھم علی العورۃ**''۔ (۴)

بنونضیر کے اس معاندانہ طرز عمل نے آپ کے لئے ان کے خلاف فوج کشی کا پورا پورا جواز پیدا کر دیا تھا، مگر آپ نے اب بھی نرم خوئی کو راہ دیا اور ان کو دس دنوں کی مہلت دی کہ شہر چھوڑ دیں اور جہاں چاہیں چلے جائیں، (۵) مگر راس المنافقین عبداللہ بن ابی کا ہاتھ ان کی پشت پر تھا، اس نے کہلا بھیجا کہ میرے ساتھ دو معزز آدمی ہیں اور بنو قریظہ بھی تمہاری مدد کو تیار ہیں، تم جنگ کی راہ اختیار کرو۔ (۶)

چنانچہ اب آپ کے لئے فوج کشی کے سوا کوئی اور راہ نہ رہ گئی، آپ نے قلعہ بنونضیر کا چھ شب و روز محاصرہ کیا، بالآخر بنونضیر نے خود درخواست کی کہ ان کو جلاوطن کر دیا جائے اور اونٹ پر جتنا سامان لے جایا سکے، ساتھ لے جانے کی

(۱) الدرر: ۱۷۴۔ (۲) طبقات بن سعد: ۲/ ۴۰، القسم الاول۔
(۳) عیون الاثر: ۲/ ۳۷۔ (۴) عیون الاثر: ۲/ ۴۸۔
(۵) طبقات بن: ۲/سعد ۴۱۔ (۶) ابن ہشام: ۲/ ۱۲۱۔

اجازت دی جائے، آپ نے اسے منظور فرمایا اور پوری آزادی کے ساتھ ان کو اسلحہ کے سوا تمام سامان لے جانے کی اجازت دی، یہاں تک کہ مکان توڑ توڑ کر وہ ممکنہ سامان بھی ساتھ اُٹھا لے گئے۔(۱)

بنونضیر کی اشتعال انگیز روش اور مسلمانوں کے تحمل کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ یہ حضرات اپنے قلعہ سے اس شان و بان اور آب و تاب سے نکلے جیسے کوئی فتح مند فوج فاتحانہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے، نہ چہرے پر ندامت ہے، نہ اپنی سرزمین سے فراق کا بظاہر غم، مطربائیں ساتھ ہیں اور نغمہ و سرود اور شہنائیاں سامعہ نوازی میں مصروف، (۲) بعض انصار کی اولاد نے بھی یہودیت قبول کر لی تھی، جو اس قافلہ کے ساتھ تھے، انصار نے ان کو جبراً روکنا چاہا، مگر اسلام کی رواداری ملاحظہ کی جائے کہ اس دباؤ کو بھی منع کیا گیا اور جبراً مسلمان کرنے اور مسلمانوں کے ساتھ رہنے کو بھی پسند نہیں کیا گیا اور آیت قرآنی نازل ہوئی: ''لا اکراہ فی الدین''۔(البقرۃ:۲)

میرا خیال ہے کہ اہل انصاف اس بات کا اعتراف کریں گے کہ یہاں بھی بنونضیر کے سازشی سرداروں تک کو بخش دینا اور کفار مکہ کے جاسوس اور منافقین کی پس پردہ مدد کے باوجود صرف ان سے حسبِ خواہش جلا وطنی کو منظور کر لینا بھی پیغمبر اسلام کی طبعی شفقت اور رحم دلی کا نتیجہ تھا؛ مگر افسوس کہ یہود نے اب بھی سبق نہ لیا اور انھیں سرداران بنونضیر نے مسلمانوں کے خون سے اپنی طبع خون آشام کو سیراب کرنے کی غرض سے پورے عرب کو ان کے خلاف غزوۂ احزاب کی صورت اکٹھا کر دیا۔

بنوقریظہ

مدینہ میں اب یہودیوں کا ایک قبیلہ ہی باقی رہ گیا تھا، مسلمانوں اور ان کے درمیان دوبارہ معاہدہ کی تجدید بھی ہوئی تھی اور مسلمان اس پر قائم رہے؛ مگر ہوا یوں کہ بنونضیر نے جان بخشی کا صلہ یہ دیا کہ ایک وفد لے کر مکہ پہنچ گئے، اس وفد میں سردار نبونضیر سلام بن ابی الحقیق، حُی بن اَخطب، کِنانہ بن ربیع اور کچھ دوسرے لوگ شامل تھے، انھوں نے اپنی تائید و حمایت کے مکمل اظہار کے ساتھ اہل مکہ کو مدینہ پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔(۳)

جب اہل مکہ تیار ہو گئے تو بنوغطفان کے پاس گئے، ان کو بھی تیار کیا، (۴) اور یہ بھی وعدہ کیا کہ خیبر کے نخلستانوں کی کھجور کے نصف حصے ہر سال تمہیں ادا کیا کریں گے، اس طرح ابوسفیان کی زیر کمان اعداء اسلام کا دس ہزار کا اسلحہ و آہن میں غرق لشکر کرۂ ارض میں حق و توحید کی چھوٹی سی بستی مدینہ کی خانماں بربادی کے لئے آگے بڑھ رہا تھا، آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے خندق کھدوائی اور اس میں آپ ﷺ نے

---

(۱) عیون الاثر:۲/۴۹۔ (۲) البدایہ والنہایہ:۴/۷۶۔
(۳) ابن ہشام:۲/۱۸۷۔ (۴) طبقات بن سعد:۲/۴۷۔

بنفس نفیس شرکت فرمائی، (۱) خواتین و بچوں کو مدینہ کے بعض محفوظ قلعوں میں رکھ دیا گیا اور تین ہزار مسلمان مجاہدین خندق کے اس پار صف آراء ہو گئے، (۲) حی بن اخطب بنوقریظہ گیا اور ان کو بھی شریک جنگ ہونے کی دعوت دی، اول تو ان لوگوں نے انکار کیا، مگر حُی کے اصرار پر یہ بھی قریش اور بنوغطفان کے ساتھ ہو لئے۔ (۳)

آنحضورﷺ نے جب اس کی تحقیق کے لئے حضرت سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ کو بنوقریظہ کے پاس بھیجا تو ان لوگوں نے نہایت درشتی کے ساتھ جواب دیا اور کسی معاہدہ کے ہونے ہی کا انکار کر دیا؛ حالاں کہ ان پر پیغمبر اسلام کا یہ احسان تھا کہ آپ کی آمد سے پہلے بنونضیر کے مقابلہ ان کی حیثیت کمتر شمار کی جاتی تھی اور ان کا خوں بہا ان کے مقابلہ نصف ہوتا تھا، آپﷺ نے دونوں کی دیت برابر قرار دی۔ (۴)

خواتین کو جن قلعوں میں محفوظ کیا گیا تھا، وہ بنوقریظہ سے بہت قریب تھے اور مردوں میں صرف حسان بن ثابت اس قلعہ میں تھے، بنوقریظہ کی نیت اسی قلعہ پر خراب ہو رہی تھی، حضرت صفیہؓ کہتی ہیں کہ یہودیوں کے ایک دس نفری گروہ نے قلعہ پر تیراندازی شروع کر دی اور ان میں کا ایک شخص عین قلعہ کے دروازہ پر آ گیا اور قلعہ کے گرد چکر لگانے لگا، ادھر آنحضورﷺ اور صحابہ مصروف معرکہ ہیں، حضرت حسان اپنی علالت کی وجہ سے اس لائق نہیں تھے کہ دشمن کی سرکوبی کے لئے نکل سکیں؛ چنانچہ حضرت صفیہؓ خود نکلیں اور ایک ستون (عمود) سے ایسی ضرب لگائی کہ وہ دشمن خدا وہیں ڈھیر ہو گیا اور اس کا سر کاٹ کر یہود کی طرف پھینک دیا، اس واقعہ نے ان کی ہمت پست کر دی اور کہنے لگے کہ محمدﷺ نے اپنے لوگوں کو تنہا نہیں چھوڑا ہے۔ (۵)

بنوقریظہ کے خطرہ سے آپ نے یہ تدبیر بھی فرمائی کہ سو، تین سو آدمیوں کے رسالے کبھی سلمہ بن اسلم اور کبھی زید بن حارثہ کے زیر کمان ان قلعوں کے قریب روانہ کرتے کہ وہ زور سے نعرہ تکبیر لگائیں؛ تا کہ بنوقریظہ کی ہمت بڑھنے نہ پائے، (۶) اگر اس طرح کی تدبیر نہ کی جاتی اور حضرت صفیہؓ والا واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو شاید یہ قلعہ بنوقریظہ کی زد سے بچ نہ سکتا، غور کیجئے کہ مسلمانوں کے لئے یہ کس قدر نازک موقع ہے، بیس ہزار دشمنوں کے غرق آہن لشکر جرار نے پورے ساز و سامان اور اسباب و وسائل کے ساتھ مدینہ کا محاصرہ کر رکھا ہے، اشیاء خوردنی اور حمل و نقل کی کمی نہیں، عرب کے بڑے بڑے سورما اور تجربہ کار اپنی ترکش شجاعت کا آخری تیر پھینکنے کو تیار ہیں، پڑوس کی آبادیوں نے پیمان وفا توڑ دیئے ہیں، مسلمانوں کے درمیان بھی منافقین کا ایک گروہ مسلمانوں کی ہمت شکنی پر کمربستہ ہے اور عین

(۱) طبقات ابن سعد: ۲/ ۴۷۔
(۲) البدایہ النہایہ: ۴/ ۱۰۲۔
(۳) ابن ہشام: ۲/ ۱۸۹۔
(۴) ابوداؤد، کتاب الدیات، باب النفس بالنفس، حدیث نمبر: ۴۴۹۶۔
(۵) ابن ہشام ۲: / ۱۹۳۔
(۶) طبقات ابن سعد: ۲/ ۴۸۔

موقع جنگ پر مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے، مسلمانوں کی یہ مختصر سی آبادی صرف تین ہزار مجاہدین پر مشتمل ہے، ہتھیاروں کی کمی ہے، فاقہ مستی کی آزمائش بھی دوش بدوش ہے، پیٹ پر پتھر بندھے ہیں، رسد بند ہے، باہر سے کسی کمک کی توقع نہیں، خواتین اور معصوم بچے ایک علاحدہ قلعہ میں محصور ہیں، جن کی حفاظت کا کوئی معقول نظم نہیں ہے، پڑوس میں بنوقریظہ ہیں، جن سے ہمہ دم ان معصوموں کا تحفظ خطرہ میں ہے، صورت حال یہ ہے کہ لوگ قضاء حاجت کے لئے نکلنے کی ہمت نہیں پاتے، پیغمبر اسلام کو جس نماز سے عشق ہے، جو بحالت ہوش وحواس کبھی قضاء نہ ہوئی، دشمنوں کی یلغار سے ایک نہیں چار نمازیں قضاء ہو جاتی ہیں، عین اسی حالت میں ''مردے از غیب آید بروں'' کے مصداق نعیم بن مسعود کو ہدایت ربانی سے سرفراز کیا جاتا ہے، ان کی حسن تدبیر اور منجانب اللہ بعض قدرتی حالات طوفان اور آندھی کے باعث آخر یہ محاصرہ —— جو تقریباً ۲۴ دنوں سے جاری تھا —— ٹوٹتا ہے۔

خدا کی مدد اور نصرت ساتھ نہ ہوتی تو مدینہ کی اس مختصر سی آبادی کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی اور حق کا یہ چراغ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا، ظاہر ہے یہ سب کچھ بنونضیر کے جلاوطن اور بنوقریظہ کے معاہد یہودیوں کی فتنہ سامانی اور ریشہ دوانی کا نتیجہ تھا، اس آزمائش سے گذرنے کے بعد ایک طرف عرب کے مشرک قبائل کی کمر ہمت ٹوٹ کر رہ گئی، دوسری طرف بنوقریظہ پر حجت تمام ہوگئی۔

اب مسلمانوں کے سامنے اپنے تحفظ کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ رہا کہ آستین کے اس سانپ سے نجات حاصل کر لی جائے؛ چنانچہ اہل مکہ اور بنوغطفان کی واپسی اور غزوہ خندق کے ختم ہوتے ہی آپ ﷺ نے بنو قریظہ کی طرف کوچ کیا، حضرت علیؓ جھنڈا لے کر قلعہ کی فصیل کے قریب پہنچے تو یہودیوں نے علانیہ آپ کی جناب میں گستاخی کی اور کچھ اس طرح کے کلمات کہے کہ حضرت علیؓ باوجود آپ کے استفسار کے زبان پر نہ لاسکے، (۱) یہ محاصرہ ۲۵ دنوں تک جاری رہا، اس درمیان سردار قبیلہ کعب بن اسد نے یہودیوں کے سامنے تین صورتیں رکھیں، جن میں سے پہلا نکتہ یہ تھا۔

> تابع هذا الرجل ونصدقه فوالله لقد تبين لكم انه لنبي مرسل وانه للذي تجدونه في كتابكم فتأمنون على دماءكم وأبناءكم ونساءكم ۔
>
> ہم اس شخص کی پیروی کرلیں اور اس پر ایمان لے آئیں، خدا کی قسم! تم پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ وہ نبی ورسول ہیں اور وہی ہیں جن کا ذکر تم اپنی کتابوں میں پاتے ہو، اس طرح تم اپنی جان ومال اولاد وخواتین پر امن حاصل کرلوگے۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۴/۱۱۹۔

مگر یہود کے لئے ہدایت مقدر نہ تھی،انھوں نے کہا کہ ہم تورات کو نہ چھوڑیں گے اور نہ اس کے احکام کو بدلیں گے :

لا نفارق حكم التوراه أبدا ولا نستبدل به غيره ۔ (۱)

آخر مجبور ہو کر بنوقریظہ سپر انداز ہوئے اور خود انھوں نے سعد بن معاذؓ کو حکم بنایا،سعد بن معاذؓ کا قبیلہ اسی بنوقریظہ کا حلیف تھا،اس لئے بنوقریظہ کو ان سے عدل ورعایت کی زیادہ اُمید رہی ہوگی، بہر حال حضرت سعدؓ نے اپنے فیصلہ سے پہلے ایک بار پھر فریقین سے توثیق کرالی کہ وہ ان کی تحکیم پر راضی ہیں، (۲) اس کے بعد ہی اپنے فیصلہ کا اعلان فرمایا کہ جنگجوؤں کو قتل کر دیا جائے،عورتیں اور بچے قید کئے جائیں اور سامان واسباب تقسیم کر دیئے جائیں۔(۳)

چنانچہ چارسو جوان جنگجو قتل کے لئے گرفتار کئے گئے، (۴) جو لوگ بنوقریظہ میں بدعہدی سے بچے رہے،ان سے عین معرکہ جنگ میں بھی درگذر کیا گیا؛ چنانچہ عمرو بن سعد قرظی محاصرہ کے درمیان ہی نکلے،انھوں نے ایک شب خاص مسجد نبوی میں گذاری اور چلے گئے،مسلمانوں نے ان سے کچھ نہ کہا، (۵) عورتوں میں صرف بنانۃ قریظہ نامی ایک خاتون پر سزائے موت جاری ہوئی،جس نے خلاد بن سوید پر چکی کا پاٹ اوپر سے گرا کر مار ڈالا تھا،آپ نے ان بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی خوش اخلاقی نہ چھوڑی، رات میں ان کو قید رکھا گیا اور ان کے کھانے کے لئے کھجوروں کا نظم کیا گیا،ایک ساتھ ایک کے سامنے دوسرے پر سزائے موت جاری نہ کی گئی کہ یہ زیادہ ایذاء کا باعث ہوتی،ایک ساتھ دو چار آدمی لائے جاتے اور یکبارگی قتل کئے جاتے۔(۶)

بعض لوگوں کے لئے شخصی سفارش کی گئی،آپ نے ان کی معافی کو منظور کرلیا،ایک صحابی نے جن پر زبیر بن باطا قرظی کے کچھ احسانات تھے،زبیر کے لئے جان بخشی کی درخواست کی،آپ نے منظور فرمائی،زبیر نے کہا: اولاد وعیال کے بغیر بقیہ زندگی کا کیا لطف؟ آپ ﷺ نے بال بچوں کی سپردگی بھی قبول کی، پھر زبیر نے مال واسباب کی بھی خواہش کی،آپ نے اسے بھی قبول فرمایا،مگر اس نے کعب بن یسار،حی بن اخطب اور عزال بن سموال رئیسان

(۱) عیون الاثر: ۲/ ۶۹۔ (۲) الدرر فی اختصار المغازی والسیر: ۱۹۲۔

(۳) صحیح مسلم، باب جواز قتال من نقض العہد، کتاب الجہاد والسیر۔ (۴) روایات اس سلسلہ میں مختلف ہیں اور چار سو تا نو سو کی تعداد آئی ہے،مگر یہ عموماً تاریخی روایات ہیں،صحاح میں چار ہی سو کا ذکر ہے،ابن ہشام نے بھی اسی کو ترجیح دیا ہے: ۲/ ۱۲۶، السہیلی) ابن حجر نے تاویل کی ہے کہ مجموعی گرفتاری زیادہ افراد کی ہوئی ہوگی اور مقتولین کی تعداد چار سو ہوگی۔

(۵) عیون الاثر: ۲/ ۷۸، البدایہ والنہایہ: ۴/ ۱۳۶۔ (۶) طبقات بن سعد: ۲/ ۵۴۔

بنوقریظہ کے قتل کی اطلاع سنی تو قتل ہو جانے کی خواہش کی، اس طرح وہ بھی قتل ہوا، (۱) بنوقریظہ کے ان چار سونفوس پر سزائے موت جاری کئے جانے کو اکثر مستشرقین اہل علم نے آپ کا ظلم قرار دیا ہے؛ لیکن اگر انصاف کے ساتھ چند نکات کو سامنے رکھا جائے تو کوئی صاحب انصاف آپ ﷺ کے اقدام کے درست ہونے میں شک نہیں کر سکتا۔

اول: بنوقریظہ کے سلسلہ میں تین ہی صورتیں اختیار کی جاسکتی تھیں، ایک یہ کہ ان کو جلاوطن کر دیا جائے، مگر مسلمان بنونضیر کی جلاوطنی کا مزا چکھ چکے تھے اور دیکھ چکے تھے کہ کس طرح انھوں نے احسان مند ہونے کی بجائے پورے عرب کو اسلام کے خلاف لا کھڑا کیا، اب مزید اس کا تجربہ اجتماعی خودکشی کے مترادف ہوتا، دوسری صورت یہ تھی کہ ان سبھوں کو غلام بنا دیا جاتا، مگر یہ صورت پہلی صورت سے زیادہ خطرناک ہوتی، مدینہ میں پہلے ہی سے منافقین موجود تھے، جو اندر سے مسلمانوں کی جڑیں کھودنے میں مصروف رہتے تھے اور یہ طبقہ مسلمانوں کا تابع اور ان کا احسان مند تو ہرگز نہیں ہوتا؛ البتہ نت نئی سازشوں کا سرچشمہ اور منبع بن جاتا، ان کے بغض وعناد کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ حی بن اخطب قتل سے پہلے آپ ﷺ کو علانیہ کہتا ہے کہ مجھے تمہاری عداوت پر کوئی ملامت وافسوس اب بھی نہیں ''أما واللہ ما لمت نفسی عداوتک'' (۲) اب تیسری صورت یہی تھی کہ ان پر سزائے موت جاری کی جائے؛ تاکہ ان کے فتنہ سے اسلام اور مسلمانوں کو محفوظ رکھا جاسکے، پس یہ عین مبنی برانصاف سزا تھی اور مسلمان اس اقدام پر مجبور تھے۔

دوم: بنوقریظہ کی جنگ میں شرکت مسلمانوں کے خلاف بغاوت کا درجہ رکھتی ہے؛ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے لئے بھی مدینہ کے باشندہ کی حیثیت سے فرمانروا اور رہبر تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے معاملات بھی آپ کے پاس فیصلہ کے لئے لایا کرتے تھے اور بغاوت کی سزا دنیا کے ہر قانون میں سزائے موت ہے، بعض منصف مزاج مستشرقین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے، سراسٹینلی لین پول کا بیان ہے۔

> یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان لوگوں کا جرم مملکت سے غداری تھا، وہ بھی ایک محاصرہ کے دوران، جن لوگوں نے تاریخ میں یہ پڑھا ہے کہ ولنگٹن کی فوج جس راستہ سے گذری، اس کی نشاندہی مفرور سپاہیوں اور لوٹ مار کرنے والوں کی لاشیں کرتی تھیں، جو درختوں پر لٹکی ہوئی تھیں، انھیں ایک غدار قبیلہ کے ایک سرسری فیصلہ کی رو سے قتل کئے جانے پر متعجب نہیں ہونا چاہئے۔ (۳)

---

(۱) عیون الاثر: ۲/ ۷۴۔ (۲) عیون الاثر: ۲/ ۷۳۔

(۳) نبی رحمت: ۱/ ۲۷۰۔

سوم: یہ فیصلہ خود ان کے تسلیم شدہ حَکَم کا تھا، پیغمبر اسلام کا نہ تھا اور حکم کے ذریعہ جو فیصلہ ہو، اس کے ذمہ دار اُصولی طور پر خود وہ فریق ہوتے ہیں، جنھوں نے اس تحکیم کو قبول کیا ہو۔

چہارم: یہ فیصلہ خود ان کی مذہبی کتاب، تورات کے عین مطابق تھا، تورات کا بیان ہے :

جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام دینا، اور اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے اور اپنے پھاٹک تیرے لئے کھول دے تو وہاں کے سب باشندے تیرے باج گذار بن کر تیری خدمت کریں، اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے؛ بلکہ تجھ سے لڑنا چاہے تو تو اس کا محاصرہ کرنا اور جب خداوند تیرے خدا اسے تیرے قبضے میں کردے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا؛ لیکن عورتوں اور بال بچوں نیز چوپایوں اور شہر کے سب مال اور لوٹ اور تم اس دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے دی ہو، کھانا۔(۱)

چنانچہ بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل مختلف مواقع پر اسی حکم کے مطابق عمل کرتے رہے، (۲) بنو قریظہ کے اس انجام نے خود مسلمانوں کی صف میں گھسے ہوئے منافقین کی قوت بھی توڑ دی اور اہل مکہ اور مدینہ کے معاندین اسلام کے درمیان جو ربط تھا اور جو مختلف جنگی مہمات اور حوادث کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا، وہ ربط بھی باقی نہ رہا اور پھر اہل مکہ سے جنگ کی نوبت نہ آئی؛ بلکہ کسی کشت وخون کے بغیر حرم مکہ چند ہی سالوں میں مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔

غـزوۂ خیبـر

یہود سے مسلمانوں کا آخری معرکہ خیبر کے موقع سے ہوا، خیبر مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک بڑا شہر تھا، جہاں عالیشان قلعے، زرخیز کھیت اور سرسبز وشاداب نخلستان تھے، (۳) مضبوط اور مستحکم قلعوں میں دس ہزار جنگجو موجود تھے، (۴) اور مدینہ کے مار آستین اور مسلمانوں کی صف میں گھسے ہوئے مسلمانوں کے بدترین دشمن عبداللہ بن ابی بن سلول سے بھی ان کا خفیہ ربط برابر قائم تھا، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ غزوہ خیبر کے موقع سے بھی اس نے یہودیوں کو پیغام بھیجا کہ تم مسلمانوں سے ڈرو نہیں اور مقابلہ کرو، مسلمان تعداد میں بھی کم ہیں اور ان کے پاس اسلحہ

(۱) استثناء: ۲۰، ۱۰، ۱۵۔ (۲) گنتی: ۳۱، ۷، ۱۰۔
(۳) السیرۃ الحلبیہ: ۲/ ۷۲۶، غزوہ خیبر۔ (۴) السیرۃ الحلبیہ: ۲/ ۷۳۰۔

بھی تمہارے مقابلہ میں تھوڑا ہے، (۱) خیبر کے یہودیوں نے بڑی تعداد میں اس زمانہ کے ترقی یافتہ اسلحہ منجنیق، دبابے، زرہیں اور تلوار جمع کر رکھا تھا، (۲) چنانچہ صرف دو قلعوں ''وطیح اور سلالم'' ہی میں مسلمانوں کو سوزرہیں، چار سو تلواریں، ایک ہزار نیزے اور پانچ سو عربی تیر وکمان حاصل ہوئے، (۳) سرمایہ جو جنگ کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتا ہے، وافر مقدار میں ان کے پاس موجود تھا اور اس کو دفینوں کی صورت وہ محفوظ کئے ہوئے تھے، (۴) بنونضیر کے جلاوطن قائدین حی بن اخطب اور فرزندان ابوالحقیق جن کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے پرانی عداوت تھی، بھی وہیں فروکش تھے، (۵) بنوغطفان جیسے طاقتور اور مضبوط قبیلہ سے یہود نے دفاعی معاہدہ بھی کر رکھا تھا؛ چنانچہ غزوہ خیبر کے موقع سے بنوغطفان بھی یہود کی مدد کے لئے نکل آئے تھے، مگر اپنے داخلی حالات اور خلفشار کی وجہ سے ان کو اس کی ہمت نہ ہوسکی، (۶) اس طرح مسلمانان مدینہ دو طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں تھے، ایک طرف کفار مکہ تھے اور دوسری طرف یہود خیبر۔

یہودیوں کی یہ عددی قوت، اسلحہ کا ذخیرہ، سرمایہ کی بہتات، منافقین اور اعداء اسلام سے ان کا خفیہ ربط، بنو غطفان سے دفاعی اتحاد، سرداران بنونضیر کی اسلام سے قدیم عداوت، مضبوط و مستحکم قلعے اور غذائی اشیاء کے معاملہ میں خودکفایتی اور ان کے قدیم سازشی مزاج و مذاق نے بجا طور مسلمانوں کو وحشت واضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا، وہ اس اندیشہ میں حق بجانب تھے کہ پھر کہیں یہ صورت حال کسی نئے غزوہ خندق کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔

چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد کہ اہل مکہ کی طرف سے ایک گونہ اطمینان حاصل ہو چکا تھا، آپ ﷺ نے چودہ سو پیادہ اور دو سو سوار سپاہیوں کے ساتھ خیبر کی طرف کوچ فرمایا، (۷) خیبر کے قریب پہنچے تو وہ دُعا فرمائی جو مزاج نبوت اور کسی سپہ سالار کے درمیان امتیاز قائم کرتا ہے کہ :

> اللھم رب السماوات وما اظللن ورب الارضین وما اقللن ورب الشیاطین وما اضللن ورب الریاح وما اذرین فانا نسئلک خیر ھذہ القریہ وخیر ما فیھا ونعوذ بک من شرھا وشر اھلھا وشر ما فیھا۔ (۸)

---

(۱) السیرۃ الحلبیہ: ۷۳۰۔
(۲) السیرۃ الحلبیہ: ۲/۷۴۴۔
(۳) سیرت حلبیہ: ۲/۷۴۵۔
(۴) البدایہ والنہایہ: ۳/۱۹۲۔
(۵) البدایہ: ۳/۱۹۲، ذکر قصہ صفیہ۔
(۶) الروض الانف: ۴/۴۰۔
(۷) تاریخ ابن خلدون بقیہ المجلد الثانی: ۳۸۔
(۸) ابن ہشام: ۴/۴۰۔

خداوندا! آسمانوں کے پروردگار اوران تمام چیزوں کے جن پر آسمان سایہ فگن ہے، زمین اوران تمام چیزوں کے رب جن کو زمین نے اُٹھا رکھا ہے، شیاطین کے رب اوران تمام لوگوں کے جن کو شیاطین نے گمراہ کیا ہے، ہواؤں کے رب اور جن کو ہوائیں اُڑاتی ہیں، ہم آپ سے اس جگہ کے اور یہاں کے خیر کے طالب اور یہاں کے شر، یہاں کے باشندوں کے شر اور یہاں کی تمام چیزوں کے شر سے پناہ کے خواہاں ہیں۔

ہر چند کہ لشکر اسلام شب ہی میں اپنی منزل کو پہنچ چکا تھا، مگر آپ ﷺ نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق شب خوں نہ مارا اور صبح کا انتظار فرمایا، (۱) عین معرکہ جنگ میں بھی امانت ودیانت کا اس درجہ پاس رکھا کہ یہود کا ایک غلام بکروں کے ایک گلہ کے ساتھ خدمت اقدس میں آیا اور مشرف بہ ایمان ہوا تو فرمایا کہ بکریاں قلعہ کی جانب ہنکادی جائیں؛ تاکہ وہ اپنے مالک کے پاس چلی جائیں، (۲) یہود کے اکثر قلعے بذریعہ جنگ اور دو قلعے بذریعہ صلح فتح ہوئے، قموص نامی قلعہ فتح ہوا، تواس میں حضرت صفیہؓ اوران کی چچازاد بہن قید ہوئیں، حضرت بلالؓ ان دونوں کو لے کر مقتولین یہود کے پاس سے گذرے، حضرت صفیہ کی بہن نعشوں کو دیکھ کر رونے لگیں، حضور ﷺ کو حضرت بلالؓ کا یہ عمل پسند نہ آیا اور تنبیہ فرمائی کہ تم خواتین کوان کے مرد مقتولوں کے سامنے سے لے کر گذرتے ہو، کیا تمہارے اندر رحم نہیں ہے؟ (۳)

اہل خیبر سے آپ کا معاہدہ طے پایا کہ ان کی جان بخشی کردی جائے؛ البتہ وہ یہاں سے چلے جائیں؛ لیکن پھر اہل خیبر نے خواہش کی کہ ان کو یہیں رہنے دیا جائے اور وہ خیبر کی پیداوار کا نصف حصہ مسلمانوں کو ادا کیا کریں گے، آپ نے ان کی اس خواہش کو بھی مان لیا؛ البتہ یہ بات واضح فرمادی کہ جب کبھی آپ مناسب سمجھیں گے، ان کو شہر بدر کردینے کے حقدار ہوں گے۔ (۴)

جب آپ یہودیوں کی طرف سے مطمئن ہوگئے تو سلاَّم بن مِشکم کی بیوی زینب بنت حارث نے ایک بکری پکائی اور دست کے حصہ میں جو آپ ﷺ کو زیادہ مرغوب تھا، اچھی طرح زہر پیوست کردیا اور خدمت اقدس میں پیش کیا، لقمہ منھ میں رکھتے ہی آپ نے اس کا احساس فرمایا؛ البتہ حضرت بشرؓ بن براء بن معرور نے تناول فرمایا اور اسی کے اثر سے جاں بحق ہوئے، زینب نے جرم کا اقرار کیا؛ تاہم آپ کی رحمت بے کراں نے اب بھی عفو سے کام لیا، مگر جب حضرت بشر کی وفات ہوگئی تو یہ عورت قصاص میں قتل کی گئی، وفات تک آپ ﷺ پر اس زہر کا اثر تھا۔ (۵)

(۱) البدایہ والنہایہ: ۴/ ۱۸۳۔ (۲) حوالہ سابق: ۱۹۱، عیون الاثر: ۲/ ۱۸۳، اسلام راعی الغنم۔

(۳) ابن ہشام: ۴/ ۴۳، مع الروض۔ (۴) تاریخ طبری: ۲/ ۸۔ (۵) سیرت ابن ہشام: ۴/ ۴۴۔

عین اس موقع پر بھی آپ نے درجات ومراتب کی پاسداری فرمائی، حضرت صفیہ سردار بنونضیر حُیی بن اخطب کی بیٹی تھیں، حضرت دِحیہ ایک باندی کے خواستگار ہوئے تو آپ نے حضرت صفیہؓ کو ان کے حوالہ فرمادیا، مگر بعض صحابہؓ نے عرض کیا: یہ بنوقریظہ و بنونضیر کی ملکہ ہیں (سیدۃ بنی قریظہ و بنی نضیر) اور آپ ﷺ کے لئے مناسب ہیں، آپ نے ان کے درجہ ومنزلت کا پاس رکھا اور باندی بھی نہ بنایا؛ بلکہ آزاد کر کے اپنے حرم نکاح میں داخل فرمایا۔(۱)

حضرت صفیہؓ کا خود اپنا بیان ہے کہ جب میں آپ کے عقد میں آئی تو آپ سے زیادہ کوئی شخص میری نگاہ میں ناپسندیدہ نہ تھا کہ میرے باپ، شوہر اور قوم کے لوگ اس جنگ میں کام آئے تھے، مگر آپ نے معذرت خواہی فرمائی اور وضاحت کی کہ تمہاری قوم نے میرے ساتھ یہ یہ سلوک کیا، حضور ﷺ نے کچھ اس طرح معذرت فرمائی کہ اسی نشست میں میرا رنج جاتا رہا اور یہ کیفیت ہوئی کہ اب آپ سے زیادہ مجھے کوئی محبوب نہیں تھا، (۲) یہ محبت آمیز سلوک آپ ﷺ کا ایک ایسی خاتون کے ساتھ تھا، جس کی قوم دم آخر تک آپ کی ہلاکت کی درپے رہی۔

قلعہ جات وَطیح وسُلالم میں مسلمانوں کے ہاتھ جو سروسامان آیا، اس میں تورات کے صحائف بھی تھے، مسلمانوں نے ان کی کوئی بے حرمتی نہ کی، اور جب یہود نے آپ سے ان کو واپس کرنے کی درخواست کی تو آپ نے ان کی واپسی کا حکم فرمایا، (۳) ـــــ پیغمبر اسلام کے اس فراخدلانہ سلوک کا ایک یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون ان الفاظ میں تذکرہ کرتا ہے۔

> اس واقعہ سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان مذہبی صحیفوں کا رسول اللہ (ﷺ) کے دین میں کس درجہ احترام تھا، آپ کی اس رواداری اور فراخدلی کا یہودیوں پر بڑا اثر پڑا، وہ آپ کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتے کہ آپ نے ان مقدس صحیفوں کے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہیں کیا، جن سے ان کی بے حرمتی لازم آتی ہو، اس کے مقابلہ میں ان کو یہ واقعہ بھی خوب یاد ہے کہ جب رومیوں نے یروشلم کو سنہ ۷۰ قبل مسیح میں فتح کیا تو انھوں نے ان کے مقدس صحیفوں کو آگ لگادی اور ان کو اپنے پاؤں سے روندا، اسی طرح متعصب نصرانیوں نے اندلس میں یہود پر مظالم کے دوران توریت کے صحیفے نذر آتش کئے، یہ وہ عظیم فرق ہے جو ان فاتحین (جن کا ابھی اوپر ذکر گذرا ہے) اور اسلام کے نبی کے درمیان ہمیں نظر آتا ہے۔(۴)

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۴/ ۱۹۷۔　　(۲) السیرۃ الحلبیہ: ۲/ ۷۴۸۔

(۳) السیرۃ الحلبیہ: ۵/ ۱۴۳۔　　(۴) تاریخ الیہود فی بلاد العرب: ۱۷۰، بحوالہ: نبی رحمت: ۲/ ۴۲۳۔

حقیقت یہ ہے کہ خیبر کی یہ مہم پیغمبر اسلام کے لئے ناگزیر ہوگئی تھی ، حی بن اخطب اور کنانہ بن ربیع جیسے سرداران یہود جو غزوہ خندق کی آگ بھڑکانے میں پیش پیش تھے اور تمام عرب کو اسلام کے خلاف صف بستہ کرنے میں قیادت کر چکے تھے، خیبر میں موجود تھے، جزیرہ العرب کی سرزمین اسلام کے لئے اس وقت تک ہموار نہ ہوسکتی تھی جب تک کہ ایک طرف یہود کی اور دوسرے طرف اہل مکہ کی طاقت ٹوٹ نہ جاتی، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ خیبر کی مہم سر ہوئی اور آئندہ ہی سال مکہ فتح ہوگیا اور پھر اس کے بعد پورے عرب نے اسلام کے سامنے اپنے فکر وعقیدہ اور قلب وضمیر کی سپر ڈال دی، مگر اس غزوہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے خلاف یہودیوں کی قدم قدم پر معاندانہ روش کے باوجود بارگاہ نبوی کی باران نبوت سے وہ اب بھی محروم نہیں ہیں، اس کا ان واقعات کے علاوہ جو اوپر مذکور ہوئے ، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تمام قلعہ جات کے فتح کئے جانے کے باوجود یہود کی دس ہزار سپاہ میں سے صرف ۹۳ مارے گئے، (۱) جب کہ ۲۰ سے زیادہ مسلمان سرخروئے شہادت ہوئے ،(۲) اگر اس حسن سلوک کا تقابل یورپ میں ہونے والے یہودیوں کے قتل عام اور نسل کشی نیز مذہبی تعصب وتنگ نظری اور جور واستبداد سے کیا جائے تو مستشرقین خود مغربی اقوام کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں گے :

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

● ● ●

(۱) عیون الاثر لابن سید الناس: ۲/۱۸۳، عدد من قتل من الیہود۔

(۲) تاریخ ابن خلدون، بقیۃ المجلد الثانی: ۳۹۔

بتوں کا انہدام اور مذہبی تقدسات کا احترام

مولانا محمد مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی ◆

یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ سرور کائنات، محسن انسانیت، نبی رحمت، غریبوں کا ملجا، فقیروں کا ماویٰ، بے کسوں کا سہارا، رہبر عالم حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی سیرت پاک کا ہر گوشہ پوری دنیا کی انسانیت کے لئے آئینہ ہے، آپ ﷺ کی ذات ستودہ اپنی ہمہ جہت کردار وگفتار کے اعتبار سے تمام لوگوں کے لئے بہترین نمونہ ہے، آج سے چودہ سو برس پہلے جس طرح پوری انسانی دنیا کی فلاح کے لئے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ، حیات بخش نورانی تعلیمات کی حامل اور روشن ہدایات کی حیثیت شاہ کلید کی تھی، آج بھی سسکتی و بلکتی انسانیت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کے لئے ذریعہ نجات اور اس کی کامیابی وکامرانی کے لئے شاہ کی کلید ہے، اعداء اسلام آپ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کی جاذبیت واہمیت اور اس کی مقناطیسی کشش وسحر انگیزی کو خوب جانتے سمجھتے ہیں اور اس حقیقت سے بھی اچھی طرح آگاہ ہیں کہ جس دن زمین پر بسنے والے لوگ سیرت طیبہ کو اپنالیں گے، وہ زمین کے فرشتے بن جائیں گے، جو شیطان اور اس کے کارندے کو کبھی گوارا نہیں ہے، اس لئے وہ لوگوں کو حیاتِ مبارکہ سے دُور رکھنے کے لئے آپ ﷺ کے صاف وشفاف کردار کو بدنما کرنے کی ناکام کوشش کر رہے اور آپ ﷺ کی تابناک حیاتِ طیبہ کو ہدف طعن وتنقید بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے سورج پر تھوکنے کی ناکام کوشش کر کے اپنے ہی منھ پر تھوکا ہے۔

بہر حال دورِ حاضر میں محبانِ رسول ﷺ کا فریضہ ہے کہ جہاں وہ اپنے رسول و نبی رحمت ﷺ سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اور مختلف انداز میں اس کا اظہار بھی کرتے ہیں، یقیناً یہ شریعتِ اسلامیہ میں مطلوب ومقصود ہے، وہیں اغیار کو سیرت پاک سے آشنا کرانا اور ان کو آنحضرت ﷺ کی تعلیمات سے آگاہ کرنا اور آپ ﷺ کی حیات طیبہ اور تعلیمات میں انسانیت سے محبت واُلفت، مذہبی رواداری اور اخلاقیات کے روشن باب کو عام کرنا، ان لوگوں کی آنکھوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے کو اُٹھانے کی سعی کرنا اور ان کی غلط فہمیوں کے ازالہ کا کام کرنا، یہ اس وقت کا تجدیدی کام ہے، جو لوگ اس میں حصہ لیں گے وہ اس صدی کے مجددین میں شمار ہوں گے، اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس میں حصہ لینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

◆ استاذ : جامعۃ الصالحات، کڑپہ، اے، پی۔

اب آیئے ! اس پس منظر میں عنوان : ''ہدم اصنام اور مذہبی تقدسات کا احترام'' کا کتاب اللہ، حدیث رسول اور سیرت پاک کے آئینہ میں جائزہ لیتے ہیں :

عہد رسالت میں ہدم اصنام کے واقعات

۲۰ رمضان ۸ ھ کو جب رسول اللہ ﷺ شہر مکہ میں داخل ہوئے ، اس وقت اونٹنی پر سوار تھے، سر جھکائے ہوئے تھے، سورہ فتح کی تلاوت زبان مبارک پر جاری تھی ، بیت اللہ شریف پہنچ کر پہلے خدا کے گھر کو بتوں سے پاک کیا، اس وقت بیت اللہ کے گرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے، نیز انھوں نے فرمایا: حضور ﷺ اونٹنی پر سوار مکہ شہر میں داخل ہوئے ، پہلے بیت اللہ کا طواف کیا، اس وقت بیت اللہ شریف کے اردگرد بتوں کے پیروں کو وہاں اس طرح باندھ دیا گیا تھا جس طرح انھیں سیسہ پا کر جما دیا گیا ہو، نبی کریم ﷺ کمان کے گوشے یا چھڑی کی نوک سے ہر ایک بت گراتے جاتے تھے اور زبان مبارک سے یہ پڑھ رہے تھے :

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۔ (۱)

اور آپ کہہ دیجئے! حق آ گیا اور باطل مٹ گیا کہ باطل تو مٹنے ہی والا تھا۔

بیت اللہ شریف کے دروازہ کے پاس مشرکین کا ایک بہت بڑا بت ہُبل نامی نصب تھا، جو بت پرستوں کا خدائے اعظم تھا، یہ انسان کی صورت کا تھا اور یاقوتِ احمر سے بنا تھا، سب سے پہلے جس نے اس کو کعبہ میں لا کر رکھا تھا، خزیمہ بن مدرکہ تھا جو مضر کا پوتا اور عدنان کا پڑپوتا تھا، ہبل کے سامنے ساٹھ تیر رہتے تھے جن پر ''لا'' (نہیں) اور ''نعم'' (ہاں) لکھا ہوا تھا، عرب جب کوئی کام کرنا چاہتے تھے تو ان تیروں پر قرعہ ڈالتے اور ''ہاں'' یا ''نہیں'' جو کچھ نکلتا اس پر عمل کرتے ، حضور ﷺ جب طواف کرتے ہوئے اس کے پاس پہنچے تو اپنی کمان سے اس کی آنکھوں کو کچوکا دیا اور زبان مبارک سے ''جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ'' (۲) (حق آ گیا اور باطل مٹ گیا)، آیت تلاوت فرمائی، پھر حکم دیا کہ اس بڑے بُت کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے۔ (۳)

خانۂ کعبہ کی چھت پر قبیلہ بنی خزاعہ کا ایک بڑا بُت تھا، جو لوہے کی میخوں سے جڑا ہوا تھا، زرد رنگ کے شیشے کا بنا ہوا تھا، حضرت علیؓ آنحضرت ﷺ کے حکم سے اس پر ضربیں لگاتے رہے، یہاں تک کہ وہ اکھڑ گیا، تو حضرت علیؓ نے اس کو پھینک دیا اور وہ گر کر ٹوٹ گیا۔ (۴)

(۱) الاسراء:۸۱۔ (۲) الاسراء:۸۱۔ (۳) مسلم، جہاد، باب فتح مکہ، حدیث نمبر: ۴۶۲۲، سیرت حلبیہ، از: علامہ علی ابن برہان الدین حلبی: ۵/ ۲۶۳، سیرت النبی: ۱/ ۳۱۸، بحوالہ معجم البلدان۔ (۴) سیرت حلبیہ: ۵/ ۲۶۴، ۲۶۵۔

مکہ کے اطراف واکناف میں بہت سے بڑے بڑے بت تھے جومختلف قبائل کے حاجت روااور معبود تھے، جن کے لئے حج کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں، ان میں سے سب بڑے لات، منات اور عزیٰ تھے، عزیٰ قریش کی دیوی تھی اور لات اہل طائف کا معبود تھا، مکہ مکرمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر نخلہ ایک مقام ہے، عزیٰ یہیں منصوب تھی، بنوشیبان اس کے متولی تھے، اہل عرب کا اعتقاد تھا کہ اللہ جاڑے ''لات'' کے یہاں اور گرمی ''عزیٰ'' کے یہاں بسر کرتا ہے، عزیٰ کے سامنے عرب وہ تمام مناسک اور رسوم بجالاتے تھے جو کعبہ میں بجالاتے تھے، اس کا طواف کرتے اور اس پر قربانیاں چڑھاتے، اس کو منہدم کرنے کے لئے آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو روانہ کیا؛ چنانچہ انھوں نے جا کر اس کو منہدم کردیا۔(۱)

''منات'' جوقدید کے پاس مدینہ منورہ سے سات میل دور نصب تھا، زرقانی، غسان، اوس اورخزرج اس کا حج کرتے تھے، اوس اور خزرج جب کعبہ کا حج کرتے تو احرام اُتارنے کی رسم یعنی بال منڈانا اسی کے پاس آ کر ادا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن زید اشہلیؓ کو اس کے توڑنے پر مامور فرمایا: چنانچہ انھوں نے اس کو توڑ ڈالا۔(۲)

اسی طرح آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کو قبیلہ ہذیل کے بُت سواع کو توڑنے کے لئے بھیجا، اس کو انھوں نے ایک ضرب سے توڑ کر پاش پاش کردیا، یہ بُت ینبع کے اطراف رہاط میں تھا، ایک پتھر کی طرح نصب تھا، اس کے متولی بنولحیان تھے اور حضرت عمرو بن عاصؓ کے ساتھیوں نے اس کے اِردگرد چھوٹے چھوٹے بتوں کو توڑا۔(۳)

اسی طرح آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوسفیانؓ ومغیرہ بن شیبہؓ اہل طائف کے بت خانہ لات، حضرت جریرؓ کو بُت خانہ ذی الخلصہ، حضرت طفیل بن عمرو دوسی کو بت خانہ ذی الکفین اور حضرت علی ابن ابی طالبؓ کو بت خانہ فلس کو توڑنے کے لئے روانہ فرمایا۔(۴)

یہ ساری کارروائیاں فتح مکہ کے بعد مکہ میں قیام کے دوران انجام پائی ہیں، اس کے بعد بھی مختلف قبائل کی طرف چند صحابہ کرام پر مشتمل سریہ روانہ فرمایا ہے، جس کا کام دعوت دین اور باطل پرستوں کے مراکز کو منہدم کرنا تھا؛ چنانچہ ربیع الآخر ۹ ہجری میں حضرت علیؓ کو قبیلہ بنی طئے میں ڈیڑھ سو سواروں کے ساتھ بھیجا گیا کہ وہاں کے بڑے صنم خانے کو گرادیں۔(۵)

(۱) تاریخ ابن خلدون: ۲/ ۱۶۵، بدایہ ونہایہ، از: ابن کثیر: ۴/ ۲۹۷، ۳۰۷، رزقانی: ۲/ ۴۰۰، سیرت النبی، از: علامہ شبلی: ۱/ ۳۱۸۔
(۲) تاریخ ابن خلدون: ۲/ ۱۶۶، سیرت النبی، از: علامہ شبلی: ۱/ ۳۱۸، بحوالہ معجم البلدان، ذکر منات۔
(۳) تاریخ ابن خلدون: ۲/ ۱۶۶، سیرت النبی: ۱/ ۳۱۸، بحوالہ: معجم البلدان، ذکر منات۔
(۴) بخاری، غزوۃ ذی الخلصۃ، حدیث نمبر: ۴۳۵۵، سیرت النبی: ۱/ ۳۵۹۔
(۵) محسن انسانیت، ازمولانا نعیم صدیقی: ۵۰۲۔

ہدم اصنام کے اسباب ووجوہات

فتح مکہ کے بعد عام طور سے قبائل نے اسلام قبول کرلیا تھا؛ لیکن بعض قبائل والوں کے دلوں سے بتوں کی عظمت نہیں گئی تھی، ان کے ذہن ودماغ پر بتوں کی اتنی زیادہ ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ان مقدس پتھروں کا ایک ریزہ بھی اپنی جگہ سے ہٹا تو آسمان ٹوٹ پڑے گا، زمین پھٹ جائے گی، مصائب وآلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے اور آفتوں کا غیر متناہی طوفان برپا ہوجائے گا؛ اس لئے ضروری تھا کہ چند پختہ عقیدہ مسلمان صحابہؓ کو ان کے بُت خانوں اور ان میں منصوب ان کے مزعومہ طلسماتی باطل خداؤں کو ڈھانے کے لے روانہ کیا جائے؛ تا کہ ان کے دل ودماغ سے جاہلانہ اور وہم پرستانہ تخیل مٹ جائے اور ان کا ایمان ایک ہی خدا سے سب کچھ ہونے پر پختہ ہوجائے۔(۱)

معلوم ہونا چاہئے کہ مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست ایک اُصولی اور مقصدی ریاست تھی اور وہ جس اساسی اعتقاد پر قائم تھی، اس کے خلاف انفرادی عقیدوں کو تو وہ گوارا کرسکتی تھی؛ لیکن اس اساسی اعتقاد کے خلاف وہ کسی اجتماعی ادارے کو کیسے چلنے دے سکتی تھی، پھر جب کہ جاہلی عرب کے مذہبی وتمدنی نظام میں وہاں کے اصنام روح رواں کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے تصور سے وہ ذہنی اکساہٹ پیدا ہوتی تھی جو جاہلیت پسندوں کو اشتعال دلا دلا کر اسلامی حکومت کے خلاف صف آرا کرتی تھی اور ان بتوں کے نام پر بڑی بڑی لڑائیاں لڑی جاچکی تھیں، تو اس خاص صورت میں کیسے ممکن تھا کہ جاہلی بت خانوں کو بہ حیثیت اجتماعی ادارت کے قائم رہنے دیا جائے اور مشرکانہ نظام اعتقاد کو موقع دیا جائے کہ وہ بار بار ردعملی مزاحمت کے لئے جذباتی اکساہٹ پیدا کرتا رہے، یہ بت دراصل ایک معروف ذہنیت کا تمثل اور باطل نقشۂ زندگی کا نشان تھے، یہ اقدام کسی مسلمہ مذہبی اقلیت کے حقوق میں دخل اندازی کی نوعیت نہیں رکھتا؛ بلکہ اسلامی ریاست کے مزاحم ہونے والے رجحانات کے مظاہرے سے سیاسی فضا کو پاک کرنے کا ایک ناگزیر اقدام تھا، پھر معاملہ محض نظریاتی حد تک عملاً تھا بھی نہیں، قبیلۂ بنی طئے بُت پرستانہ تصور زندگی سے سرشار ہوکر باغیانہ رجحانات اپنے اندر پال چکے تھے، مدینہ کے خلاف ٹکرانے کے عزائم اندر ہی اندر انگڑائیاں لے رہی تھیں، اس امر کا واضح ثبوت یہ ہے کہ حاتم کے نامور گھرانے میں خود عدی بن حاتم نے اس مقصد کے لئے سواری اور اسلحہ کا بہت قبل از وقت انتظام کرلیا تھا، ایسے اور لوگ بھی ہوں گے۔(۲)

مکہ کی پوری آبادی دائرۂ اسلام میں داخل ہوچکی تھی، وہاں کوئی غیر اللہ کا نام لینے والا باقی نہیں رہا اور مکہ کے اطراف واکناف بلکہ عرب کے پورے قبائل اسلام قبول کر چکے تھے، جب بُت پرست ہی باقی نہیں رہے تو بتوں کا

(۱) سیرت النبی:۱/ ۳۵۹۔ (۲) محسن انسانیت: ۵۰۲، از: مولانا نعیم صدیقی۔

باقی رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا؛ بلکہ باقی رکھنے میں لوگوں کے دوبارہ گمراہ ہوجانے کا خطرہ تھا؛ اس لئے گمراہی کے قلعے کومنہدم کردیا گیا؛ تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

جس خانہ کعبہ کی بنیاد ایک موحد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شراکت سے جس اعلیٰ ترین مقصد کے لئے اُٹھائی تھی، وہ مقصد تقریباً سینکڑوں سال نگاہوں سے اوجھل رہا اور جو حرم محترم خلیل بُت شکن کی یادگار تھا اس کے آغوش میں ۳۶۰ بُت جاگزیں ہوگئے تھے، دوسرے الفاظ میں ناجائز قبضہ کئے بیٹھے تھے —— عین عقل کا تقاضا تھا کہ حقدار کو حق ملے اور ناجائز قبضہ کو برخاست کیا جائے اور جس مقصد کے لئے معمار نے خانہ کعبہ کو بنایا تھا، اس مقصد کو بروئے کار لایا جائے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے اس مقصد کو بحال فرمایا اور حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی روح کو خوش کردیا۔

اُس وقت بین الاقوامی قانون کی تحت جب کوئی شہر بزور شمشیر فتح ہوتو سپہ سالار چاہے تو ہتھیار اُٹھانے والے مردوں کو قتل کردے، ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالے اور ان کی املاک پر قبضہ کرلے، اس کا اُسے حق تھا، اسلام نے اس میں اتنا اضافہ کیا کہ بہتر یہ ہے کہ ان کو بھی ذمی بنالیا جائے اور اسی حال پر رہنے دیا جائے، جس پر وہ جنگ سے پہلے تھے، اسی طرح جو شہر بزور طاقت فتح ہو، تو اس شہر کی عبادت گاہوں پر مسلمانوں کو قبضہ کرلینے کا حق ہے، اس لئے کہ مسلمان اس شہر کے رقبہ، وہاں کے باشندوں کے مال وجان اور تمام منقولی اور غیر منقولی املاک کے مالک ہوجاتے ہیں اور غیر منقولی املاک میں غیر مسلمین کی کھیتیاں، مکانات اور ان کے معابد وغیرہ سب شامل ہیں، (۱) اسی عالمی قانون کے تحت جب مسلمانوں نے مکہ کو فتح کیا اور اس کے اکناف ونواح کو بزور طاقت فتح کیا تو وہاں کے بت خانوں کو منہدم کردیا تھا، یا جس خطہ کے لوگ خود اسلام میں داخل ہوگئے تو وہاں بتوں کو پوجنے والے باقی نہیں رہے، اس لئے وہاں کے بتوں کو ڈھادیا گیا۔

اسلام کا اپنا گھر

ہر انسان چاہتا ہے کہ کسی طرح اُس کا اپنا گھر بن جائے اور جب اُس کا گھر بن جاتا ہے تو وہ اپنے گھر کو دشمنوں کی آمد سے محفوظ رکھتا ہے اور کسی اجنبی شخص کو اندر آنے سے روکنے کا حق رکھتا ہے، یہ عام انسانی قانون ہے —— اسی طرح دین ومذہب بھی اپنا گھر چاہتا ہے، جہاں اُسے آزادی سے پھلنے پھولنے کا موقع فراہم ہو، اُس پر کسی کا دباؤ نہ ہو، اسلام کا اپنا گھر جزیرۃ العرب ٹھہرا، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب**'' (۲) ''جزیرۂ عرب میں دو دین جمع نہیں ہوسکتے'' —— ایک روایت میں اس طرح آیا ہے کہ ایک شہر میں دو قبلے نہیں ہوگے، (۳) اور اللہ تعالیٰ نے جزیرۂ عرب ہی کے بارے میں فرمایا :

(۱) احکام أہل الذمۃ: ۲/ ۶۸۰، ۶۸۱، از: علامہ ابن قیمؒ۔ (۲) فتوح البلدان للبلاذری: ۳۴، فتح الباری: ۵/ ۲۰۷۔
(۳) احکام اہل الذمۃ لابن القیم: ۲/ ۶۸۵، بحوالہ: مسند احمد وسنن ابوداؤد۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (التوبۃ:۵)
پھر جب حرام مہینے ختم ہو جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کرو، انھیں گرفتار کرو، ان کا محاصرہ کرو اور ہر تاک کی جگہ میں ان کے لئے بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، یقیناً اللہ بہت معاف کرنے والے اور نہایت مہربان ہیں۔

شرک و بُت پرستی اور اللہ کا انکار اسلام کے بنیادی نظریہ واعتقاد کے بالکل مغائر ہے، جس طرح تاریکی اور روشنی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، اسی طرح توحید و ایمان اور کفر و شرک یکجا نہیں ہو سکتے، اس لئے اسلام اپنے مرکزی گھر میں کفر و شرک کیوں کر برداشت کرتا اور اپنے اساسی عقیدہ کے خلاف جاہلی بُت خانوں کو بہ حیثیت اجتماعی ادارے کیسے چلنے دیتا؟

اپنے گھر کو غلاظت سے صاف ستھرا رکھنا عین قرین قیاس اور معقول بات ہے اور معلوم ہے کہ کفر و شرک اسلام کی نگاہ میں اعتقادی اعتبار سے ناپاک ونجس ہے؛ لہٰذا کفر و شرک سے سرزمین عرب کو پاک صاف کرنا اسلام نے ضروری سمجھا، پس یہ اقدام کسی مسلمہ مذہبی اقلیت کے حقوق میں مداخلت نہیں؛ بلکہ اسلامی ریاست کے مزاحم ہونے والے رجحانات کے مظاہر سے سیاسی فضا کو پاک کرنے کا ایک ناگزیر اقدام تھا، اسی وجہ سے آپ ﷺ نے جہاں بُت پرستاروں کے بتوں اور بُت خانوں کو منہدم کروایا وہیں منافقوں کی مسجد ضرار کو بھی نہیں بخشا، (۱) اس لئے کہ یہ سب جاہلی نظام کے احیاء کے مراکز تھے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغاوت کے اڈے تھے۔

ہدم و بقا کے اعتبار سے مذہبی تقدسات کا حکم

جزیرۂ عرب کے باشندوں کے لئے اسلام یا تلوار تیسرا کوئی اور راستہ نہیں؛ البتہ جزیرۂ عرب سے باہر کے لوگوں کے لئے تیسرا راستہ جزیہ ہے؛ چنانچہ اسلام نے جب عرب سے باہر قدم رکھا اور اللہ کی زمین کو ظلم وطغیان، فتنہ وفساد اور سرکش لوگوں سے خلق خدا کو امن وامان اور راحت پہنچانے کا بیڑا اُٹھایا تو جہاں جنگی اُصول وقوانین وضع کئے وہیں مفتوحہ علاقوں کے لئے ایک عادلانہ نظام مرتب کیا، جو اپنی معنویت کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے اور پوری دنیا کے فاتحین کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے؛ چنانچہ زیر بحث موضوع کے لحاظ سے اس کی ایک جھلک درج ذیل ہے :

(۱) زادالمعاد: ۳/ ۴۵۴۔

عرب سے باہر اسلامی شہر تین طرح کے بنے ہیں، جن میں غیر مسلموں کی اقامت وسکونت کے اعتبار سے احکام مختلف ہیں اور وہ یہ ہیں :

اول : مسلمانوں نے خود شہر کی بنیاد ڈالی ہو اور اس کو آباد کیا ہو۔

دوم : اسلام کی آمد سے پہلے شہر آباد ہو، مسلمانوں نے بزور طاقت اس کو فتح کیا ہو اور وہاں کی زمین اور باشندوں کے مالک بن گئے ہوں۔

سوم : اسلام کی آمد سے قبل سے شہر موجود ہو اور مسلمانوں نے اس شہر کو صلح کے ذریعہ فتح کیا ہو۔

مسلمانوں کے آباد کئے ہوئے شہروں میں غیروں کے مذہبی تقدسات کا حکم

مسلمانوں کے نو تعمیر اور بسائے ہوئے شہر جیسے: بصرہ، کوفہ، واسط، بغداد اور قاہرہ، اس طرح کے شہروں کا حکم یہ ہے کہ یہ امام وخلیفہ کے زیر اختیار کلی طور پر ہیں، امام چاہے ذمیوں یعنی غیر مسلموں کو ان سے جزیہ لے کر رہنے دیں یا نہ رہنے دیں؛ البتہ ان شہروں میں غیر مسلموں کو ہوگی، اس پر سب کا اتفاق ہے؛ اس لئے کہ بزور طاقت مفتوح شہر کی منقولی اور غیر منقولی تمام اشیاء کا مالک اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بنا دیتا ہے، ظاہر ہے کہ زمین اور زمین سے حاصل ہونے والے تمام منافع شامل ہیں، وہیں ان کے عبادت خانے بھی داخل ہیں؛ لہٰذا ان کو اپنے عبادت خانے اور مذہبی شعائر تعمیر کرنے نہیں دیا جائے گا، جیسا کہ حضرت عمر بن خطابؓ کے مشہور شرائط نامے میں اس کا تذکرہ موجود ہے، (۱) اور آنحضرت ﷺ نے خود صراحت کے ساتھ فرمایا: ''کوئی گرجا گھر تعمیر نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس میں سے بوسیدہ کو از سر نو تعمیر کیا جائے گا۔ (۲)

جہاں تک پہلے سے موجود ان کے عبادت خانے کی بات ہے، تو اس کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے: پہلا قول یہ ہے کہ منہدم کیا جانا واجب ہے، باقی رکھنا حرام ہے، یہ حنابلہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے اور شوافع کے نزدیک صحیح تر قول یہی ہے؛ اس لئے کہ شہر بزور طاقت فتح ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی ملکیت میں آ گیا، اب وہ مسلمانوں کا مملوک شہر ہے، پس اس میں شعائر کفر وشرک کے مکانات کو باقی رکھنا درست نہیں ہوگا، جیسا کہ مسلمانوں کے آباد کردہ شہر کا حکم ہے اور چوں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک شہر میں دو قبلے ہونا مناسب نہیں''۔ (۳)

---

(۱) احکام أہل الذمۃ: ۲/ ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۵، ۶۸۹، المغنی لابن قدامہ: ۸/ ۵۲۷، المہذب: ۲/ ۲۵۶، حاشیہ دسوقی: ۲/ ۲۰۴، جواہر الاکلیل: ۱/ ۲۶۸، فتح القدیر: ۵/ ۳۰۰۔

(۲) لا تبنی کنیسة فی دار الاسلام ولا یبنی ما خربت منها، قال الزیلعی فی نصب الرایة: ۳/ ۱۵۴، نشر دار المامون، بیروت: ۱۳۵۷ھ، اخرجه ابن عدی فی الکامل، وقال: سنده ضعیف۔		(۳) احکام اہل الذمۃ: ۲/ ۶۸۹۔

دوسرا قول یہ ہے کہ منہدم کیا جانا واجب نہیں، گویا کہ باقی رہنے دینا بھی جائز ہے، یہ مالکیہ کا مذہب ہے، حنابلہ کا دوسرا قول یہی ہے، شوافع سے بھی ایک قول ایسا ہی منقول ہے، دلیل یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے خیبر کو بزور طاقت فتح فرمایا، وہاں کے یہودی باشندوں کے معابد کو منہدم نہیں فرمایا، نیز حضرات صحابہ نے بہت سے شہروں کو بزور طاقت فتح فرمایا؛ لیکن ان شہروں میں موجود گرجا گھروں اور یہودیوں کے عبادت خانوں کو منہدم نہیں کیا، آج بھی صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں مفتوحہ شہروں میں یہود ونصاریٰ کے عبادت خانوں کا موجود وباقی چلا آنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حضرات صحابہؓ نے ان کے عبادت خانوں کو منہدم نہیں کیا تھا، روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے گورنروں کو لکھ بھیجا کہ گرجا گھر، یہودیوں کے عبادت خانے اور مجوسیوں کے عبادت خانے کو منہدم نہ کرو۔

تیسرا قول احناف کا ہے کہ منہدم نہیں کیا جائے گا، ذمیوں کے پاس ان کے معابد ومساکن باقی رہیں گے؛ البتہ ان کو ان میں عبادت کرنے سے روکا جائے گا۔(۱)

چوتھا قول یہ ہے کہ امام مسلمین کے صوابدید پر مبنی ہوگا کہ باقی رکھنے اور منہدم کرنے میں سے جو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مناسب ومفید ہوگا، اس پر عمل کرے گا، اگر بالفرض منہدم نہیں کیا؛ لیکن کچھ دنوں کے بعد رائے بدل گئی اور منہدم کیا جانا مناسب معلوم ہورہا ہے تو منہدم کروا دے سکتا ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے حضرات صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے خیبر سے یہودیوں کو جلاوطن کردیا؛ جب کہ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو خیبر میں باقی رکھا تھا، اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے غیر مسلمین کے جن عبادت خانوں کو منہدم کرنا مناسب اور از راہ مصلحت سمجھا ان کو منہدم کروادیا اور جن کو باقی رکھنا مناسب اور مسلمانوں کے حق میں مفید تصور کیا ان کو باقی رکھا،(۲) اسی قول کو علامہ ابن قیمؒ نے راجح قرار دیا ہے،(۳) اور واقعہ یہی ہے کہ اختلاف زمانہ اور حالات کے اعتبار سے فیصلہ کیا جائے اور مثبت یا سلبی فیصلہ کرتے وقت مسلمانوں کے مفاد کو پیش نظر رکھا جائے۔

صلح کے طور پر مفتوح شہروں میں غیر اسلامی مذہبی تقدسات کا حکم

جن شہروں کو مسلمانوں نے صلح کے طریقہ پر فتح کئے ہوں، یعنی وہاں کے غیر مسلمین باشندوں نے بغیر کسی مزاحمت ولڑائی کے پورے طور پر اطاعت قبول کرلئے ہوں، تو وہاں کے باشندوں کے ساتھ معاملہ شرائط صلح کے مطابق ہوگا، امام ابویوسفؒ رقمطراز ہیں :

---

(۱) المہذب:۲/۲۵۶، حاشیہ دسوقی:۲/۲۰۴، جواہر الاکلیل:۱/۲۶۸، المغنی لابن قدامہ:۸/۵۲۷، فتح القدیر:۵/۳۰۰، ردالمحتار:۳/۲۶۳، ط: بولاق، مغنی المحتاج:۴/۲۵۴، أسنی المطالب:۴/۲۲۰، قلیوبی:۴/۲۳۴، ۲۳۵، موسوعہ فقہیہ:۷/۱۲۹۔

(۲) احکام اہل الذمۃ:۲/۶۹۰، ۶۹۱۔ (۳) حوالۂ سابق۔

یؤخذ منهم ما صولحوا علیه و یوفی لهم ولا یزاد علیهم ۔ (۱)

ان سے وہی لیا جائے گا، جس پر ان کے ساتھ صلح ہوئی ہے، ان کے حق میں صلح کی شرائط پوری کی جائے گی اور ان پر کچھ اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

لہٰذا اگر شرائط صلح میں یہ طے پایا کہ زمینات ان ہی لوگوں کے زیر قبضہ رہیں گے اور مسلمانوں کو خراج ملے گا، یا مال پر صلح ہوئی کہ اتنی مقدار سالانہ وہ لوگ مسلمانوں کو ادا کریں گے، تو ایسی صورت میں انھیں مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگی، انھیں اپنے عبادت خانے بنانے کی اجازت ہوگی، جیسا کہ احناف، مالکیہ، حنابلہ اور اصح قول پر شوافع کا مذہب ہے؛ کیوں کہ وہ لوگ زمینات و جائیداد اور دیگر املاک کے مالک ہیں، اس لئے ان کو اپنی ملکیت میں تصرف کرنے کا پورا اختیار حاصل ہوگا اور چوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل نجران سے جب صلح فرمایا تھا تو آپ نے وہاں کے باشندے عیسائیوں کو مذہبی آزادی عطا فرمایا اور ان کے گرجا گھر کو منہدم نہیں فرمایا۔(۲)

حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے زمانہ میں حضرت خالد بن ولید ؓ نے اہل حیرہ کو جو صلح نامہ لکھ کر دیا تھا، اس میں اس کی صراحت ہے کہ ''ان کا کوئی معبد اور گرجا منہدم نہ کیا جائے گا...... نہ انھیں ناقوس بجانے سے روکا جائے گا اور نہ ان کو عید کے دن صلیبیں نکالنے سے منع کیا جائے گا''(۳) حضرت عمر ؓ نے اہل بیت المقدس کو جو صلح نامہ لکھ کر دیا تھا، اس میں ہے: ان کے گرجا گھروں کو مسلمانوں کا مسکن نہ بنایا جائے گا، نہ ان کو منہدم کیا جائے گا، اسی طرح حضرت ابوعبیدہ ؓ نے بعلبک کے لوگوں کے صلح نامہ میں، حضرت خبیب بن مسلمہ ؓ نے اہل وبیل کے صلح نامہ میں، آذربائیجان، تبرجان اور ماہ دینار کے صلح نامے میں حضرت حذیفہ بن یمان ؓ نے صراحت کی ہے۔(۴)

اگر صلح مطلق ہوئی تو جمہور فقہاء اُمت (حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ) کے نزدیک ذمیوں کو نئے عبادت خانے بنانے کی اجازت نہیں ہوگی اور احناف وحنابلہ کے مذہب پر قدیم عبادت خانے کو تعرض نہیں کیا جائے گا، ایسا ہی مالکیہ کے کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے۔(۵)

مسلم ممالک میں اغیار کے مذہبی تقدسات

جہاں تک اس وقت مسلم ممالک میں موجود اغیار کے مذہبی تقدسات کے حکم کی بات ہے تو جو قدیم ہیں، ان کو اپنے حال پر باقی رہنے دیا جائے؛ اس لئے کہ پوری دنیا میں خاص طور پر غیر مسلم ملکوں میں موجود عامۃ المسلمین کے

(۱) کتاب الخراج: ۳۵۔ (۲) ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۴۱۔
(۳) کتاب الخراج: ۸۴۔ (۴) حوالہ سابق۔
(۵) فتح القدیر: ۳۰۰/۵، حاشیہ دسوقی: ۲۰۴/۲، المغنی لابن قدامہ: ۵۲۶/۸، ۵۲۷۔

مفاد کا تقاضا یہی ہے، ہاں البتہ مسلم حکمرانوں کو چاہئے کہ نئے مذہبی تقدسات کو بنانے کی اجازت نہ دیں؛ کیوں کہ یہ ان کے اور وہاں کے مسلمانوں کے حق میں ازراہ مصلحت مناسب نہیں ہوگا، ویسے مسلم حاکم کی ذمہ داری ہے کہ ملکی اور بین الاقوامی حالات وظروف اور اسلام و مسلمین کے حق میں مصلحت و مفاد کا جو تقاضا ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے۔

اگر مسلم ممالک میں بادشاہی حکومت ہو یا جمہوری حکومت ہو، بہر حال وہاں کے ملکی قوانین میں غیر مسلموں کو جو حقوق مذہبی، سیاسی اور سماجی وغیرہ کے دیئے گئے ہوں، اس کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا، یہ گویا ان کے ساتھ ایک طرح کا معاہدہ وصلح ہوا، جس کو پورا کرنے کے مسلمان پابند ہیں، جیسا کہ پیچھے تفصیل سے بات آچکی ہے۔

●●●

پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کثرتِ ازدواج

مولانا نورالحق رحمانی ◆

انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی مقدس جماعت انسانیت کا جوہر اور خلاصہ اور اپنے اعمال واخلاق کے لحاظ سے انسانوں کے لئے مقتدا اور پیشوا ہے، انھوں نے دنیا میں رشد وہدایت، ایمان وروحانیت، اخلاص وللّٰہیت، شرافت ودیانت، عفت وعصمت، صداقت وامانت اور ایثار وقربانی کی شمع روشن کی، جس کے بچے کھچے اثرات آج بھی دنیا میں موجود ہیں اور انسانیت ان سے مستفیض ہورہی ہے، نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی مقدس جماعت کے فرد فرید، گل سرسبد اور گوہر شب چراغ ہیں جن پر نبوت اور کمالات نبوت ختم کردیئے گئے اور انبیاء سابقین کی تمام خوبیاں اور خصوصیات جمع کردی گئیں، اور ان کے سر پر ختم نبوت کا تاج رکھ کر اور اخلاق وروحانیت کے بلند مرتبہ پر فائز کرکے اللہ رب العزت نے انھیں رہتی دنیا تک کے لئے پوری انسانیت کے واسطے اُسوہ اور نمونہ بنایا، آج سے چودہ سو سال قبل تاریخ کے ایک نازک دُور میں جب دنیا کفر وشرک سے بھر گئی تھی اور تمام شرور وفتن، ظلم وتشدد اور فحاشی وبے حیائی کی آماج گاہ تھی اور ایک عالمگیر فساد وبگاڑ رونما تھا، جس سے دنیا کا کوئی چپہ اور گوشہ خالی نہ تھا، ایسے پرخطر، پرفتن اور پرآشوب دور میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرماکر گم کردہ راہ انسانیت کی اصلاح وہدایت کی خدمت پر مامور فرمایا، آپ نے تھوڑے ہی عرصہ میں اللہ کی مدد اور اپنی وبے مثال تعلیم وتربیت سے عرب کی وحشی، ناخواندہ اور تمدن ناآشنا قوم کی کایا پلٹ دی اور اس مردہ قوم کو مسیحا اور انسانیت کا معلم بنادیا اور شتر بانوں کو جہاں بانی وحکمرانی کے منصب پر فائز کیا، عرب کے خطے میں رشد وہدایت کی جو ہوائیں چلیں اور ایمان وروحانیت کی جو بہار آئی اس کے جاں فزا جھونکوں سے پوری دنیا فیضیاب ہوئی :

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی

نبی اُمی کے غلاموں اور متوالوں نے دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے بیشتر حصے کو فتح کرڈالا اور دین حق کا پیغام پوری دنیا تک پہنچایا اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر معبود برحق کی غلامی کی طرف اور دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت اور کشادگی کی طرف اور مذاہب وادیان کے ظلم وستم سے نکال کر اسلام کے عدل وانصاف کی طرف لایا۔

◆ استاذ : المعہد العالی امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس روئے زمین پر صالح انقلاب برپا کرنے اور ایمانی وانسانی صفات سے متصف انسانی معاشرہ تعمیر کرنے میں سب سے زیادہ کامیابی نبی آخرالزماں ﷺ کے حصہ میں آئی اور پہلی صدی ہی میں یہ دین ایشیا کے حدود سے تجاوز کر کے افریقہ اور یورپ تک جا پہنچا، اس سرعت اور تیزی کے ساتھ دین حق کی اشاعت جہاں عام انسانوں کے لئے فالِ نیک تھی، وہیں دیگر ادیان ومذاہب کے پیروکاروں کے لئے حسد ورقابت اور بغض وعناد کا سبب بھی بنی، یوں تو اہل کتاب میں جو حضرات سلیم الطبع، منصف مزاج اور حق کے متلاشی تھے، انھوں نے دین حق اور نبی برحق کی پیروی کی؛ لیکن اکثریت نے نے روایتی تعصب اور بغض وحسد کی بنیاد پر حق کا انکار کیا اور اسلام کے پھیلاؤ کو روکنے اور پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کے لئے غلط پروپیگنڈوں کا سہارا لیا اور تعدد ازواج النبی ﷺ کے مسئلہ کو لے کر ان کی مقدس ذات پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی، خصوصاً مغرب کے موجودہ ملحدین ومستشرقین نے، اور وہ اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ انبیاء بنی اسرائیل ہی تعدد ازدواج کی سنت پر زیادہ عمل پیرا رہے ہیں، اس طرح انھوں نے خود اپنے انبیاء علیہم السلام کو بھی تنقید وتنقیص کا نشانہ بنایا، بائبل کے بیان کے مطابق سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام جو یہود ونصاریٰ اور مسلمان تینوں کے مورث اعلیٰ اور جد امجد ہیں ان کی تین بیویاں تھیں: سارہ، ہاجرہ اور قتورہ خاتون، حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں: لیاہ، زلفہ، راخل اور بلہہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی چار بیویاں تھیں: سفورہ خاتون، حبشہ، بنت قلینی اور بنت حباب، (۱) اور ان کے لئے بے تعداد بیویوں کا جواز تھا۔(۲)

حضرت داؤد علیہ السلام کی سو بیویاں تھیں جن میں سے نو بیویوں کے نام بائبل میں مذکور ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک ہزار عورتیں تھیں: سات سو جوروئیں اور تین سو حرمیں تھیں۔(۳)

اس لئے اگر آج کوئی عیسائی تعدد ازدواج کی بنیاد پر آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے تو وہ صرف ان پر نہیں؛ بلکہ سیدنا حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام ان سب کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے، عرب کے ایک مشہور رائٹر اور اسلامی اسکالر ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم نے اپنی کتاب ''المرأۃ بین الفقہ والقانون'' میں اپنا ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> جب میں ۱۹۵۶ء میں آئرلینڈ میں تھا تو عیسائی پادریوں کے ایک ادارہ میں جانے کا اتفاق ہوا، اس موقع پر ادارہ کے ناظم کے ساتھ میری طویل گفتگو ہوئی، میں نے ان سے

---

(۱) قاضیون: ۱۶/۱-۴۔ (۲) کتاب استثناء: ۲۱/۱۰ تا ۱۳۔

(۳) سلاطین: ۳/۱۱، بحوالہ رحمۃ للعالمین، قاضی سلیمان منصور پوریؒ۔

دریافت کیا کہ آپ لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف ایسے اعتراضات کیوں کرتے ہیں جو اس دور کے لحاظ سے کسی طرح مناسب نہیں؛ کیوں کہ یہ تو ایسا دور ہے جس میں مختلف قومیں ایک دوسرے سے متعارف ہورہی ہیں اور مختلف تہذیب وتمدن باہم گلے مل رہے ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ ہم اہل مغرب کسی ایسے شخص کو لائق احترام نہیں سمجھتے، جس نے نو شادیاں کی ہوں، میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ لوگ اللہ نبی حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا احترام کرتے ہیں؟ تو انھوں نے کہا ضرور! یہ دونوں بنی اسرائیل کے معزز پیغمبر اور تورات کی محترم شخصیت ہیں، میں نے کہا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی سو بیویاں تھیں، جیسا کہ سب کو معلوم ہے اور تورات کی تصریح کی رُو سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی سات سو آزاد بیویاں اور تین سو باندیاں تھیں اور وہ سب اپنے زمانے کی حسین وجمیل خواتین تھیں، تو جب سو اور ایک ہزار عورتیں رکھنے والے آپ کے احترام کے مستحق ہیں تو پھر نو شادیاں کرنے والے نبی سے آپ کو نفرت کیوں ہے؟ جب کہ ان نو میں ایک کے سوا سب شادی شدہ بیوہ اور کئی ایک تو بوڑھی تھیں؟ اس پر وہ خاموش ہوگئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔

انبیاء علیہم السلام کا طریقہ تجرد کی زندگی گزارنا نہیں ہے، اگر وہ ایسا کرتے تو ان کی زندگی عام لوگوں کے لئے کیوں کر نمونہ ہوتی، جو بال بچے رکھتے ہیں اور بشری تقاضوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

بہر حال نبیوں کا ازدواجی زندگی گزارنا مقاصد نبوت کے خلاف نہیں تھا؛ بلکہ اس کے موافق ومعاون تھا؛ تاکہ وہ اپنی بیویوں کے ذریعہ اُمت کی عورتوں کی اصلاح وتربیت کا کام لیں، اگر یہ چیز فرائض نبوت کے منافی ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کا حکم ہی کیوں دیتا؟ چنانچہ وہ خود ارشاد فرماتے ہیں :

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ۔ (۱)

اور تحقیق کہ ہم نے آپ سے قبل بہت سے رسول بھیجے اور انھیں بیویاں اور اولاد دیں۔

نبی آخر الزماں ﷺ کوئی انوکھے نبی نہیں تھے کہ ان کی سنت کی خلاف ورزی کرتے؛ بلکہ آپ نے سابق انبیاء ہی کے طریقہ پر اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کیا، آپ ﷺ کا ارشاد ہے :

(۱) الرعد:۳۸۔

ما تزوجت شيئاً من نسائي ولا زوجت شيئاً من بناتي إلا باذن جاء به جبرئيل عليه السلام عن الله عز وجل ۔ (۱)

میں نے کسی عورت سے نکاح نہیں کیا اور نہ اپنی بیٹیوں میں سے کسی کا نکاح کرایا، مگر اس وحی کی بنیاد جو جبرئیل السلام میرے رب کی طرف سے لے کر آئے۔

رسول اللہ ﷺ نے متعدد شادیاں ضرور کی ہیں، مگر عمر کے بالکل آخری مرحلہ میں یعنی ۵۴ سال کے بعد، اس لئے اس کی بنیاد پر آپ ﷺ پر شہوت پرستی کا الزام یا تو سراسر جہالت پر مبنی ہے یا تعصب اور عناد پر، ورنہ آپ کی شادیوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے مخالفین کا یہ الزام کافور ہو جاتا ہے، آج سے چودہ صدی قبل کے اس عالمگیر فساد کا تصور کیجئے جسے قرآن کریم نے ''ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ'' (۲) کے بلیغ پیرائے میں بیان کیا ہے اور بالخصوص جزیرۃ العرب تو اس بگاڑ میں سب سے آگے تھا، اس برائی اور فحاشی کے ماحول میں بھلا عفت وعصمت اور اخلاقی پاکیزگی کا کیا تصور کیا جا سکتا ہے؛ لیکن آنحضور ﷺ کی زندگی بچپن سے لے کر بڑھاپے تک بے داغ اور گفتار وکردار ہر لحاظ سے بے مثال تھی اور اس پر تمام مسلم اور غیر مسلم سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ مکہ معظّمہ میں آپ کے قیام کی مدت ترپن سال ہے، چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی اور آپ نے دین کی تبلیغ کا کام شروع کیا تو قوم نے مخالفت کی، چالیس سال کی عمر تک آپ کی شخصیت غیر مختلف فیہ تھی، آپ صحت وتوانائی، حسب ونسب، حسن وجمال اور اخلاق وعادات کے لحاظ سے قریش کے نوجوانوں میں ممتاز تھے، اور پورے مکہ میں کسی اعتبار سے آپ کا کوئی مدمقابل نہیں تھا، اس لئے پوری قوم میں آپ ہر دل عزیز تھے، اسی بنا پر قوم نے آپ کو صادق اور امین کا لقب دیا تھا، یہ دونوں الفاظ کوئی ہلکے اور معمولی نہیں ہیں ؛ بلکہ ان میں آپ کی شخصیت کا مکمل تعارف ہے، انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں قولی اور عملی یا گفتار وکردار، صادق کا لفظ گفتار اور قول وقرار کی پاکیزگی کو بتلاتا ہے تو امین کا لفظ عمل اور کردار کی عظمت وتقدس اور بلندی وبرتری کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا پہلا اور دوسرا نکاح

پچیس سال کی عمر تک آپ نے تجرد کی زندگی گذاری، پھر نکاح کے لئے ایک ایسی معمر اور بیوہ خاتون کا انتخاب فرمایا جن کی عمر اس وقت چالیس سال تھی یعنی حضرت خدیجہؓ اور اس سے قبل ان کے دو شوہر وفات پا چکے تھے، اور ان دونوں سے حضرت خدیجہؓ کے پانچ بچے تھے، تیسرا نکاح آنحضور ﷺ سے ہوا اور آپ نے مکمل پچیس

(۱) کنز العمال، کتاب الفضائل، حدیث نمبر: ۳۴۱۴۷، تاریخ دمشق لابن عساکر: ۶۹/۱۶۹۔

(۲) الروم: ۴۱۔

سال تنہا حضرت خدیجہؓ کے ساتھ گذارا کیا، ان کی زندگی میں کوئی دوسری شادی نہیں کی، نبوت کے دسویں سال یعنی ۶۵ رسال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا، جب کہ آنحضور ﷺ کی عمر اس وقت پچاس سال تھی، چچا ابوطالب کا انتقال بھی اسی سال ہوا، قریش کی یہ دونوں ہی محترم شخصیتیں اسلام کے لئے ڈھال بنی ہوئی تھیں، ان دونوں کے ایک ساتھ اُٹھ جانے کے بعد غم کے بادل چھا گئے اور قریش کی مخالفت شدید سے شدید تر ہوگئی، گھر کے اندر چار بیٹیاں جن کی اندرون خانہ دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا، باہر مخالفتوں کا طوفان، دعوت وتبلیغ کی گراں بار ذمہ داریاں الگ، ضرورت تھی کہ فوری طور پر دوسرے نکاح کے لئے قدم اُٹھایا جائے۔

حضرت عثمان بن مظعونؓ کی بیوی حضرت خولہؓ، حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے کچھ دنوں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انھوں نے شادی کے سلسلے میں آپ سے گفتگو کی، آپ ﷺ نے انھیں اس کا اختیار دے دیا، انھوں نے حضرت سودہ بنت زمعہؓ کو پیغام نکاح دیا، جو سن رسیدہ اور آپ پر پیشگی ایمان لانے والی تھیں، اس انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ یہ اپنے شوہر سکران بن عمرو کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گئی تھیں، مکہ واپس آنے کے بعد ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا، ان کے خاندان کے لوگ شرک پر قائم تھے، اس لئے وہ لاوارث اور بے سہارا تھیں، آنحضور ﷺ نے ان سے عقد نکاح فرما کر ان کی تسلی اور دل داری فرمائی اور ان کی جان وایمان کو فتنہ سے بچالیا، پھر پورے چار سال تک تنہا آپ کی زوجیت میں رہیں، حضرت عائشہؓ بنت ابی بکرؓ سے نکاح مکہ میں ہو چکا تھا؛ لیکن رُخصتی ہجرت کے بعد شوال ۱ رہجری میں ہوئی، (۱) ان دونوں ہی شادیوں اور دونوں خواتین کے حالات پر نظر ڈال کر کوئی انصاف سے بتائے کہ اس میں تعیش، زن پرستی اور شہوت رانی کا کونسا پہلو نکلتا ہے، شہوت پرست لوگ پچیس سال تک تجرد کی زندگی گذارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے، پھر ان کی کوٹھیاں نوخیز اور حسین وجمیل دوشیزاؤں سے آباد ہوتی ہیں، نہ کہ سن رسیدہ اور صاحب اولاد بیواؤں سے، وہ شادی سے قبل اور شادی کے بھی جنسی بے راہ روی کا شکار ہوتے ہیں، اخلاقی تقدیس اور عفت وپاکدامنی کا کوئی تصور ان کے یہاں نہیں ہوتا، اور نبی کا دامن عفت اگر داغ دار ہو تو وہ کس منھ سے روحانیت، تحفظ اخلاق اور پاکدامنی کی لوگوں کو تعلیم دے سکتا ہے اور کون اس کے قریب پھٹک سکتا ہے؟

تعدد ازدواج ہجرت کے بعد

ازدواجی لحاظ سے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو ہم چار مرحلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، پہلا مرحلہ ۲۵ سال تک کا ہے جو تجرد کی نذر رہا، دوسرا مرحلہ ۲۶ سے ۵۴ سال تک کا ہے جس میں بیک وقت دو بیویاں آپ کے تصرف میں

(۱) المختصر الکبیر فی سیرۃ الرسول: ۱ / ۹۲۔

جمع نہیں ہوئیں، تیسرا مرحلہ ۵۴ سے لے کر ۶۰ سال تک کا ہے؛ اسی تیسرے مرحلہ میں آپ کی اکثر شادیاں ہوئیں، جس کا آغاز حضرت عائشہؓ کی رُخصتی سے ہوا، تیسری شادی حضرت حفصہ بنت عمرؓ سے ۳ھ میں ہوئی، جن کے شوہر حضرت خنیس ابن حذافہ بن قیس صاحب الہجرتین اور سابقین اولین میں سے تھے، غزوۂ اُحد میں زخمی ہوکر وفات پا گئے، حضرت عمرؓ اپنی بیٹی کے بارے میں فکر مند تھے اور مناسب رشتے کی تلاش میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ۳ھ میں یہ تقریب سعید انجام پا گئی، ۳ھ ہی میں چوتھا نکاح اُم المساکین حضرت زینب بنت خزیمہ کے ساتھ ہوا، ان کا پہلا نکاح طفیل اور دوسرا نکاح عبیدہ سے ہوا تھا، یہ دونوں حضرت عبد المطلب کے سب سے بڑے صاحبزادہ حارث کے بیٹے اور آنحضور ﷺ کے چچا زاد بھائی ہیں، ان کا تیسرا نکاح حضرت عبداللہ بن جحش کے ساتھ ہوا تھا جو آنحضور ﷺ کے پھوپھی زاد اور اُم المومنین حضرت زینب کے سگے بھائی تھے، غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے تو چوتھا نکاح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوا، نکاح کے بعد صرف تین ماہ یا آٹھ ماہ آپ کے ساتھ رہ کر وفات پا گئیں، ۴ھ میں حضرت اُم سلمہؓ سے پانچواں نکاح ہوا جن کے شوہر ابوسلمہؓ غزوۂ اُحد میں شہید ہو گئے تھے، یہ بھی سن رسیدہ اور کثیر العیال تھیں، حضرت ابوسلمہؓ آنحضور ﷺ کی سگی پھوپھی برہ بنت عبد المطلب کے بیٹے اور آپ ﷺ کے رضاعی بھائی بھی تھے، اس لئے آپ ﷺ نے ان کی بیوہ کی تسلی و دلداری اور ان کے یتیم بچوں کی کفالت وتربیت کی خاطر ان سے نکاح فرمایا، یہ نکاح ان لوگوں کے لئے نمونہ ہے جن کے نکاح میں ایسی بیوہ خواتین ہوں جو عیال دار ہوں، آپ ﷺ کی عمر کے ۵۸ سال تک یہ چار بیویاں نکاح میں رہیں جس کی اجازت اُمت کے عام مردوں کے لئے بھی ہے، تیسرے مرحلہ میں چھٹی شادی آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہؓ کی مطلقہ حضرت زینب بنت جحشؓ کے ساتھ غزوۂ خندق کے بعد ۵ ہجری میں ہوا، جو آپ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، یہ نکاح اللہ کے حکم سے زمانۂ جاہلیت کے رسم تبنیت کے ختم کرنے کے لئے ہوا جس کا رواج عرب معاشرہ میں بڑے وسیع پیمانے پر تھا، ساتواں نکاح ۶ھ میں غزوۂ بنی مصطلق کے بعد حضرت جویریہؓ سے ہوا، ۷ھ میں آٹھواں نکاح حضرت اُم حبیبہؓ بنت ابی سفیان کے ساتھ ہوا اور اسی ۷ھ ہی میں نواں نکاح غزوۂ خیبر کے بعد حضرت صفیہؓ بنت حی بن اخطب کے ساتھ ہوا اور اسی ۷ھ کے اخیر میں دسواں نکاح حضرت میمونہ بنت حارث کے ساتھ ہوا جو آپ کا آخری نکاح ہے جو اصل ترتیب کے لحاظ سے گیارہواں اور زندہ ازواج مطہرات کے لحاظ سے نواں نکاح ہے، اس کے بعد ہی سورۂ احزاب کی آیت: ''لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۢ بَعْدُ'' (۱) نازل ہوئی، یعنی اس کے بعد آپ ﷺ کے لئے کسی عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے، اس وقت آپ کی عمر ساٹھ سال تھی، چوتھا مرحلہ ساٹھ سے لے کر تریسٹھ تک کا ہے جس میں آپ نے کوئی نکاح نہیں فرمایا۔

---

(۱) الاحزاب: ۵۲۔

بلوغ سے سے لے کر پچاس سال کی عمر تک جنسی خواہش اور صنفی میلان اپنے شباب پر ہوتا ہے، اسی مرحلے میں انسان کو جنسی تسکین کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے، بلوغ عام طور پر پندرہ سال کی عمر میں ہوجایا کرتا ہے، اس اعتبار سے بلوغ کے بعد دس سالہ دور جو عنفوان شباب کا ہے، آپ ﷺ نے تجرد کی نذر کیا، پھر پچیس سے لے کر پچاس سال تک حضرت خدیجہؓ کے ساتھ بسر کیا جن کے بارے میں گذر چکا کہ وہ بیوہ، سن رسید اور پانچ بچوں کی ماں تھیں اور آپ ﷺ سے عمر میں پندرہ سال بڑی تھیں، کیا کوئی شہوانیت کا دلدادہ نکاح کے لئے ایسی خاتون کو پسند کرسکتا ہے اور پورا عہد اس کے ساتھ بسر کرسکتا ہے؟ پھر ان کے انتقال کے بعد آپ نے انھیں جیسی معمر اور بیوہ خاتون حضرت سودہؓ سے نکاح کیا اور پھر چار سال تک وہ اکیلی آپ ﷺ کی رفیقۂ حیات رہیں، آپ کی شادی کے یہ دونوں ہی واقعے آپ کی شرافت و پاکیزگی، بےنفسی اور جنسی خواہش کے معاملہ میں غایت اعتدال، صبر وقناعت اور ضبط نفس کی دلیل ہیں، مگر افسوس کہ مغربی مفکرین کو ان واقعات میں بھی شہوانیت کا غلو نظر آتا ہے، آپ کی شادی کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ ٹھیک اس سے برعکس نتائج نکلتے ہیں جو مخالفین اس سے نکالنا چاہتے ہیں، کسی شہوت پرست انسان کے بارے میں یہ سوچا ہی نہیں جاسکتا کہ وہ عرب کے گھناؤنے اور شہوانی ماحول میں اپنے دامن عصمت کو داغدار ہونے سے بچائے رکھے، پھر شباب کی اُمنگوں کے برلانے کا زمانہ تجرد کی حالت میں گذار کر نکاح کے واسطے معمر اور بیوہ خاتون کا انتخاب کرے، پھر پچیس سال اس کے ساتھ اس طرح زندگی گذارے کہ کسی دوسری خاتون کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھے اور نہ دوسری شادی کا خیال دل میں لائے، کوئی منصف مزاج انسان یہ باور نہیں کرسکتا کہ ۵۴ سال کی عمر تک ایک شخص جنسی معاملے میں محتاط رہے اور بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھنے کے بعد یکایک اس کی نفسانی خواہش بڑھتی چلی جائے، اس لئے وہ متعدد نکاح کرنے پر مجبور ہوجائے، عمر کی اس منزل میں قدم رکھنے کے بعد تو ان لوگوں کی خواہشات بھی مضمحل ہوجاتی ہیں جو جوانی کے دور میں غیر محتاط اور بے راہ روی کا شکار ہوتے ہیں، بہر حال عمر کے آخری آٹھ سالہ دور میں جو پیغمبر اسلام ﷺ نے متعدد شادیاں کیں ان کے پیچھے ہرگز مادی محرکات وعوامل کارفرما نہ تھے؛ بلکہ وہ دینی، دعوتی، تبلیغی، اجتماعی، اصلاحی اور سیاسی اغراض کی خاطر تھیں اور ان تمام شادیوں میں اسلام اور اُمت اسلامیہ کے لئے خیر وخوبی اور برکت وسعادت مضمر تھی۔

دعوتی، تعلیمی اور اصلاحی مصلحت

ان شادیوں کا سب سے بڑا مقصد عورتوں کی اصلاح، ان کی تعلیم وتربیت اور ان کے درمیان احکام شریعت کی تبلیغ تھا، حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے آخری پیغمبر کی حیثیت سے قیامت تک کے انسانوں کے لئے نمونہ بنا کر مبعوث فرمایا تھا، آپ ﷺ کی ذمہ داری تھی کہ اپنی تعلیم وتربیت سے ایک ایسی مقدس جماعت تیار کریں

جو اپنے مثالی اخلاق وکردار کے لحاظ سے پوری انسانیت کے لئے نمونہ ہو اور ہر دور ہر قوم اور ہر ملک کے لوگ رہتی دنیا تک ان کی پیروی کرتے رہیں اور ابتداءً جس قوم کی تعلیم وتربیت آپ کے سپرد کی گئی تھی وہ ان پڑھ اور تہذیب وتمدن سے قطعاً نا آشنا تھی، ایسی وحشی، ناخواندہ اور گنوار قوم کو پیغمبرانہ تعلیم وتربیت کے ذریعہ مہذب اور شائستہ بنانا اور دنیا کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کرنا تھا، رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے اسی مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا :

> هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ (۱)
>
> (اللہ) ہی ہے جس نے ان پڑھوں میں انھیں میں سے ایک رسول بھیجا جو انھیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کی زندگی بناتا اور سنوارتا ہے اور اللہ کی کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے؛ حالاں کہ وہ لوگ اس سے قبل کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے تھے۔

مرد وعورت انسانی معاشرہ کے دو اہم ستون ہیں، کسی بھی معاشرہ کی مکمل اصلاح عورتوں کی صحیح تعلیم وتربیت کے بغیر نہیں ہوسکتی، تنہا مردوں کی تعلیم وتربیت، پورے معاشرہ کی اصلاح کی ضامن نہیں ہوسکتی اور عورتوں کی مکمل اصلاح عورتوں ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے؛ کیوں کہ عورتیں زیادہ تر عورتوں ہی کا اثر قبول کرتی ہیں، عام طور پر عورتوں میں جو بھی سدھار یا بگاڑ رُونما ہوتا ہے وہ عورتوں ہی کے ذریعہ ہوتا ہے، اس لئے عورتوں کی اصلاح وتربیت کے لئے عورتیں ہی زیادہ مناسب ہوسکتی ہیں اور معاشرتی اصلاح کے لئے مردوں سے زیادہ عورتوں کی تربیت ضروری ہے، اس لئے کہ بچے ان ہی کی گود میں پرورش پاتے ہیں، ماں اگر اچھی اور تربیت یافتہ ہوگی تو اس کے بچے بھی شائستہ اور مہذب ہوں گے اور بچوں کی اصلاح وتربیت سے آئندہ نسل کی اصلاح ممکن ہے، اس مقصد کے لئے ضرورت تھی کہ آپ ﷺ مختلف عمروں اور مختلف صلاحیتوں کی حامل متعدد خواتین کو اپنے نکاح میں لائیں اور اس طرح براہ راست ان کی تربیت فرما کر عورتوں کی اصلاح کے لئے ان کو تیار کریں اور ظاہر ہے کہ عرب کے تمام قبائل کے درمیان عورتوں کی اصلاح وتربیت کا کام تنہا کسی ایک عورت سے انجام نہیں پاسکتا تھا، خصوصاً آنحضور ﷺ کی حیات مبارک کے آخری دور میں جب کہ جوق در جوق لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے تھے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے مختلف عمروں اور صلاحیتوں کی حامل خواتین کو متفرق قبائل عرب سے چن کر اپنی زوجیت میں جمع فرمایا اور ان کی مکمل

(۱) الجمعة: ۲۔

تربیت فرما کرانھیں عورتوں کے لئے قابل تقلید نمونہ اوران کی تربیت کا ذریعہ بنایا، جن سے آپ ﷺ کی زندگی میں بھی اور آپ کے روپوش ہوجانے کے بعد بھی عورتوں میں احکام شریعت کی تبلیغ واشاعت ہوئی اور ان کی اصلاح وتربیت کا مقدس فریضہ انجام پایا؛ چنانچہ عورتوں سے متعلق مخصوص مسائل مثلاً طہارت، حیض ونفاس، جنابت، حمل، ولادت، رضاعت، حضانت (بچوں کی پرورش و پرداخت) وغیرہ کے مسائل زیادہ تر ان ہی کے واسطے سے مرتب اور مدون ہوئے۔

بہر حال حیات طیبہ کے آخری دور میں ازواج مطہرات کی تعداد میں اضافہ اسی دعوتی، اصلاحی اور تربیتی مقصد کے تحت تھا اور شاید اسی مقصد کے پیش نظر آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد آپ کی ازواج مطہرات سے نکاح کو حرام قرار دیا گیا؛ تاکہ وہ پیغمبر ﷺ کے پردہ فرما جانے کے بعد اُمت اور بالخصوص عورتوں کی تعلیم وتربیت کے لئے پوری طرح یکسو اور فارغ رہ سکیں اور نئی ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں اس اہم دینی فریضہ کی ادائیگی میں مزاحم اور مانع نہ بنیں، ظاہر ہے کہ اتنا اہم اور عظیم الشان کام ایک دو عورتوں کے ذریعہ انجام نہیں پاسکتا تھا؛ اس کے لئے عورتوں کی ایک جماعت درکار تھی، ہجرت کے بعد آپ ﷺ نے جو متعدد شادیاں کیں ان کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا۔

سیاسی حکمت

رشتۂ نکاح ہر زمانہ میں افراد واقوام اور مختلف خاندانوں اور قبیلوں کے درمیان باہمی روابط کو مستحکم کرنے اور نفرت وعداوت کو ختم کرنے کا ذریعہ رہا ہے؛ اس لئے مختلف زمانوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ قوموں کے سربراہوں اور ممالک کے حکمرانوں نے رشتۂ مصاہرت کے ذریعہ اپنے وزیروں اور محکوم قوموں کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کئے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی متعدد شادیوں میں بھی دیگر مصالح کے ساتھ یہ مصلحت کارفرما رہی؛ چنانچہ آنحضور ﷺ نے اپنے پہلے دونوں خلیفہ اور وزیر حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ اپنے تعلقات کو مضبوط ومستحکم کرنے کے لئے ان کی بیٹیوں حضرت عائشہؓ وحضرت حفصہؓ سے نکاح کیا اور اسی مقصد کے تحت آپ ﷺ نے اپنی دوسری اور تیسری بیٹی حضرت رقیہؓ اور اُم کلثومؓ کا نکاح یکے بعد دیگرا اپنے تیسرے خلیفہ اور وزیر حضرت عثمانؓ کے ساتھ کردیا، اسی طرح آپ نے سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کی شادی اپنے چوتھے خلیفہ اور وزیر حضرت علیؓ بن ابی طالب کے ساتھ کردی، اس طرح مصاہرت کے اس مبارک رشتہ نے پیغمبر اسلام کو اپنے بڑے اور اسلام کی طرف سبقت کرنے والے اصحاب کے ساتھ جوڑ دیا۔

مشرک اور یہود قبائل کی خواتین سے نکاح کا اثر

اسی طرح اسلام دشمن قبائل کی مخالفتوں کو ختم کرنے اور اسلام کے تئیں ان کی پالیسی کو نرم کرنے کے لئے بھی

آپ نے بعض شادیاں کیں، کیوں کہ عرب کے دستور اور قدیم روایات کے مطابق جو شخص کسی قبیلہ کی خاتون سے نکاح کرتا وہ صرف اس منکوحہ کے خاندان ہی کا نہیں؛ بلکہ پورے قبیلہ کا داماد سمجھا جاتا تھا اور داماد سے لڑنا ان کے نزدیک بڑی ہی شرم وعار کی بات تھی۔

چنانچہ ۷ ہجری میں آپ ﷺ نے حضرت اُم حبیبہؓ بنت ابی سفیان سے شادی کی جو آپ پر پیشگی ایمان لانے والوں میں تھیں، یہ اپنے شوہر عبید اللہ بن جحش کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گئی تھیں، وہاں شوہر کے انتقال کے بعد بے سہارا تھیں، آپ نے انھیں پیغام نکاح بھیجا، شاہ حبش نجاشی کے توسط سے یہ نکاح ہوا اور انھوں نے محفوظ طریقہ پر مدینہ بھیج دیا، حضرت ابوسفیان اس وقت مشرکین کے قائد اعظم اور اسلام کے کٹر مخالف تھے، مگر اس نکاح کے بعد وہ بالکل نرم پڑ گئے اور پھر کبھی اسلام کے خلاف میدانِ میں نہیں آتے اور اس رشتہ پر اپنی رضامندی ظاہر کی اور کچھ ہی عرصہ کے بعد فتح مکہ کے موقع پر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

یہودی قبائل بڑی تعداد میں مدینہ اور اس کے قرب وجوار میں آباد تھے، وہ اسلام کے کٹر دشمن تھے اور آئے دن اسلام کے خلاف کوئی نہ کوئی سازش رچا کرتے تھے، ان کی شرارت اور عہد شکنی کی وجہ سے آپ نے ان کے بعض قبائل کو مدینہ سے جلاوطن کیا تھا، مگر ان کی اسلام دشمنی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، غزوۂ خیبر کے قیدیوں میں حضرت صفیہؓ باندی کی حیثیت سے آپ کے قبضہ میں آئیں، آپ نے انھیں آزاد فرما کر ان سے نکاح کر لیا، سیاسی طور پر اس کی یہ فائدہ ہوا کہ قوم یہود کی دشمنی کا زور ٹوٹ گیا، جب کہ اس سے قبل اسلام اور کفر کے درمیان ہونے والی ہر جنگ میں انھوں نے دشمنوں کا ساتھ دیا تھا اور ہر لڑائی میں وہ علانیہ یا در پردہ مشرکین کے ساتھ رہے تھے۔

حضرت میمونہؓ سے شادی کا فائدہ

اسی طرح بعض قبائل کو اسلام کی طرف مائل کرنے میں بعض شادیوں کا بڑا اچھا اثر پڑا، ۷ ہجری میں مشرکین کے ساتھ معاہدہ کی رُو سے جب آنحضور ﷺ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ معظّمہ عمرۃ القضاء کے لئے تشریف لے گئے اور تین دنوں وہاں قیام فرمایا تو ان کی ایمانی، روحانی اور اخلاقی حالت سے متاثر ہو کر کچھ مشرکین نے شرک سے توبہ کر کے اسلام قبول کر لیا، انھیں اسلام قبول کرنے والیوں میں ایک مبارک ذات حضرت میمونہؓ بنت حارث کی تھی جو آپ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کی سالی تھیں اور بیوہ تھیں، حضرت عباسؓ نے جو ان کے ذمہ دار تھے، ان سے نکاح کی پیشکش کی، آنحضور ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ فراست سے محسوس کر لیا کہ یہ شادی بابرکت اور دُوررس نتائج کی حامل ہوگی، بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ آپ کا اندازہ بالکل صحیح تھا، اس نکاح سے اگر ایک طرف قریش کی اس معزز خاتون کی تعظیم وتکریم ہوئی تو دوسری طرف اس خاندان کی حمایت آپ کے ساتھ ہوگئی اور اس

خاندان کے متعدد بااثر افراد حلقہ بگوش اسلام ہوگئے، جن میں حضرت میمونہؓ کے بھانجے حضرت خالد بن ولیدؓ اوراس خاندان کے ایک معزز فرد حضرت عمرو بن العاصؓ (فاتح مصر) اور کعبہ شریف کے متولی اور کلید بردار حضرت عثمان بن طلحہؓ وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس نکاح کا دوسرا زبردست فائدہ یہ ہوا کہ اس نے نجد میں اسلام کی دعوت واشاعت کی راہ ہموار کردی؛ کیوں کہ حضرت میمونہؓ کی ایک بہن ایک نجدی سردار کے نکاح میں تھیں، اس قرابت کے نتیجہ میں رؤسائے نجد اسلام اور پیغمبر اسلام سے قریب ہوئے اور رفتہ رفتہ پورا نجد اسلام کی آغوش میں آ گیا، جب کہ یہی اہل نجد تھے جو متعدد بار عہد شکنی کے مرتکب ہوئے تھے اور ستر مبلغین اسلام کو دھوکہ دے کر قتل کیا تھا۔

حضرت جویریہؓ سے شادی کا فائدہ

غزوۂ بنی مصطلق کے بعد اس قبیلے کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی حضرت جویریہؓ آپ کے نکاح میں آئیں، غزوۂ خندق کے بعد رسول اللہ ﷺ کو یہ اطلاع پہنچی کہ قبیلہ بنی مصطلق اپنے سردار کی قیادت میں مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں، ان کے حملہ سے قبل رسول اللہ ﷺ اپنے سو اصحاب کے ساتھ اس قبیلہ پر حملہ آور ہوئے، مریسیع نامی چشمہ یا تالاب کے پاس یہ جنگ ہوئی، اسی لئے اسے غزوۂ مریسیع بھی کہا جاتا ہے، اس لڑائی میں اس قبیلے کو شکست ہوئی، ان کے دس افراد مارے گئے اور سو گھرانے گرفتار ہوئے، ان گرفتار ہونے والوں میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں، جن کے شوہر مسافع بن صفوان مصطلقی اس غزوہ میں مارے گئے اور والد حارث بن ابی ضرارہ میدان چھوڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہوگئے، جب رسول اللہ ﷺ نے مالِ غنیمت (جو بڑی مقدار میں حاصل ہوا تھا) اور قیدیوں کو مجاہدین کے درمیان تقسیم فرمایا تو یہ حضرت ثابت بن قیسؓ کے حصہ آئیں، انھوں نے حضرت ثابت بن قیسؓ کو کتابت پر راضی کرلیا کہ کچھ رقم لے کر انھیں آزاد کردیں، وہ رقم کی فراہمی کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ سے اپنی حالت کا تذکرہ کرکے مدد کی خواستگار ہوئیں، بالآخر بات یہ طے ہوئی کہ آپ ان کی طرف سے بدل کتابت ادا کرکے ان سے نکاح فرمالیں اور اس طرح وہ مسلمان ہوکر حرم نبوت میں داخل ہوگئیں، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جب مسلمانوں کو اس نکاح کی خبر ہوئی تو انھوں نے اس قبیلے کے تمام قیدیوں کو یہ کہہ کر آزاد کردیا کہ اب یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے رشتہ دار ہوگئے؛ لہٰذا انھیں غلام بنائے رکھنا مناسب نہیں، حضرت عائشہؓ ان کے بارے میں فرماتی ہیں:

قالت : فلقد أعتق بتزويجه إياها مائة أهل بيت من بني المصطلق ، فما أعلم امرأة أعظم بركة على قومها منها ۔ (۱)

---

(۱) البداية والنهاية لابن كثير : ۴/۱۵۹۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کے جویریہ سے نکاح کر لینے سے بنی مصطلق کے سوگھرانے آزاد
ہوئے ، میں نے کوئی عورت ایسی نہیں دیکھی جو جویریہ سے بڑھ کر اپنی قوم کے لئے
بابرکت ثابت ہوئی ہو۔

پس اس شادی کا مقصد حضرت جویریہؓ کو جو اپنی قوم کے سردار کی بیٹی تھیں ، غلامی کے ذلت سے نکال کر شرف وعزت عطا کرنا اور اس قبیلہ کو اسلام کی طرف مائل کرنا تھا ، الحمدللہ اس شادی سے یہ دونوں ہی مقاصد پورے ہوئے ، مزید فائدہ یہ ہوا کہ یہ قبیلہ ڈاکہ زنی میں بھی مشہور تھا ، اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے قزاقی چھوڑ کر متمدن زندگی اختیار کر لی۔

سماجی مصلحت

مکہ معظّمہ میں جب مسلمانوں کے ساتھ مشرکین کی زیادتی حد سے آگے بڑھ گئی اور ان کی ایذا رسانی ناقابل برداشت ہوگئی تو وہ ترک وطن پر مجبور ہوئے اور مدینہ منورہ میں آ کر پناہ لی ؛ لیکن یہاں بھی دشمنوں نے انھیں چین سے رہنے نہیں دیا اور چھیڑ چھاڑ اور جنگ وجدال کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا ، تعداد کی قلت ، معاشی بدحالی اور سامان جنگ کی قلت کے باوجود مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں اُترنا پڑا ، متعدد خوفناک لڑائیاں ہوئیں جن میں اسلام کے جانباز مجاہدین کام آئے ، دین کی راہ میں ان کی زبردست قربانیاں تھیں ، پھر ان کی بیواؤں اور یتیم بچوں کی کفالت کا مسئلہ تھا ، رسول اللہ ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ بصیرت سے ان مشکلات کا حل تلاش کیا اور اپنے بہت سے اصحاب کو آمادہ کر کے ایسی بہت سی بیواؤں کا ان سے نکاح کر دیا اور خود بھی ایسی متعدد بیواؤں سے نکاح کیا جن کے شوہر جہاد میں شہید ہوئے تھے اور وہ معمر تھیں ؛ کیوں کہ آپ کی ذات ایسے لوگوں کے لئے سہارا تھی ، جن کا کوئی سہارا نہ ہو ، اس سلسلے میں حضرت اُم سلمہؓ اور حضرت حفصہؓ کا نام لیا جاسکتا ہے کہ ان دونوں کے شوہر حضرت ابوسلمہؓ اور خنیس بن حذافہؓ غزوۂ اُحد میں زخمی ہوئے تھے ، پھر یہی ان کی شہادت کا سبب بنا ، اسی طرح حضرت زینبؓ بنت خزیمہ کے سابق شوہر حضرت عبداللہ بن جحشؓ غزوۂ بدر میں شہید ہوئے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے رمضان ۳ھ میں ان سے نکاح کیا ، یہ ایک دینی ضرورت اور سماجی مصلحت ہے ، جس کی خاطر آپ نے یہ نکاح فرمایا ، یہ آپ کی ایمانی بصیرت ، انسانی ہمدردی وخیر خواہی اور اخلاق وکردار کی بلندی کی دلیل ہے نہ کہ شہوت پرستی کی۔

تشریعی اور قانونی حکمت

رسول اللہ ﷺ کی بعض شادیوں کا مقصد زمانۂ جاہلیت میں پھیلی ہوئی بعض بدعات اور غلط رسوم ورواج کا

ازالہ تھا، عرب معاشرہ میں غلاموں کو ذلت وحقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، آزاد ہونے کے بعد بھی انھیں سماج میں عزت کا مقام حاصل نہ ہوتا، اسلام عدل ومساوات کا مذہب ہے، وہ آزادی وغلامی، حسب ونسب، مال وزر، جاہ واقتدار یا کسی بھی مادی فرق کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تفریق کا قائل نہیں، وہ اس طرح کے تمام بے جا تفرقوں کو مٹانے اور لوگوں کے درمیان عدل ومساوات قائم کرنے کے لئے آیا ہے، اس سلسلے میں اس نے جو سنہرے اُصول دیئے ہیں وہ یہ ہیں :

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۔ (۱)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا؛ تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے پرہیزگار ہو۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے، نہ کسی عجمی کو عربی پر، نہ کسی کالے کو گورے پر، نہ کسی گورے کو کالے پر مگر تقویٰ کی بنیاد پر۔

اسی طرح زمانۂ جاہلیت میں اہل علم کے درمیان رسم تبنیت کا رواج تھا، لوگ دوسروں کی اولاد کو گود لے کر صلبی اولاد بنا لیتے تھے اور اسے وارثت، نکاح، طلاق، حرمت مصاہرت اور زندگی کے دوسرے تمام معاملات میں حقیقی فرزند کا درجہ دیتے؛ چنانچہ منھ بولے بیٹے کی منکوحہ فرضی باپ کے لئے حقیقی بہو کی طرح حرام سمجھی جاتی، اسی طرح فرضی باپ کی بیوی متبنی کے لئے ماں کی طرح حرام قرار پاتی، ظاہر ہے کہ اس فرضی رشتے کی اسلام کی نظر میں کوئی حقیقت نہیں ہے، ضرورت تھی کہ اس غلط رسم کو مٹانے کے لئے کوئی موٴثر قدم اُٹھایا جائے؛ کیوں کہ اس رسم بد کی جڑیں عرب معاشرہ میں بڑی مستحکم تھیں، حضرت زیدؓ کے ساتھ حضرت زینبؓ کے نکاح سے آزادی اور غلام کا بے جا فرق مٹا، پھر حضرت زیدؓ کے حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کے بعد حکم الٰہی سے رسول اللہ ﷺ کے حضرت زینبؓ سے نکاح کرنے کی وجہ سے رسم تبنیت کا خاتمہ ہوا، اس طرح اس مبارک نکاح سے دونوں بدعتوں اور جاہلانہ عادتوں کا خاتمہ ہوا، اس سلسلے میں سورۂ احزاب کی درج ذیل آیت نازل ہوئی :

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ ۔ (۲)

---

(۱) الحجرات: ۱۳۔　　(۲) الاحزاب: ۳۷۔

پھر جب زید نے اس سے (یعنی زینب سے) حاجت پوری کرلی تو ہم نے اس کا نکاح آپ سے کردیا؛ تاکہ مسلمانوں کو اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے کے سلسلے میں کوئی حرج باقی نہ رہے۔

جنگوں میں قید ہو کر آنے والی معزز خواتین کی عزت وناموس کی حفاظت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازدواج کے حکم ومصالح میں سے ایک اہم حکمت یہ بھی تھی کہ بعض وہ معزز خواتین جو اپنے قبیلہ اور قوم کے سرداروں کی بیٹیاں تھیں اور مختلف غزوات میں مسلم مجاہدین کے ہاتھوں گرفتار ہو کر آئیں تھیں، ان کی عزت وناموس کی حفاظت کی جائے اور غلامی کی ذلت سے انھیں بچایا جائے؛ چنانچہ ایسی متعدد خواتین کو آزاد فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زوجیت کے شرف سے نوازا، مثلاً حضرت صفیہؓ اور حضرت جویریہؓ جن کا ذکر اس سے قبل آیا، اس نکاح سے ایک طرف ان خواتین کی دل بستگی اور عزت افزائی ہوئی تو دوسری طرف ان کے اقارب اور قبیلہ کے لوگوں کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ مسلمان ہو گئے۔

• • •

حضرت زینبؓ سے نکاح اور اعدائے اسلام کے بے جا اعتراضات

مفتی شوکت ثنا قاسمی ◆

آج پوری دنیا میں اُمت مسلمہ کو عجیب وغریب نظریاتی ،فکری،تہذیبی،تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی کش مکش کا سامنا ہے، دشمنان اسلام پوری قوت کے ساتھ اسلام، مسلمان، قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کے خلاف پروپیگنڈہ پھیلانے میں مصروف ہیں ،مخالفین اسلام رنگ بدل بدل کر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر حملے کر رہے ہیں، اور مستشرقین نبی اکرم ﷺ پر اوچھے حملے اور گھناؤنے الزامات عائد کررہے ہیں، نبی اکرم ﷺ کے تعدد ازدواج کو نشانہ بنایا جارہاہے، خاص طور پر حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح پہ رکیک حملے کئے جارہے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی ازدواجی زندگی کو لے کر مخالفین دین سے کم شغف رکھنے والے اور مذہب سے نا آشنا وناواقف مسلم نوجوانوں کو شکوک وشبہات میں مبتلا کررہے ہیں، ان کا الزام ہے کہ مسلمانوں کے نبی محمد رسول اللہ ﷺ —نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ— جنسی خواہش کے دل دادہ اور ہوس پرست تھے (معاذ اللہ)، ان کے اس اعتراض سے جہاں ان کی اسلام دشمنی اور تعصب وتنگ نظری سامنے آتی ہے، وہیں ان کی تاریخ سے ناواقفیت اور جہالت بھی نمایاں ہوتی ہے؛ کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ۲۵ سالہ تجرد کی زندگی ایسے معاشرے میں گذاری جس میں صرف چودہ سال کی عمر میں بچوں کی شادی کردی جاتی تھی ،عرب جیسے گندے ماحول میں جہاں ہرطرح کی برائیاں عام تھیں، جنسی بے راہ روی کا تو اتنا رواج تھا کہ انسان کا اس سے دامن بچا کر رہنا بہت مشکل تھا؛ لیکن اس برے ماحول میں بھی آپ ﷺ کی عفت و پاکدامنی مکہ والوں میں ضرب المثل تھی، آپ ﷺ قوت وصحت، توانائی وتندرستی، جمال وکمال، حسب ونسب اور کریکٹر وکردار کے لحاظ سے قریش ہی نہیں؛ بلکہ اہل عرب کے نوجوانوں میں ممتاز تھے، اس لئے آپ ﷺ کی ذات میں عورتوں کے لئے بڑی کشش تھی؛ لیکن ان سب کے باجود آپ ہمیشہ ہرقسم کی برائیوں سے کنارہ کش رہے، اور جوانی کے ایام نہایت ہی عفت و پاکبازی سے بسر کی، جہاں جائز یا ناجائز

◆ استاذ : جامعہ عائشہ نسوان، حیدرآباد۔

طریقے سے کئی کئی عورتوں سے رشتے قائم کرنا کوئی معیوب بات نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں آپ ﷺ کے دشمنوں کی کوئی کمی نہ تھی، وہ بھی ایسے دشمن جو ہمیشہ آپ ﷺ کے قتل کے در پے تھے، مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، جب چاہا جو چاہا الزام لگا دیا، مثلاً مجنوں، شاعر، ساحر اور نہ جانے کیا کیا کہا، مگر تاریخ گواہ ہے کہ ان میں سے کبھی بھی کسی نے آپ ﷺ پر ''شہوانیت، ہوس پرست اور خواہش نفس کا دل دادہ'' ہونے کا الزام نہیں لگایا، اور اس الزام کی جرأت بھی ان کو کیسے ہوسکتی تھی، جب کہ انھوں نے آپ ﷺ کی شرافت، پاکیزگی، جنسی خواہشات کے معاملہ میں غایت درجہ اعتدال، صبر وقناعت اور عفت و پاکبازی کی مثالی زندگی کا بار بار مشاہدہ کیا تھا، ۲۵ رسال کی عمر میں چالیس سالہ بیوہ خاتون جو آپ سے پہلے یکے بعد دیگرے دوشوہروں کے نکاح میں رہ چکی تھی (حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ) سے نہ صرف نکاح کرتے دیکھا تھا؛ بلکہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی پوری جوانی انہیں کے ساتھ گذاردی، جب تک وہ باحیات تھیں، نہ کسی دوسری عورت کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا، اور نہ دوسری شادی کا خیال دل میں لایا، اگر آپ چاہتے تو اس دور شباب میں دوسری دوشیزاؤں سے نکاح کر سکتے تھے، اس سلسلہ میں نہ حضرت خدیجہؓ کی طرف سے کوئی رکاوٹ ہوتی تھی اور نہ ہی کسی کو اعتراض ہوسکتا تھا، کیوں کہ عرب کے معاشرہ میں تعدد ازدواج اور کثرت ازدواج کا عام رواج تھا، نبوت کے چودھویں سال جب آپ کی عمر ۵۴ رسال تھی تو خود مشرکین مکہ نے یہ پیش کش کی تھی کہ اگر آپ چاہیں تو عرب کی سب سے زیادہ حسین وجمیل دوشیزہ کو آپ کے میں نکاح پیش کر دیا جائے، مگر آپ ﷺ نے اسے ٹھکرا دیا تھا؛ کیوں کہ آپ ﷺ نہ زن پرست تھے اور نہ ہی شہوانیت کے دل دادہ؛ بلکہ آپ کی ذات ان چیزوں سے بالکل منزہ تھی، اور جس شخص نے عرب کے فاسد ماحول کے اندر عہد شباب میں اپنے جذبات اور شہوات کو پوری طرح قابو میں رکھا ہو، کیا اس کے بارے میں یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ بڑھاپے کی حالت میں شہوت پرست بن جائے؟ عمر کی اس منزل میں پہنچنے کے بعد تو ان لوگوں کی خواہشات بھی مضمحل ہوجاتی ہیں جو جوانی کے دور میں غیر محتاط اور جنسی بے راہ روی کا شکار ہوتے ہیں، جو ذات عالی عفت وعصمت، امانت ودیانت، اخلاق وروحانیت اور شرم وحیا کا پیکر ہو، اس پر شہوت پرستی کا الزام بہت بڑا بہتان اور افتراء ہے، اور یہ الزام وہی شخص گھڑ سکتا ہے جو شہوانیت کے سمندر میں ہمیشہ غوطہ زن رہتا ہو اور عیاشی اور جسمانی لذت کوشی کے سوا اس کی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہ ہو۔

آپ ﷺ نے ہجرت کے بعد اپنی حیات طیبہ کے آخری مرحلہ میں متعدد نکاح ضرور فرمایا تھا؛ لیکن یہ سب نکاح دینی، اصلاحی، دعوتی اور سیاسی واجتماعی اغراض ومقاصد کی خاطر تھا، حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح کا مقصد زمانہ جاہلیت میں پھیلی ہوئی بعض بدعات، غلط عادات اور فاسد رسوم ورواج کا ازالہ تھا، سر دست یہی موضوع زیر بحث ہے جس پر گفتگو کی جائے گی، اور اس کے لئے مندرجہ ذیل موضوعات پر مختصراً بحث کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے :

(۱) حضرت زینبؓ، اور ان کا خاندانی پس منظر۔
(۲) حضرت زید بن حارثہؓ، رسول اللہ ﷺ کی تربیت میں۔
(۳) حضرت زیدؓ کا حضرت زینبؓ سے نکاح۔
(۴) حضرت زینبؓ سے علاحدگی کے اسباب۔
(۵) رسول اللہ ﷺ کا حضرت زینبؓ سے نکاح اور اس کی حکمت ومصلحت۔
(۶) حضرت زینبؓ سے نکاح اور اس سلسلے میں اعدائے اسلام کے شبہات۔

حضرت زینبؓ اور ان کا خاندانی پس منظر

ام ّالمومنین حضرت زینب بنت جحشؓ، نام: زینب، کنیت: ام ّالحکم ہے، ان کا تعلق قریش کے خاندان اسد بن خزیمہ سے تھا۔

سلسلہ نسب یہ ہے: زینب بنت جحش بن رماب بن یعمر بن صبرۃ بن مرۃ بن کثیر بن غنم بن دودان بن اسد بن خزیمہ۔

ماں کا نام اُمیمہ بنت عبدالمطلب تھا جو رسول اللہ ﷺ کی حقیقی پھوپھی تھیں، اس لحاظ سے حضرت زینبؓ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، حضرت زینبؓ ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھیں جنھیں سابقون الاولون میں ہونے کا شرف حاصل ہے، بعثت کے تیرہویں سال اپنے اہل خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئیں۔

حضرت زینبؓ نہایت دین دار، پرہیزگار، حق گو اور مخیر ّتھیں، ان کی عبادت وزہد کا اعتراف خود رسول اللہ ﷺ کو تھا۔

حافظ ابن حجرؒ نے ''الاصابہ'' میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضور ﷺ مہاجرین کی ایک جماعت میں مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے، حضرت زینبؓ بھی اس موقع پر موجود تھیں، انھوں نے کوئی ایسی بات کہی، جو حضرت عمر فاروقؓ کو ناگوار گزری، انھوں نے ذرا تلخ لہجے میں حضرت زینبؓ کو دخل دینے سے منع کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عمر! ان سے کچھ نہ کہو، یہ اوّاہ (یعنی بڑی عبادت گزار اور اللہ سے ڈرنے والی ہیں)۔

> كان رسول الله صلّى الله عليه وسلّم يقسم ما أفاء الله عليه في رهط من المهاجرين ، فتكلّمت زينب بنت جحش ، فانتهرها عمر ، فقال رسول الله صلّى الله عليه وسلّم :''خلّ عنها يا عمر ، فإنّها أوّاهة'' ۔ (۱)

(۱) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۸/ ۱۵۴۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ان کے متعلق فرمایا ہے: ’’میں نے دین کے معاملے میں زینب سے بہتر، اللہ سے ڈرنے والی، سچی بات کرنے والی، صلہ رحمی کرنے والی اور امانت وصدقہ میں بڑھ کر نہیں دیکھا‘‘۔

ما رأيت امرأة قط خيرا في الدين من زينب ، و أتقى لله ، و أصدق حديثا ، و أوصل للرحم ، و أعظم أمانة و صدقة ۔ (۱)

واقعہ افک میں حضرت زینبؓ کی حقیقی بہن حمنہ بنت جحشؓ بھی غلط فہمی کا شکار ہوگئی تھیں؛ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب سے حضرت عائشہؓ کے متعلق استفسار کیا تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا: ’’میں عائشہ میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں پاتی‘‘۔

علامہ ابن سعد کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضور ﷺ نے ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے فرمایا: ’’تم میں سے مجھے وہ جلد ملے گی جس کا ہاتھ سب سے لمبا ہوگا‘‘ لمبے ہاتھ سے حضور ﷺ کی مراد فیاضی تھی، حضرت زینبؓ بے حد فیاض اور مخیّر تھیں؛ چنانچہ اس پیشین گوئی کا وہ مصداق ثابت ہوئیں اور حضور ﷺ کی تمام ازواج میں سب سے پہلے انھوں نے ہی وفات پائی، حضرت زینبؓ خود اپنے دست بازو سے روزی کماتی تھیں وہ فن دباغت جانتی تھیں، اس سے جو آمدنی ہوتی تھی، اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیتی تھیں۔

قال النبي صلى الله عليه وسلم لأزواجه : يتبعني أطولكن يدا ، قالت عائشة : فكنا إذا اجتمعنا في بيت إحدانا بعد النبي صلى الله عليه وسلم نمد أيدينا في الجدار نتطاول ، فلم نزل نفعل ذٰلك حتى توفيت زينب بنت جحش و كانت امرأة قصيرة ، يرحمها الله ، و لم تكن أطولنا ، فعرفنا حينئذ أن النبي صلى الله عليه وسلم إنما أراد بطول اليد الصدقة ، قالت : و كانت زينب امرأة صناع اليد فكانت تدبغ و تخرز و تتصدق في سبيل الله ۔ (۲)

نبی اکرم ﷺ نے اپنی بیویوں سے ایک دفعہ ارشاد فرمایا: تم میں سب سے پہلے مجھ سے وہ ملے گی جس کے ہاتھ سب سے زیادہ طویل ہوں گے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں جب کبھی ہم سب ایک جگہ جمع ہوتے (آپ ﷺ کے وفات کے بعد) تو اپنے ہاتھوں کو دیوار سے ناپتے تھے، یہ ہمارا مشغلہ رہا، یہاں تک کہ حضرت زینب بنت جحشؓ کی وفات ہوگئی، وہ پستہ قد تھیں، ہم سے لمبی نہ تھیں، اس وقت ہم نے جانا کہ ہاتھ کی

(۱)　اسد الغابۃ: ۷/۱۲۶۔　　(۲)　طبقات الکبریٰ لابن سعد: ۸/۸۸۔

لمبائی سے مراد صدقہ وخیرات ہے، زینب اپنے دست وبازو سے کماتی تھیں، دباغت کا فن جانتی تھیں اور اس سے جو آمدنی ہوتی، اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کردیتی تھیں۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد خلافت میں تمام اُمہات المومنین کے لئے خطیر وظیفہ مقرر کردیا تھا، حضرت زینبؓ یہ وظیفہ پاتے ہی حاجت مندوں میں تقسیم کردیا کرتی تھیں، ایک دفعہ سالانہ وظیفہ ملا تو اسے اپنے رشتہ داروں اور یتیموں میں تقسیم کرکے یہ دعا فرمائی کہ ''اے اللہ! آئندہ یہ مال مجھ کو نہ ملے؛ کیوں کہ یہ بڑا فتنہ ہے، حضرت عمر کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: ''زینب بڑی مخیّر ہیں، پھر مزید ایک ہزار درہم حضرت زینبؓ کی خدمت میں بھیجے، انھوں نے وہ بھی فوراً خیرات کردیئے۔

ان کا انتقال حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت ۲۰ ؍ہجری میں ہوا، اس وقت ان کی عمر ۵۳ برس تھی حضرت عمرؓ نے ہی جنازہ پڑھائی، ان کے انتقال سے مدینہ کے فقراء اور مساکین میں حشر برپا ہوگیا؛ کیوں کہ وہ ان کی مربی ودستگیر تھیں، وفات کے وقت سوائے ایک مکان کے کوئی ترکہ نہ چھوڑا، سب کچھ اپنی زندگی میں راہ خدا میں لٹا چکی تھیں۔

حضرت عائشہؓ نے ان کی وفات کے موقع پر فرمایا :

لقد ذهبت حميدة متعبدة مفزع اليتامى والأرامل ۔ (۱)

وہ نیک بخت عبادت گزار خاتون چلی گئیں اور یتیموں اور بیواؤں کو بے چین کرگئیں۔

حضرت زینب بنت جحشؓ سے گیارہ احادیث مروی ہیں جن کے راویوں میں حضرت اُمّ حبیبہ اور زینب بنت ابی سلمہؓ وغیرہ شامل ہیں۔ (۲)

حضرت زید بن حارثہؓ، رسول اللہ ﷺ کی تربیت میں

زید نام، ابو اسامہ کنیت، حب رسول اللہ (ﷺ) لقب، والد کا نام حارثہ اور والدہ کا نام سعدی بنت ثعلبہ تھا، حضرت زیدؓ کے والد حارثہ، بنی قضاعہ سے تعلق رکھتے تھے جو یمن کا ایک نہایت معزز قبیلہ تھا، ان کی والدہ سعدی بنت ثعلبہ بنی معن سے تھیں جو قبیلہ طے کی ایک شاخ تھی، وہ ایک مرتبہ اپنے صغیر السن بچے حضرت زیدؓ کو ساتھ لے کر اپنے میکہ گئیں، اسی اثناء میں بنو قین کے سوار جو غارت گری سے واپس آرہے تھے، اس نونہال کو خیمہ کے سامنے سے اُٹھالائے اور غلام بنا کر عکاظ کے بازار میں فروخت کے لئے پیش کیا، ستارہ اقبال بلند تھا، غلامی میں بھی

---

(۱) اسد الغابۃ: ۱۲۶/۷۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: اسد الغابۃ: ۱۲۶/۷، الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ: ۱۵۳/۸، طبقات الکبریٰ لابن سعد: ۸۰/۸۔

سیادت مقدر تھی، حکیم بن حزام نے چار سو درہم میں خرید کر اپنی پھوپھی اُم المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ کی خدمت میں پیش کیا، جن کی وساطت سے سرورِ دوعالم ﷺ کی غلامی کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت زیدؓ کے والد حارثہ بن شرجیل کو قدرۃً اپنے لختِ جگر کے گم ہو جانے کا شدید غم ہوا، آنکھوں سے سیل اشک بہائے، دل آتشِ فراق سے بھڑک اُٹھا اور محبت پدری نے الفاظ کی رنگ آمیزی سے جو رنج والم کا نقشہ کھینچا ہے، جس کو پڑھ کر ہر شخص حضرت زیدؓ کے والد حارثہ بن شرجیل کے درد وکرب کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے، علامہ ابن سعد نے حارثہ بن شرجیل کے ان اشعار کو نقل کیا ہے جو انھوں نے حضرت زید کی جدائی میں کہے تھے، (۱) اس حادثے کو کئی برس گزر گئے، شرجیل ایک دن اپنے گھر میں بیٹے کی یاد میں غمگین بیٹھا تھا کہ اس کے رشتہ داروں میں سے کچھ لوگ اس سے ملنے آئے، یہ لوگ حج کر کے لوٹے تھے، انھوں نے حارثہ بن شرجیل کو مکہ میں زید کی موجودگی کی اطلاع دی تو تعجب سے ان کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور بولے رب کعبہ کی قسم کیا میرا ہی نورِ نظر تھا؟ ان لوگوں نے جب تفصیل کے ساتھ حلیہ، جائے قیام اور مربی کے حالات بیان کئے تو اسی وقت اپنے بھائی کعب بن شرجیل کو ہمراہ لے کر مکہ کی طرف چل کھڑے ہوئے اور حضرت سرورِ کائنات ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بصد منت ولجاجت عرض کیا اے ابن عبداللہ! اے ابن عبدالمطلب! اے اپنی قوم کے رئیس زادہ! تم اہل حرم اور اس کے مجاور ہو، مصیبت زدوں کی دستگیری کرتے ہو، قیدیوں کو کھانا دیتے ہو، ہم آپ کی خدمت میں اس غرض سے آئے ہیں کہ ہمارے لڑکے کو آزاد کر کے ہم پر احسان کیجئے، آپ سے درخواست ہے کہ آپ جس قدر رقم چاہیں لے لیں، مگر میرے بیٹے کو آزاد کر دیں، میری آنکھیں اس کا پیارا چہرہ دیکھنے کو ترس رہی ہیں، آپ نے پوچھا وہ کون ہے؟ کہا زید بن حارثہؓ! آنحضرت ﷺ نے حضرت زید کا نام سنا تو کچھ سوچ میں پڑ گئے، پھر ارشاد فرمایا: کیا اس کے علاوہ آپ کے یہاں آنے کا کوئی مقصد نہیں؟ تو حارثہ نے جواب دیا نہیں مہربان سردار! ہم تو بیٹے کو منھ مانگی قیمت پر لینے آئے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں زید کو بلا کر اختیار دیتا ہوں، اگر وہ آپ کو پہچان لے اور آپ کے ساتھ جانے پر راضی ہو جائے تو اسے بخوشی لے جایئے، مجھے اس کے بدلے ایک درہم بھی لینا گوارہ نہیں؛ لیکن اگر وہ مجھے ترجیح دے تو خدا کی قسم میں ایسا نہیں ہوں کہ اپنے ترجیح دینے والے پر کسی کو ترجیح دوں، حارثہ اور اس کے بھائی کعب ایک ساتھ بولے: ''اے شریف زادے! اس سے بڑھ کر اور اچھی بات کیا ہو سکتی ہے؟ آپ نے تو حق اور انصاف سے بڑھ کر بات کی ہے، حضرت زیدؓ بلائے گئے، آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا، تم ان دونوں کو پہچانتے ہو؟ عرض کیا ہاں! یہ میرے باپ اور چچا ہیں'' تو آپ ﷺ نے زید سے فرمایا: زید تم مجھے بھی پہچانتے ہو، میرا

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: طبقات الکبریٰ: ۲۹/۳۔

خاندان بھی تمہیں معلوم ہے، میں نے جو شفقت ومحبت کا معاملہ تم سے رکھا ہے، اس سے بھی تم بخوبی واقف ہو، فیصلہ تمہارے اختیار میں ہے، تم پر کوئی زبردستی نہیں، تم چاہو تو خوشی کے ساتھ اپنے باپ کے ساتھ جا سکتے ہو، چاہو تو یہاں بھی ٹھہر سکتے ہو، تم پر کوئی زور وزبردستی نہیں!'' حضرت زیدؓ کو شہنشاہِ کونین کی غلامی میں جو لطف ملا تھا، اس پر صدہا آزادیاں نثار کی جاسکتی ہیں، حضرت زید کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی، بولے میں ایسا نہیں ہوں جو حضور ﷺ پر کسی کو ترجیح دوں، آپ ہی میرے ماں باپ ہیں، اور میں ہرگز آپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا، زید کی بات جذب ومستی کی تھی، محبت کا ایک سمندر تھا جو ان کے جملوں سے امڈ رہا تھا، باپ اور چچا کے لئے یہ سب کچھ نا قابل تصور اور نا قابل یقین تھا، باپ نہ جانے کب سے بیٹے کی محبت کا چراغ سینے میں جلائے، اسے وادی وادی تلاش کر رہا تھا؛ لیکن بیٹے کا جواب سن کر حیرت اور دکھ سے بولا: ''اے زید تم پر افسوس! آزادی، باپ چچا اور خاندان پر غلامی کو ترجیح دیتے ہو؟ خدا کی قسم، تمہاری تلاش میں کونسا ایسا پتھر ہوگا، جو میں نے نہ اُلٹا ہوگا؟ اور اب تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم ان صاحب کو نہیں چھوڑ سکتے، اپنے باپ کے ساتھ نہیں جانا چاہتے! حضرت زید بڑے ادب کے ساتھ عرض کیا: اے والد محترم! آپ نے درست فرمایا؛ لیکن مجھے اس ذات پاک میں ایسے ہی محاسن نظر آئے ہیں کہ میں اس پر کسی کو کبھی ترجیح نہیں دے سکتا، میں نے ان کے اندر جو کمالات اور خوبیاں دیکھی ہے، اس کے بعد یہ میرے بس سے باہر ہے کہ میں انھیں چھوڑ دوں'' زید کا فیصلہ اٹل تھا، حضرت زیدؓ نے اپنی غیر متزلزل وفا شعاری سے آقائے شفیق کے دل میں محبت کی دبی ہوئی چنگاری کو مشتعل کر دیا، آنحضرت ﷺ نے خانہ کعبہ میں مقام حجر کے پاس ان کو لے کر اعلان فرمایا کہ، زید آج سے میرا فرزند ہے، میں اس کا وارث ہوں گا، وہ میرا وارث ہوگا، اس اعلان نے زید کے باپ اور چچا دونوں کے تنگ سینے کو کھول دیا، ان کے اترے ہوئے چہروں اور مایوس آنکھوں میں ایک دم سے نئی زندگی اور نئی چمک پیدا ہوگئی، ان کے باپ اور چچا کے افسردہ دل گل شگفتہ کی طرح کھل گئے گو والد کو مفارقت گوارا نہ تھی؛ تاہم اپنے لختِ جگر کو ایک شفیق ومعزز باپ کے آغوشِ عاطفت میں دیکھ کر اطمینان ہوگیا، حارثہ سوچ رہے تھے کہ مجھے تو بیٹے کی عزت اور بہتری سے غرض ہے، اس کی خوشی عزیز ہے، اگر وہ یہاں خوش ہے تو میری خوشی بیٹے کی خوشی کے ساتھ ہے، انھوں نے بھی اس فیصلے کو وہیں کھڑے ہو کر قبول کرنے کا اعلان کر دیا، رسول اللہ ﷺ نے انھیں اجازت دی کہ جب چاہیں یہاں آکر اپنے بیٹے سے مل سکتے ہیں اور آپ نے زید کو بھی نصیحت کی کہ وہ اپنے والدین سے ملاقات کے لیے جایا کرے، یہ اس دور کا واقعہ ہے جب آپ ﷺ اللہ کے پیغمبر نہیں بنائے گئے تھے، زید کو یہ علم نہ تھا کہ جس ہستی کو وہ اپنے والدین پر ترجیح دے رہے ہیں، ایک دن ان کے سر پر نبوت کا تاج ہوگا۔

اس اعلان کے بعد حضرت زیدؓ حضرت ﷺ ہی کے انتساب کے ساتھ زید بن محمد کے نام سے زبان زد

عام وخاص ہوئے، یہاں تک کہ جب اسلام کا زمانہ آیا اور قرآن پاک کی الہامی زبان نے صرف اپنے نسبی آباء کے ساتھ انتساب کی ہدایت فرمائی تو وہ پھر حارثہ کی نسبت سے زید بن حارثہ مشہور ہوئے۔(۱)

قبولِ اسلام

حضرت زید بن حارثہؓ آٹھ سال کی عمر میں گرفتار ہوئے تھے، سات سال حضرت خدیجہؓ کے پاس رہے، پندرہ سال کی عمر میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے، اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت آپ کی عمر تیس سال تھی، گویا کہ بعثت سے پہلے آپ کی تربیت میں پندرہ سال کا عرصہ گذر چکا تھا؛ چنانچہ بعثت کے بعد آپ ﷺ کی دعوت پر سب سے پہلے جن حضرات نے لبیک کہا تھا ان میں حضرت زیدؓ بھی تھے، محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ غلاموں میں سب سے پہلے ایمان لائے تھے۔

کارنامے

حضرت زیدؓ کو تیراندازی میں کافی دسترس حاصل تھا، ان کا شمار ان مشاہیر صحابہ میں تھا جو اس فن میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے، غزوۂ بدر سے معرکہ موتہ تک جس قدر اہم وخون ریز معرکے پیش آئے سب میں اللہ کی رضا کے لئے انتہائی پامردی وشجاعت کے ساتھ شریکِ کارزار ہوئے، غزوۂ مریسیع میں رسول اللہ ﷺ نے ان کو مدینہ میں اپنی جانشینی کا فخر بخشا؛ اس لیے اس مہم میں حصہ نہ لے سکے۔

مشہور معرکوں کے علاوہ اکثر چھوٹی چھوٹی مہمات ان کی سپہ سالاری میں سر ہوئیں، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس فوج کشی میں زیدؓ شریک ہوتے تھے، اس میں امارت کا عہدہ ان ہی کو عطا ہوتا تھا، اس طرح نو دفعہ سپہ سالار بنا کر بھیجے گئے، نیز حضرت حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر وہ آنحضرت ﷺ کے بعد زندہ رہتے تو آپ ان ہی کو اپنا جانشین بناتے تھے۔

> عن سلمة بن الأكوع قال : غزوت مع رسول الله صلى الله عليه وسلم سبع غزوات ومع زيد بن حارثة تسع غزوات يؤمره رسول الله صلى الله عليه وسلم علينا ، قال : أخبرنا محمد بن عبيد قال : حدثني وائل بن داود قال : حدثني وائل بن داود قال : سمعت البهي يحدث أن عائشة قالت : ما بعث رسول الله صلى الله عليه وسلم زيد بن حارثة في جيش قط إلا أمره عليهم ولو بقي بعده استخلفه ـ (۲)

(۱) طبقات الکبریٰ: ۳/ ۲۹، اسد الغابۃ: ۲/ ۳۵۰، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۲/ ۴۹۴، تہذیب التہذیب: ۳/ ۴۰۱، الاستیعاب: ۲/ ۵۴۔

(۲) طبقات ابن سعد: ۳/ ۳۳۔

اگر چہ کہ حضرت زیدؓ کے اخلاقی کارناموں کی تفصیلات نہیں ملتی، مگر یہ بالکل واضح ہے کہ ان کے غیر معمولی اوصافِ حسنہ ومحاسن جمیلہ ہی تھے، جس نے ان کو اوران کی اولاد کو رسول اللہ ﷺ کی نگاہ میں سب سے زیادہ محبوب بنادیا تھا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ ان کے پوتے محمد بن اسامہ کو مدینہ کی مسجد میں دیکھا تو تعظیم سے گردن جھکالی اور بولے اگر رسول اللہ ﷺ دیکھتے تو اس کو بھی محبوب رکھتے :

أخبرنا عبد الله بن دينار ، قال : نظر ابن عمر يوما ، وهو في المسجد ، إلى رجل يسحب ثيابه في ناحية من المسجد ، فقال : انظر من هذا ؟ ليت هذا عندي ، قال له إنسان : أما تعرف هذا يا أبا عبد الرحمن ؟ هذا محمد بن أسامة ، قال : فطأطأ ابن عمر رأسه ، ونقر بيديه في الأرض ، ثم قال : ''لو رآه رسول الله صلى الله عليه وسلم لأحبه'' ۔ (۱)

حضرت زیدؓ کا حضرت زینبؓ سے نکاح

مکہ مکرمہ میں حضرت زید بن حارثہؓ رسول اللہ ﷺ کے مکان میں ہی خاندان کے ایک فرد کی طرح رہا کرتے تھے، حضرت حمزہؓ جب ایمان لائے تو ان سے رسول اللہ ﷺ نے بھائی چارہ کرادیا، ان دونوں میں اس قدر محبت ہوگئی تھی کہ حضرت حمزہؓ غزوات میں تشریف لے جاتے تھے تو ان ہی کو اپنا وصی بنا کر جاتے تھے، جب مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت ملی تو حضور ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ کو پہلے ہی مدینہ بھیج دیا اوران کو اسید بن حضیر انصاریؓ جو قبیلہ عبدالاشہل کے سردار تھے، کے یہاں ٹھہرائے گئے، کچھ دنوں بعد جب رسول اللہ ﷺ بھی مدینہ تشریف لے آئے تو اسیدؓ بن حضیر کو ان کا اسلامی بھائی قرار دیا۔

حضرت زیدؓ کو علاحدہ کرنے میں یہ حکمت تھی کہ لوگ انھیں ایک آزاد اور خود مختار شخص کی حیثیت سے پہچانیں، ان کی اسی حیثیت کو مزید مستحکم اور مؤکد کرنے کے لئے حضور ﷺ نے ایک اور اہم اقدام کیا، یہ اقدام زیدؓ کے عزت وشرف کو بڑھانے کے لئے اہم سنگ میل رکھتا تھا؛ چنانچہ جب حضرت زیدؓ نے آنحضرت ﷺ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کے ساتھ ان کا نکاح کرادیں تو آپ ﷺ نے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے، حضرت زینبؓ کے گھر پیغام نکاح بھیجا؛ لیکن عرب معاشرہ میں غلاموں کو ذلت وحقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، آزاد ہونے کے بعد بھی انھیں سماج میں عزت وقار کا مقام حاصل نہ تھا، اس لئے

(۱) بخاری ذکر اسامہ بن زیدؓ۔

حضرت زینبؓ کے بھائی کو یہ رشتہ بالکل پسند نہیں آیا، ان لوگوں کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی کہ قریش جیسے معزز اوراعلیٰ خاندان کی معزز خاتون اور رسول اللہ ﷺ کی حقیقی پھوپی زاد بہن کو آپ کے آزاد کردہ غلام کی زوجیت میں دیا جائے، اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورہ احزاب کی یہ آیت نازل فرمائی :

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا ۔ (۱)

جب اللہ اوراس کے رسول کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ فرمادیں، تو کسی مومن مرد وعورت کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔

اس آیت کے نزول کے بعد حضرت زینب بنت جحشؓ اور ان کے خاندان کے لوگ اس نکاح کے لئے بخوشی تیار ہوگئے، اور حضرت زیدؓ کا نکاح زینب بنت جحشؓ سے ہوگیا، یہ اسلام کا معجزہ تھا کہ اس نے سابق غلام حضرت زیدؓ کو جو عرب معاشرہ میں کسی بھی عرب خاتون کے ہم پلہ نہیں ہوسکتے تھے، انھیں قریش کے نہایت اعلیٰ خاندان کی معزز خاتون حضرت زینب بنت جحشؓ کا کفو بنادیا، یہ نکاح اس معاشرے کو اسلامی اقدار سکھلانے کی ایک اہم کڑی تھی، لوگ حیرت سے اس پر گفتگو کرتے تھے: ''ایک قریشی خاندان کی عورت کو ایک آزاد کردہ غلام کے ساتھ بیاہ دیا''۔

صحابہؓ اس کا جواب دیتے، اسلام نے غلامی کو ختم کرنے کا حکم دیا ہے اوراس کے لئے اصلاحات اور تدریج کا راستہ اختیار کیا ہے، یہ واقعہ اسی ضمن میں رونما ہوا ہے۔

مدینہ کی بستی میں اس واقعے کی بازگشت ایک عرصہ تک سنائی جاتی رہی، اس نکاح کے ذریعہ انسانیت کو یہ پیغام دیا گیا کہ اسلام عدل ومساوات کا داعی اور علمبردار ہے، وہ آزادی وغلامی، حسب ونسب، مال ودولت، جاہ واقتدار، یا کسی بھی مادی تفوق کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تفریق کا قائل نہیں، وہ اس طرح کی بدعات، غلط عادات اور فاسد رسم ورواج اور بیجا تفرقوں کے ازالے اور مٹانے کے لئے اور انسانیت کے درمیان عدل ومساوات قائم کرنے کے لئے آیا ہے؛ چنانچہ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی واضح ہدایت قرآن مجید میں موجود ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۔ (۲)

---

(۱) الاحزاب:۳۶۔

(۲) الحجرات:۱۳۔

اے لوگوں ! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا ؛ تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو ، بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم لوگوں میں سب سے بڑا معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہ اعلان فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضلیت ہے نہ کسی عجمی کو عربی پر ، نہ کسی کالے کو گورے پر ، نہ کسی گورے کو کالے پر ، مگر تقوی کی بنیاد پر ، یقیناً تم لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہو :

ألا لا فضل لعربي على عجمي ، ولا لعجمي على عربي ، ولا لأحمر على أسود ولا أسود على أحمر ، إلا بالتقوى ، إن أكرمكم عند الله أتقاكم ۔ (۱)

اس نکاح کا مقصد غلاموں کے سلسلہ میں دور جاہلیت کے غرور ونخوت اور جاہلانہ ذہنیت کا خاتمہ تھا ، اور عملی طور پر اسلامی معاشرہ میں ایک مومن غلام کو قریش کی معزز خاتون کا ہمسر قرار دے کر معاشرہ میں غلاموں کو ہر حیثیت سے عزت وقار کا مقام دینا تھا ، جو حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے درمیان نکاح سے یہ مقصد حاصل ہو گیا۔

حضرت زینبؓ سے علاحدگی کے اسباب

گذشتہ سطور سے یہ بات واضح ہو چکی ہے حضرت زینب اور ان کے رشتہ داروں کو بعض وجوہات کی بناء پر یہ رشتہ پسند نہ تھا ؛ اس لئے حضرت زینب نے نکاح سے پہلے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا : '' یا رسول اللہ ! میں زید کو اپنے لئے پسند نہیں کرتی ؛ لیکن حضور ﷺ اس نکاح میں بہتری سمجھتے تھے ، اس لئے آپ ﷺ نے سیدہ زینب بنت جحشؓ کو بطور خاص اس شادی کے لئے آمادہ کیا تھا ، ان کے ذہن میں یہ بات بہرکیف تھی کہ ان کی شادی ایک آزاد کردہ غلام سے ہو رہی ہے ، ایک تو خاندانی شرف کا تفاوت بہت تھا اور دوسرا دونوں میاں بیوی میں مزاج کا بہت فرق نکلا ، زینب بنت جحشؓ ایک اونچے خاندان کی باوقار خاتون تھیں ، وہ حساس بھی تھیں اور رکھ رکھاؤ والی بھی ، دوسری طرف زیدؓ ایک حساس ، خوددار اور منکسر المزاج انسان تھے ، وہ نبی اکرم ﷺ کی دلداریوں کے باوجود اپنے دور غلامی کو نہیں بھولے تھے ، انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے زینبؓ کو اصرار کر کے شادی پر آمادہ کیا ہے ، اس پس منظر میں حضرت زینبؓ اگر اپنے فطری مزاج کے مطابق کبھی ذرا سپاٹ رویہ دکھاتیں تو زیدؓ اسے انھیں معنوں میں لیتے کہ میری اہلیہ مجھ پر اپنی خاندانی برتری جتانا چاہتی ہیں ، ان دونوں کے درمیان کچھ ہی

(۱) احمد : ۲۳۴۸۹ ، شعب الایمان : ۴۷۷۴۔

دنوں کے بعد ازدواجی تعلقات کشیدہ ہو گئے، اور حضرت زینبؓ کی طبیعت میں نفور کی بناء پر حضرت زیدؓ اکثر رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے اور کہتے کہ زینبؓ اس تعلق سے خوش نہیں ہیں، وہ اس کا اظہار تند و تیز لہجے میں کرتی ہیں، حضور ﷺ نے پہلے تو انھیں سمجھایا، کبھی نرم لہجے میں کبھی سخت لہجے میں، اور انھیں اللہ سے ڈرنے اور صبر و تحمل کے ساتھ اپنی بیوی سے نباہ کرتے رہنے کا حکم دیا، حضرت زیدؓ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کچھ دنوں گزارہ کیا؛ لیکن جب انھوں نے پوری طرح محسوس کرلیا کہ طبیعت کے اختلاف اور ذوق ومزاج کی ناہمواری کی وجہ سے دونوں کی زندگی خوشگوار نہیں گزر سکتی اور نہ ہی نکاح کے مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ وہ ایک دن کچھ طے کر کے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور اپنا فیصلہ سنا دیا کہ میں زینبؓ کو طلاق دینا چاہتا ہوں! حضور ﷺ نے زیدؓ کو روکا اور سمجھانے کی کوشش کہ وہ زینب کو طلاق نہ دے، اور آپ نے ان کو سمجھایا کہ طلاق کے لیے ان کی بتائی ہوئی وجہ کافی نہیں ہے، آپ ﷺ کی یہ بات سن کر حضرت زیدؓ نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ "اے اللہ کے رسول! اگر آپ مجھے اللہ کا حکم پہنچا رہے ہیں کہ میں طلاق نہ دوں تو میں سر تسلیم خم کر دیتا ہوں؛ لیکن اگر آپ ﷺ یہ بات ایک مشفق سرپرست اور بزرگ کی حیثیت سے کر رہے ہیں تو میری گزارش یہی ہے کہ اب یہ معاملہ میرے بس سے باہر ہو گیا ہے، میں مزید صبر نہیں کر سکتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیدؓ کو بتایا کہ وہ یہ بات اللہ کے رسول کی حیثیت سے نہیں؛ بلکہ بطور ایک مشفق سرپرست کی حیثیت سے کر رہے ہیں، تو حضرت زیدؓ نے عرض کیا: تو مجھے میرے فیصلوں اور ارادوں میں آزاد رہنے دیں، میں زینبؓ کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا، یہ حضرت زیدؓ کا آخری فیصلہ تھا، اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ زور دیتے تو جبر اور زبردستی کی حد شروع ہو جاتی، اس لئے آپ ﷺ خاموش ہو گئے، اور حضرت زیدؓ نے ایک سال کے بعد حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی، یہ واقعہ حضرت زینبؓ اور ان کے اہل خاندان کے لئے بہت بڑا حادثہ تھا، وہ لوگ تو پہلے ہی سے اس رشتے کے لئے تیار نہ تھے، محض اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کی بنیاد پر انھوں نے اس کو قبول کرلیا تھا، اور اب طلاق کی ذلت اس قریشی خاتون اور ان کے اہل خاندان کے لئے سوہان روح تھی، اور نبی ﷺ کے لئے بھی حضرت زیدؓ کا یہ اقدام کئی وجوہ سے پریشانی کا باعث بن گیا، ایک اس وجہ سے کہ آپ ﷺ نے جس اعلیٰ مقصد کے لئے یہ رشتہ کرایا تھا، وہ مقصد اس طلاق سے مجروح ہوا تھا، دوسری وجہ یہ کہ حضرت زینبؓ، جنھوں نے نبی ﷺ کے اصرار پر رشتے کو قبول کیا تھا، ان کی حیثیت عرفی کو بڑا نقصان پہنچا، ان کا غم دہرا ہو گیا، پہلے انھوں نے منافقین کے یہ طعنے سنے کہ وہ ایک آزاد کردہ غلام کی بیوی ہیں اور اب ان کو یہ سننا پڑا کہ وہ ایک آزاد کردہ غلام کی مطلقہ ہیں۔(۱)

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے: فتح الباری: تفسیر سورہ احزاب، تدبر قرآن: ۶/ ۲۲۸، پیغمبر اسلام ﷺ اور تعدد ازدواج۔

اس سب معاملے میں آپ ﷺ زیدؓ کو بہت حد تک بری الذمہ سمجھتے تھے، انھوں نے جو کچھ کیا، ایک حساس اور خوددار انسان ہونے کے ناتے کیا، یہی وجہ تھی کہ اس سب کے باوجود حضور ﷺ نے زیدؓ سے کوئی شکایت نہ کی؛ البتہ اس نکاح سے شریعت کا جو مقصود ومطلوب تھا وہ حاصل ہوگیا۔

رسول اللہ ﷺ کا حضرت زینبؓ سے نکاح اور اس کی حکمت ومصلحت

حضرت زینبؓ رسول اللہ ﷺ کی چچا زاد بہن تھیں اور آپ ہی کی تربیت میں پلی تھیں اور آپ کے ہی مشورہ پر حضرت زیدؓ سے نکاح پر راضی ہوئی تھیں جو ان کے نزدیک ان کے خلاف شان تھا، اب جب کہ طلاق کے صدمے سے دوچار تھیں تو ان کی دلداری کی واحد شکل یہ باقی رہ گئی تھی کہ آپ ﷺ ان کو خود نکاح میں لے لیں، اور اللہ تعالیٰ کی مرضی بھی یہی تھی، رسول اللہ ﷺ کو اس بات کی اطلاع طلاق سے پہلے ہی دے دی گئی تھی؛ لیکن ایسا کرنا ہرگز آسان نہیں تھا، اس میں ایک دوسرے فتنے کے اُٹھ کھڑے ہونے کا اندیشہ تھا کہ لوگ کہیں گے آپ ﷺ نے اپنے منھ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کرلیا، جو عربوں کے خودساختہ تصور کے مطابق جائز نہیں تھا، آپ ﷺ کے تردد کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ مردوں کے لئے شادیوں کی زیادہ سے زیادہ حد چار متعین کردی گئی تھی اور نبی اکرم ﷺ کے ہاں پہلے ہی سے چار بیویاں موجود تھیں، بالآخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ہدایت دی گئی کہ لوگوں کی مخالفت سے بے پرواہ ہوکر آپ یہ نکاح کرلیں تاکہ عملی طور پر ایک غلط رسم کی اصلاح ہوجائے، اور اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کے مطابق آپ نے حضرت زینبؓ سے نکاح فرمایا۔

حضرت مولانا نورالحق رحمانی دامت برکاتہم اس نکاح کی حکمت ومصلحت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> دور جاہلیت میں منھ بولے بیٹے کو زندگی کے تمام معاملات واحکام میں حقیقی فرزند کا مقام دیا جاتا تھا، اسلام جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا پسندیدہ دین اور تنہا راہ نجات قرار دیا اور تمام سابقہ ادیان کو منسوخ کرکے ایک صالح اور برتر نظام زندگی کی حیثیت سے قیامت تک کے انسانوں کے لئے روئے زمین پر برپا کیا، اس کے پیش نظر ایسی تمام غلط روایات اور باطل رسوم ورواج کو ختم کرنا بھی تھا؛ لیکن چوں کہ عرب معاشرہ میں اس کی جڑیں بڑی گہرائی میں پیوست تھیں اور بہت وسیع پیمانہ پر اس کا رواج تھا، اس لئے محض قولی ہدایت کے ذریعہ لوگوں کے ذہن سے اس کی قباحت وشناعت کو نکالنا اور اس رسم کو بالکلیہ طور پر ختم کرنا مشکل تھا، گویا اس کی حیثیت کسی نرم ونازک پودے کی نہیں تھی جو معمولی ہواؤں سے اُکھڑ جائے؛ بلکہ اس کی حیثیت اس تناور

درخت کی تھی جس کا استیصال طوفان اور بادصرصر کے بغیر ممکن نہ تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوئی کہ خود اپنے حبیب اور رسول ﷺ کے ذریعہ اس کا خاتمہ کریں، چنانچہ اس نے وحی کے ذریعہ اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ اپنے سابق غلام اور متبنیٰ حضرت زیدؓ کی منکوحہ اور مطلقہ زینبؓ سے نکاح کر کے اس رسم جاہلیت کا ازالہ فرمائیں، اور اسلام کے پاکیزہ اور سنہرے فطری اُصولوں کو فروغ دیں؛ تاکہ پھر اس کے بعد کسی کو اپنے لے پالک کی بیوی سے نکاح کرنے میں کوئی تامل اور تردد باقی نہ رہے؛ لیکن آپ ﷺ کو اس کا اندیشہ تھا کہ منافقین اس پر نکتہ چینی کریں گے کہ ''لو محمد ﷺ نے اپنی بہو سے نکاح کر لیا'' اس بناء پر آپ ﷺ کو اس میں تامل ہو رہا تھا، اور آپ ﷺ اس سلسلے میں فوری قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے، حتیٰ کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی کہ آپ ﷺ لوگوں سے ڈر رہے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے؟ اللہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ آپ اللہ سے ڈریں۔(۱)

اور حکم الٰہی کے مطابق یہ مبارک رشتہ انجام پا گیا ارشاد باری ہے :

وَ إِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِ وَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللهُ مُبْدِيهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ وَاللهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللهِ مَفْعُولًا ۔ (۲)

اور جب آپ اس شخص سے فرما رہے تھے، جس پر اللہ نے انعام کیا اور آپ نے انعام کیا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ سے ڈر، اور آپ اپنے دل میں اس چیز کو چھپا رہے تھے جسے اللہ تعالیٰ ظاہر فرمانے والا تھا، اور آپ لوگوں سے ڈر رہے تھے اور آپ کو یہ سزاوار ہے کہ اللہ سے ڈریں، پھر جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس عورت کا آپ سے نکاح کر دیا؛ تاکہ مسلمانوں پر اپنے منھ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ رہے جب وہ ان سے حاجت پوری کر چکیں اور اللہ کا حکم پورا ہونے ہی والا تھا۔

اس نکاح کا مقصد دور جاہلیت کے ایک قدیم رسم کو باطل کرنا تھا کہ لے پالک اصلی بیٹے کا حکم رکھتا ہے۔

---

(۱) پیغمبر اسلام ﷺ اور تعدد ازدواج: ۳۰-۳۱۔ (۲) الاحزاب: ۳۷۔

حضرت زینبؓ سے نکاح اور اس سلسلے میں اعدائے اسلام کے شبہات

دنیا کی تاریخ میں نبی اکرم ﷺ کے علاوہ کوئی بھی ایسی شخصیت نہیں گزری جس کی زندگی کے تمام گوشے عیاں ہوں اور ان سے راہنمائی حاصل کی جا سکے، ہر عظیم شخصیت کی زندگی کا کوئی نہ کوئی گوشہ پوشیدہ ہے اور اس پر پردہ پڑا ہوا ہے، خاص طور پر ازدواجی زندگی؛ لیکن نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے تمام گوشوں کی طرح یہ گوشہ بھی اُمت کی راہنمائی کے لئے موجود ہے، مستشرقین نے پیغمبر اسلام ﷺ کی کردار کشی کی خاطر سیرۃ النبی ﷺ کے جن پہلوؤں کو ہدف تنقید بنایا ہے، ان میں نبی اکرم ﷺ کی ازدواجی زندگی بھی شامل ہے، مستشرقین کے ان اعتراضات کا مقصد حقائق کو مسخ کر کے نبی اکرم ﷺ کے اخلاق و کردار کی ایسی منظر کشی کرنی ہے کہ جس سے ایک طرف غیر مسلموں پر اسلام کی تاثیر کو کم کیا جا سکے تو دوسری طرف اعتراضات کی حقیقت سے ناواقف سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات کو جنم دیا جا سکے۔

مستشرقین کی یہ بدنصیبی رہی ہے کہ سیرۃ النبی ﷺ پر قلم اُٹھاتے ہی اکثر اوقات ان کے قدم ڈگمگا جاتے اور ان کے قلم میں لغزش آ جاتی ہے اور وہ انصاف کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر صرف ان حوالہ جات پر اکتفاء کرتے ہیں جو ان کے ناپاک مخصوص مقاصد کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں، حقائق سے واقف مستشرقین بھی پیغمبر اسلام ﷺ کے طرز عمل کو غلط ثابت کرنے کی خاطر انصاف کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور ان کی تحریر و تقریر کا پورا زور حقائق کو مسخ کر کے اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں صرف ہو جاتا ہے، اسلام کے فلسفہ زوجیت اور اس پر معترضین کے اعتراضات کا جائزہ لینے سے قبل چند نکات کا ذہن نشین ہونا ضروری ہے، جو کہ مندرجہ ذیل ہیں :

مستشرقین کی کثیر تعداد کا تعلق مغربی معاشرہ سے ہے اور وہ مشرقی اُصولوں کے برخلاف ثقہ اور غیر ثقہ راویوں اور صحیح اور ضعیف روایتوں کی تمیز کے بغیر صرف ان ہی روایات کو لیتے ہیں جو ان مقاصد کے حصول کو ممکن بناتی ہیں، بیشتر مغربی مصنفین صنف نازک سے متعلقہ اُمور کو مشرقی روایات کے برخلاف مغربی معاشرہ کے رومانوی انداز میں پیش کرتے ہیں، تعدد ازواج کے حوالہ سے معترضین کے اعتراضات میں بغض و عناد کا عنصر شامل ہے، کیوں کہ دین عیسوی کی موجودہ شکل کثرت ازدواج کی مخالف ہے۔

اس تفصیل کے بعد واضح ہو کہ نبی اکرم ﷺ کی ازدواجی زندگی پر مستشرقین کے طرف سے عام طور پر تین اعتراضات کئے جاتے ہیں :

(۱) مستشرقین کا پیغمبر اسلام ﷺ کی ازدواجی زندگی پر سب سے بڑا اعتراض تعدد ازواج سے متعلق ہے۔

(۲) مستشرقین کی طرف سے پیغمبر اسلام ﷺ کی ازدواجی زندگی پر کئے جانے والے اعتراضات میں سے ایک اہم اعتراض نبی اکرم ﷺ کا حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح ہے، جسے مستشرقین افسانہ محبت قرار دیتے ہیں۔

(۳) مستشرقین نبی اکرم ﷺ پر اعتراض کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اُمت کے مردوں کے لئے شادیوں کی جو حد مقرر کی ہے، خود اس پر عمل نہیں کیا۔

اس مختصر مقالہ میں دوسرے اعتراض کا جائزہ لینا ہے :

نبی اکرم ﷺ کی حضرت زینب بنت جحشؓ سے شادی پر مستشرقین نے جس واقعہ کو لعن وطعن اور تشنیع کی بنیاد بنایا ہے وہ واقعہ سراپا غلط اور ملحدین کا گھڑا ہوا ہے؛ لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے رنگ آرائی کے لئے سارا مواد ہماری تفسیر اور سیرت کی کتابوں سے ہی لیا ہے، علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی معرکۃ الاراء تصنیف سیرت النبی ﷺ میں اس واقعہ پر محققانہ اور فاضلانہ گفتگو کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں :

واقعہ کی اصلی اور سادہ حقیقت یہ تھی، مخالفوں نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا ہے گو سرتا پا کذب وافتراء ہے؛ لیکن ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے رنگ آرائی کے لئے سیاہی ہمارے ہی ہاں سے مستعار لی ہے۔

تاریخ طبری میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ زید سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے، زید نہ تھے حضرت زینب کپڑے پہن رہی تھیں، اسی حالت میں آنحضرت ﷺ نے ان کو دیکھ لیا اور یہ الفاظ کہتے ہوئے باہر نکال آئے: ''سبحان الله العظیم سبحان الله مصرف القلوب'' (پاک ہے خدائے برتر، پاک ہے وہ خدا جو دلوں کو پھیر دیتا ہے)۔

حضرت زیدؓ کو یہ حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ زینبؓ اگر آپ کو پسند آ گئی ہو تو میں ان کو طلاق دے دوں۔

میں نے یہ بے ہودہ روایت اپنے دل پر سخت جبر کر کے نقل کی ہے، نقل کفر کفر نہ باشد، یہی روایت ہے جو عیسائی مؤرخوں کا سرمایۂ استناد ہے؛ لیکن ان غریبوں کو یہ نہیں معلوم کہ اُصول فن کے لحاظ سے یہ روایت کس پایہ کی ہے، مؤرخ طبری نے یہ روایت واقدی کے ذریعہ نقل کی ہے جو مشہور کذاب اور دروغ گو ہے، اور جس کا مقصد اس قسم کی بے ہودہ روایتوں سے یہ تھا کہ عباسیوں کی عیش پرستی کے لئے سند ہاتھ آئے۔

طبری کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسی قسم کی بے ہودہ روایتیں نقل کی ہیں؛ لیکن محدثین نے ان کو اس قابل نہیں سمجھا کہ ان سے تعرض کیا جائے، حافظ ابن حجرؒ سخت روایت پرست ہیں، تاہم فتح الباری سورہ احزاب کی تفسیر میں جہاں اس واقعہ سے بحث کی ہے لکھتے ہیں :

و وردت آثار أخرى أخرجها بن أبي حاتم والطبري ونقلها كثير من المفسرين لا ينبغي التشاغل بها ، فتح الباری : باب وتخفي في نفسك ما الله مبديه وتخشى الناس والله أحق أن تخشاه ۔

اور بہت سی روایتیں آتی ہیں جن کو ابن حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے، اور اکثر مفسرین نے ان کو نقل کر دیا ہے، ان روایتوں میں مشغول نہیں ہونا چاہئے۔

حافظ ابن کثیر جو مشہور محدثین میں ہیں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :

ذكر ابن أبي حاتم وابن جرير هاهنا آثارا عن بعض السلف رضي الله عنهم ، أحببنا أن نضرب عنها صفحا لعدم صحتها فلا نوردها ، وقد روى الامام احمد ههنا ايضا من رواية حماد بن زيد عن ثابت عن انس فيه غرابة تركنا سياقه ۔(۱)

ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع پر بعض اسلاف سے چند روایتیں نقل کی ہیں، جن کو ہم اس لئے نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ غلط ہیں اور امام احمدؒ بھی اس واقعہ کے متعلق انسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جو غریب ہے ہم نے اس کا ذکر بھی چھوڑ دیا۔(۲)

اور تقریباً محتاط محدثین اور مفسرین نے اس روایت کی تردید کی ہے اور سند کے لحاظ سے اس کا ساقط الاعتبار اور موضوع ہونا واضح کیا ہے۔

یہ ہے حقیقت ان روایتوں کی جس کو مستشرقین نے بنیاد بنا کر حضرت زینبؓ سے رسول اللہ ﷺ کے نکاح کرنے پر اعتراض کیا ہے اور اس نکاح کو افسانہ محبت قرار دیا ہے؛ چنانچہ مشہور مستشرق سر ولیم میور اپنی کتاب ’’دی لائف آف محمد‘‘ صفحہ: ۵۱۵ پر یہ اعتراض کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

دوسری زینب کی دلکشی اتفاقیہ طور پر ان پر آشکارا ہوئی، وہ اس کے منھ بولے بیٹے اور گہرے دوست زید کی بیوی تھی؛ لیکن وہ اس شعلہ کو نہ بجھا سکا جو وہ (زینب) اس کے سینے میں جلا چکی تھی، اور آسمانی حکم سے وہ اس کے حرم میں آ گئی۔

ولیم میور نے اپنی دوسری کتاب ’’محمد اینڈ اسلام‘‘ صفحہ: ۱۴۰ پر اس اعتراض کو قدرے تفصیل سے اور رومانوی انداز میں لکھا ہے۔

---

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۱۶/۸/۳۷۸۔ (۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: سیرۃ النبی ﷺ: ۱/۲۵۳۔

سویڈش پادری ٹور انڈرائے نے اپنی کتاب محمد دی مین اینڈ ہز فیتھ صفحہ: ۱۵۳ پر، ایک جرمن مستشرق اپنی کتاب بنام ''ہسٹری آف اسلامک پیپل'' صفحہ: ۱۸ پر، ریوکینن سیل اپنی کتاب ''دی لائف آف محمد'' کے آٹھویں باب میں Some Domestic Affairs کے عنوان سے اور برطانوی مستشرق منٹگمری واٹ نے اپنی کتاب ''محمد پرافٹ اینڈ سٹیٹس مین'' میں صفحہ: ۱۵۶ پر اس شادی کو ہدف تنقید بنایا ہے۔

جس روایت کو بنیاد بنا کر مستشرقین نے رسول اللہ ﷺ پر اعتراض کا ہوائی قلعہ تعمیر کیا ہے، وہ واقعہ اور روایت جس طرح سند کے لحاظ سے من گھڑت اور موضوع ہے، اسی طرح درایت اور عقل و قیاس کے رو سے بھی باطل ہے۔

جب حضرت زینب کا نکاح حضور ﷺ سے ہوا، اس وقت ان کی عمر تقریباً ۳۶ سال تھی اور ابھی پردے کا حکم بھی نازل نہیں ہوا تھا، ان دونوں فقروں کو یاد رکھنے کے بعد کوئی بھی شخص اس لغو داستان کو باور نہ کر سکے گا کہ آنحضرت ﷺ حضرت زینب کے حسن کو یکا یک دیکھ کر ان پر فریفتہ ہو گئے تھے، حضرت زینب تو نبی ﷺ کی حقیقی پھوپھی اُمیمہ بنت عبد المطلب کی بیٹی ہیں، پھوپھی زاد بہن ہونے کی حیثیت سے حضور ﷺ کے لئے اجنبی نہ تھیں، آنکھوں کے سامنے پلیں بڑھیں، ان کی شکل وصورت اور حسن و جمال کیوں کر آنحضرت ﷺ سے پوشیدہ رہ سکتی ہے، عورتوں کا حسن نوخیز، کمسن اور کنواری ہونے کی حالت میں زیادہ باعث کشش ہوتا ہے، نہ کہ کسی کی منکوحہ ہو جانے اور ۳۶ سال کی عمر کو پہنچ جانے پر، اور وہ بھی عرب جیسے گرم ملک میں جہاں عورتوں کا شباب جلد ڈھل جاتا ہے، اگر حضرت زینبؓ سے ان کے حسن و جمال کی بنیاد پر آپ ﷺ نکاح کرنا چاہتے تو اپنے آزاد کردہ غلام سے نکاح کرانے کے بجائے خود نکاح کر لیتے؛ جب کہ حضرت زینبؓ اور ان کے گھر کے لوگ حضرت زیدؓ سے نکاح پر راضی ہی نہیں تھے۔

عقل اور عادت، تجربہ اور مشاہدہ ایسی واہی باتوں کی تکذیب کے لئے کافی ہیں، اگر مغربی انداز فکر درست ہوتا تو ان سے ابتدائی دور میں ہی رشتہ مناکحت استوار ہو جاتا، اس میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی، نکاح کا یہ واقعہ ۵ ہجری میں پیش آیا، جب کہ منافقین کا مدینہ میں خاصا زور تھا، اسی مہینے میں واقعہ افک پیش آیا تھا، جسے منافقین نے بڑے زور وشور کے ساتھ اُچھالا تھا، اگر حضرت زینب سے نکاح مستشرقین کے نظریہ مطابق افسانہ محبت ہوتا، یا اس واقعہ نکاح میں اختلاف کی کوئی گنجائش ہوتی یا کوئی پہلو اخلاق سے متصادم ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ منافقین جو اسلام اور مسلمانوں کے شدید مخالف تھے، رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کا بیڑہ اُٹھا رکھا تھا، اس پر شدید رد عمل ظاہر نہ کرتے؛ البتہ لوگوں کو اگر کوئی بات ناگوار گزری تھی تو صرف یہ کہ متبنیٰ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کرنا تھا؛ کیوں کہ ایام جاہلیت میں اس کو حرام سمجھا جاتا تھا؛ لیکن اس نکاح کا مقصد ہی یہ تھا کہ ایام جاہلیت کے اس غلط عقائد

ونظریات پرضرب لگائی جائے اور واضح کیا جائے کہ منھ سے کسی کو بیٹا کہہ دینے سے شریعت کی نظر میں وہ حقیقی بیٹا نہیں ہوجاتا؛ بلکہ وہ شخص حقیقی بیٹا اسی کا ہے جس کے صلب سے وہ پیدا ہوا ہے۔

مذکورہ بالا مباحث سے یہ بات بالکل روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایک طرف حضرت زیدؓ سے زینبؓ کی شادی کا مقصد اسلام کی آفاقی تعلیمات کے مطابق انسانوں میں موجود احساس غلامی وکمتری کا خاتمہ تھا تو دوسری جانب حضرت زینبؓ کو طلاق ہوجانے کے بعد ان سے رسول اللہ ﷺ کی شادی کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول، متبنیٰ کی جاہلانہ رسوم کا خاتمہ اور حضرت زینبؓ کی دلجوئی کرنا تھا، مستشرقین کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ ہمیشہ سے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں انتہائی بد دیانتی اور ناانصافی کے مرتکب رہے ہیں، انھوں نے ایسی ایسی کہانیاں گھڑیں کہ ایک غیر جانبدار شخص کے لئے ان کو تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے، جہاں تک مستشرقین کے اعتراضات کی بات ہے تو جب ان کے آباؤ اجداد نے اللہ کی برگزیدہ ہستیوں یعنی انبیاء بنی اسرائیل کو بھی معاف نہیں کیا، جن کی شریعتوں پر خود ان کا اپنا ایمان تھا، جن کو اپنا پیشوا اور رہنما سمجھتے تھے، تو ایسی قوم سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ وہ حقائق کو مسخ نہیں کرے گی اور اس نبی کی کردار کشی نہیں کرے گی جس پر وہ ایمان ہی نہیں لاتے، انبیاء علیہم السلام سے متعلق عشق بازی اور عیاشی کے واقعات گھڑنے میں جتنی مہارت مستشرقین اور ان کے اسلاف کو حاصل ہے اس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔

● ● ●

حضرت زینبؓ کا نکاح
اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب

مولانا محی الدین غازی◆

حضرت زینب کا واقعہ مورخین کی توجہ کا خاص موضوع رہا ہے، اسلام اور سیرت رسول اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور اس کی تصویر بگاڑنے کے لئے مخالفین اسلام نے اس واقعہ کو خاص ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے، وہیں سیرت پاک کا دفاع کرنے والوں نے بھی اس واقعہ کے سلسلے میں بہت فکرمندی کا اظہار کیا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں :

> مستشرقین نے اس واقعہ کو اپنی رنگ آمیزیوں سے نہایت مکروہ بنا دیا ہے، اور صدمہ کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اس رنگ آمیزی کے لئے سارا مواد ہماری تفسیر وسیرت کی کتابوں ہی سے لیا ہے۔(۱)

شیخ ابوزہرہ لکھتے ہیں :

> راجت هذه الأكذوبة بين المفسرين الذين يتلقون الأخبار من غير تمحيص لذاتها ، ولا تعرُّف دقيق لمصادرها ، ووقع فيها شيخ المؤرخين والمفسرين محمد بن جرير الطبري ، وتكلف وخرَّج عليها تفسير هذه الآيات الكريمة ، وتبعه في ذلك المفسرون ، حتى الذين من شأنهم أن يمحصوا الحقائق كالزمخشري والرازي وغيرهما ، وتلقاها الذين لا يرجون للقرآن ولا لمحمد صلى الله عليه وسلم وقارا في عصرنا ، فكتب كاتب في كتاب له :

◆ استاذ : جامعہ اسلامیہ شانتاپورم، کیرالا۔

(۱) تدبر قرآن: ۲۲۹/۶۔

''محمد العاشق'' وتبعه غيره من تلاميذه أو أشباهه الذين لا يمحصون الحقائق وليس للحقائق الإسلامية في قلوبهم روعة تدفعهم إلى التمحيص ۔ (۱)

یہ جھوٹے قصے ان مفسرین کے درمیان رواج پا گئے جو مصادر اور مراجع کی تحقیق نہیں کرتے اور اس غلطی میں محمد بن جریر طبریؒ جیسے عظیم مفسر بھی پڑ گئے اور ان آیات کی تفسیر میں انھیں تکلف سے کام لینا پڑا اور ان کی ہی پیروی دیگر مفسرین نے بھی کی، یہاں تک کہ وہ مفسرین جن سے بحث وتحقیق کی اُمید تھی جیسے زمخشری اور رازی وغیرہ، انھوں نے بھی تحقیق سے کام نہیں لیا اور ان ہی جھوٹے واقعات کو بنیاد بنا کر ملحد قسم کے افراد رسول پاک ﷺ کی شان میں افترا پردازی کرتے ہیں، ہمارے زمانے کے ایک مصنف نے ان ہی واقعات کی بنیاد پر محمد عاشق (نعوذ باللہ) جیسی کتاب لکھی اور اس مصنف کی پیروی ان لوگوں نے کی جن کے دل ودماغ مسخ ہو گئے ہیں۔

مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں :

بے حیا مخالفین نے ان سارے حقائق کے موجود ہوتے یہ عشق کے افسانے تصنیف کئے، خوب نمک مرچ لگا کر ان کو پھیلایا اور اس پروپیگنڈے کا صور اس زور سے پھونکا کہ خود مسلمانوں کے اندر بھی ان کی گھڑی ہوئی روایات پھیل گئیں۔(۲)

علامہ طاہر بن عاشور کا درج ذیل یہ تجزیہ بھی توجہ طلب ہے، کہ عہد رسالت میں منافقین نے جو سیرت پاک کو داغ دار کرنے کے لئے جھوٹی کہانی گھڑی اور پھیلانے کی کوشش کی اسی جھوٹی کہانی نے آگے چل کر کسی طرح ہماری کتابوں میں جگہ پالی :

وقد رويت في هذه القصة اخبار مخلوطة ، فإياك أن تتسرب إلى نفسك منها أغلوطة ، فلا تصغ ذهنك إلى ما الصقه أهل القصص بهذه الآية من تبسيط في حال النبي صلى الله عليه وسلم حين أمر زيداً بإمساك زوجه ، فإن ذلك من مختلقات القصاصين فإما أن يكون ذلك اختلافاً من القصاص لتزيين القصة ، وإما أن يكون كله

(۱) زہرۃ التفاسیر: ۱/۲۶۔ (۲) تفہیم القرآن: ۴/۶۵۔

أو بعضه من أراجيف المنافقين وبهتانهم فتلقفه القصاص وهو الذى نجزم به ، ومما يدل لذلک أنک لا تجد فيما يؤثر من أقوال السلف فى تفسير هذه الآية أثراً مسنداً إلى النبى صلى الله عليه وسلم أو إلى زيد أو الى زينب أو إلى أحد من الصحابة رجالهم ونسائهم ، ولكنها قصص وأخبار وقيل وقال ۔ (۱)

اس واقعہ میں بہت سی باتیں ملی ہوئی ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہو جائے اور ان باتوں کی طرف کان مت دھرو، جن کو قصہ گو حضرات نے آپ ﷺ کے واقعے میں بڑھا چڑھا کے بیان کیا ہے، جب آپ ﷺ نے حضرت زیدؓ کو اپنی بیوی کو رکھنے کا حکم دیا تھا، یہ سب قصہ گویوں کی مخترعات ہیں، یہ اختراع یا تو قصہ گوئیوں نے حکایت کو پرلطف بنانے کے لئے کیا ہے یا یہ منافقوں کا پروپیگنڈہ ہے اور بہتان طرازی ہے اور وہیں سے قصہ گویوں نے اس کو اختیار کر لیا ہے، اس بات کا مجھے بھی یقین ہے اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں تمہیں سلف کا کوئی ایسا قول نہیں ملے گا جس کی نسبت آپ ﷺ یا حضرت زیدؓ، حضرت زینبؓ یا کسی صحابی یا صحابیہ کی طرف کی گئی ہو، یہ سب خرافات اور بے سروپا باتیں ہیں۔

تین بنیادی سوالات

حضرت زینبؓ کے نکاح کے سلسلے میں تین سوالات مؤرخین کو متوجہ کرتے ہیں :

(۱) حضرت زینبؓ کا حضرت زیدؓ سے نکاح اور اس کا پس منظر۔

(۲) حضرت زینبؓ اور حضرت زیدؓ کے نکاح کا خاتمہ اور اس کا پس منظر۔

(۳) حضرت زینبؓ کا اللہ کے رسول ﷺ سے نکاح اور اس کا پس منظر۔

ہم اس مضمون میں ان تینوں پہلوؤں سے واقف ہونے کی کوشش کریں گے۔

حضرت زینبؓ کا حضرت زیدؓ سے نکاح اور اس کا پس منظر

تاریخ، سیرت اور تفسیر کی کتابوں میں ہمیں یہ تو ملتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت زیدؓ کے ساتھ

(۱) التحریر والتنویر: ۲۲/ ۳۵۔

حضرت زینبؓ کے نکاح کی پیشکش خود کی تھی اوراس پر اصرار بھی کیا تھا؛ بلکہ اگر مفسرین کے بیان کردہ سبب نزول کو تسلیم کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس امر میں دخل دیا اور حضرت زینبؓ اور ان کے خاندان کے لوگوں کو تنبیہ کی کہ وہ اللہ کے رسول کی تجویز کو فوراً قبول کریں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس نکاح کی وہ کیا اہمیت اور مصلحت تھی جس کی وجہ سے اللہ کے رسول نے اس کے لئے اتنا اصرار کیا؟ یہ نہ تو اللہ کے رسول کا معمول تھا، اور نہ یہ اصرار آپ کے بتائے ہوئے اُصول کے مطابق تھا، آپ کا اُصول تو یہ تھا کہ لڑکی کا نکاح اس کی مرضی سے کیا جائے، پھر اس نکاح سے آخر وہ کونسی خاص حکمت پیش نظر تھی کہ آپ ﷺ نے اس قدر اس پر اصرار کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے نکاح کا یہ واقعہ اسلامی تاریخ کا ایک بہت روشن باب ہے، یہ انسانی نابرابری کے خلاف ایک زبردست عملی اقدام تھا، طبقاتی اونچ نیچ کے تصور نے انسانی سماج میں اپنی جڑیں ہر طرف پھیلا دی تھیں، یہ جڑیں بہت مضبوط اور گہری ہو چکی تھیں، نکاح کا یہ واقعہ اس جاہلانہ تصور پر پڑنے والا ایک کاری ضرب تھا، اس نکاح کے خلاف جاہلیت کے پرستاروں کی طرف سے زبردست ردعمل ہوا، ایک آزاد کردہ غلام کو معاشرے میں عزت کا مقام ملا تو جاہلیت کے پرستاروں کی نیند حرام ہوگئی، اور وہ مخالفت میں پاگل ہوگئے۔

اس پہلو سے ہمیں قدماء کے یہاں تو کوئی خاص گفتگو نہیں ملتی ہے، جس سے اس واقعہ کی اہمیت کا یہ پہلو سامنے آتا ہو؛ البتہ علامہ قرطبیؒ کا یہ بیان بڑی اہمیت کا حامل ہے :

> فی هذه الآیة دلیل بل نص فی أن الکفاءة لا تعتبر فی الأحساب وإنما تعتبر فی الأدیان ، خلافاً لمالک والشافعی والمغیرة وسحنون ، وذلک أن الموالی تزوجت فی قریش ، تزوج زید زینب بنت جحش ، وتزوج المقداد بن الأسود ضباعة بنت الزبیر ، وزوج أبوحذیفة سالماً من فاطمة بنت الولید بن عتبة وتزوج بلال أخت عبد الرحمٰن بن عوف ، وقد تقدم هذا المعنی فی غیر موضع ۔ (۱)
>
> اس آیت میں دلیل بلکہ صراحت ہے کہ حسب میں کفاءت کا اعتبار نہ ہوگا، کفاءت کا اعتبار صرف دین داری میں ہوگا، بخلاف امام مالکؒ، امام شافعیؒ حضرت مغیرہ

(۱) تفسیر قرطبی: ۱۴/۱۸۷۔

اورسحنون کے، وہ اس وجہ سے کہ بہت سے موالی نے قریش میں نکاح کیا، حضرت زیدؓ نے زینبؓ بنت جحش سے، حضرت مقدادؓ بن اسود نے ضباعہ بنت زبیر سے، ابوحذیفہؓ نے سالم کا نکاح فاطمہ بنت ولید بن عتبہ سے کرایا، حضرت بلال نے عبدالرحمٰن بن عوف کی بہن سے نکاح کیا اور اس موضوع کی باتیں ایک سے زائد جگہوں پر گزر چکی ہیں۔

تاہم دور جدید کے اسلامی مفکرین نے واقعہ کے اس پہلو پر خاص توجہ دی ہے، تفسیر فی ظلال القرآن کے مصنف سید قطب لکھتے ہیں :

اللہ کے رسول ﷺ نے یہ نکاح سماجی اونچ نیچ کے طبقاتی نظام کو پاش پاش کر دینے کے لئے کیا تھا، اور اس سلسلے میں اسلام کی اعلیٰ قدروں کو ایک عملی نمونے کے ذریعہ لوگوں کے درمیان عام کرنا مقصود تھا۔

سید قطب کے الفاظ ہیں :

فأراد رسول الله صلّى الله عليه وسلّم أن يحقق المساواة الكاملة بتزويجه من شريفة من بني هاشم ، قريبته صلّى الله عليه وسلّم زينب بنت جحش ليسقط تلك الفوارق الطبقية بنفسه ، في أسرته ، وكانت هذه الفوارق من العمق والعنف بحيث لا يحطمها إلا فعل واقعي من رسول الله صلّى الله عليه وسلّم تتخذ منه الجماعة المسلمة أسوة ، وتسير البشرية كلها على هداه في هذا الطريق ۔ (۱)

آپ ﷺ نے بنو ہاشم کی ایک شریف النسب خاتون اور آپ کی رشتہ دار حضرت زینب بنت جحش کے نکاح کے ذریعے سے مکمل مساوات قائم کرنا چاہا؛ تاکہ آپ کے خاندان سے یہ طبقاتی تفریق خود بخود ختم ہوجائے درحقیقت یہ طبقاتی تفریق اس قدر گہری اور شدید تھی کہ اس کو آپ سے صادر ہونے والا عملی اقدام ہی ختم کر سکتا تھا، جس کو اُمتِ مسلمہ اُسوہ بنالے اور تمام انسانیت اس کام میں آپ ﷺ کے طریقے کو اختیار کرلے۔

(۱) فی ظلال القرآن: ۵/ ۲۸۶۵۔

آگے مزید لکھتے ہیں :

وقد مضى أن رسول الله صلّى الله عليه وسلّم زوج زيد بن حارثة الذي كان متبناه ، وكان يدعى زيد ابن محمد ثم دعي إلى أبيه من زينب بنت جحش ، ابنة عمة رسول الله صلّى الله عليه وسلّم ليحطم بهذا الزواج فوارق الطبقات الموروثة ، ويحقق معنى قوله تعالى : ''إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ'' ويقرر هذه القيمة الإسلامية الجديدة بفعل عملي واقعي ۔ (۱)

اور یہ گذر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے زید بن حارثہ جو کہ آپ ﷺ کے متبنیٰ تھے اور جنھیں زید بن محمد پکارا جاتا تھا، بعد کو انھیں ان کے باپ کی طرف منسوب کر کے پکارا جانے لگا، ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش سے کرایا؛ تاکہ اس نکاح کے ذریعے موروثی نسلی امتیازات کو پاش پاش کیا جا سکے اور باری تعالیٰ کے اس قول کی حقیقت کو ثابت کیا جا سکے کہ ''آپ میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم وہ لوگ ہیں جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے ہیں'' اور اس نئی اسلامی قدر کو عملی اور زمینی شکل میں نافذ کریں۔

مولانا مودودی لکھتے ہیں :

آپ نے خود اصرار کر کے حضرت زیدؓ سے ان کا نکاح کرایا تھا، ان کا خاندان اس پر راضی نہ تھا کہ قریش کے اتنے اونچے گھرانے کی لڑکی ایک آزاد کردہ غلام سے بیاہی جائے، خود حضرت زینبؓ بھی اس رشتے سے ناخوش تھیں؛ مگر حضور ﷺ کے حکم سے سب مجبور ہو گئے، اور حضرت زیدؓ کے ساتھ ان کی شادی کر کے عرب میں اس امر کی پہلی مثال پیش کر دی گئی کہ اسلام ایک آزاد کردہ غلام کو اُٹھا کر شرفائے قریش کے برابر لے آیا ہے۔(۲)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں :

اس نکاح کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ غلاموں سے متعلق لوگوں کے تصورات کی اصلاح کی

(۱) فی ظلال القرآن: ۵/ ۲۸۶۵۔

(۲) تفہیم القرآن: ۴/ ۶۴-۶۵۔

جائے ، وہیں اس نکاح کا ایک دوسرا مقصد حضرت زیدؓ کی عزت افزائی بھی تھا کہ انھوں نے اللہ کے رسول کی رفاقت کے لئے آپ کی غلامی کو آزادی پر ترجیح دی ، حضور نے ان کی عزت افزائی کے لئے ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن ، حضرت زینب بنت جحش کے ساتھ کردیا، ان کا تعلق خاندان بنی اسد سے تھا ، ان کی والدہ امیمہ بنت عبدالمطلب تھیں ، جب حضور نے حضرت زیدؓ کے لئے حضرت زینبؓ کو پیغام دیا تو ان کے عزیزوں کو اس رشتہ پر اعتراض ہوا کہ حضرت زید ایک آزاد کردہ غلام اور غیر کفو ہیں ؛ لیکن آنحضرت ﷺ یہ چاہتے تھے کہ غلاموں سے متعلق لوگوں کے تصورات میں تبدیلی پیدا ہو اس وجہ سے آپ ﷺ نے اس نکاح پر اصرار فرمایا، بالآخر حضرت زینب راضی ہوگئیں اور نکاح ہوگیا۔(۱)

شیخ محمد عبدہ اور بعض دیگر مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت زیدؓ سے حضرت زینبؓ کا نکاح تبنی کی رسم کو ختم کرنے کے لئے ہوا تھا، یعنی یہ کہ پہلے دن سے منصوبہ یہ تھا کہ حضرت زیدؓ سے حضرت زینبؓ کا نکاح ہو، پھر طلاق ہو، اور پھر آپ ﷺ سے حضرت زینبؓ کا نکاح ہو، غرض شروع سے آخر تک مقصد ایک تھا اور وہ تبنی کی رسم کو ختم کرنا تھا، ان کے الفاظ میں :

لهذا أرغم النبي صلى الله عليه وسلم زينب أن تتزوج بزيد ، وهو مولاه وصفيه ، والنبي يجد في نفسه أن هذا الزواج مقدمة لتقرير شرع وتنفيذ حكم إلهي ـ (۲)

اس لئے آپ نے زینب پر زور ڈالا کہ وہ حضرت زید سے نکاح کریں، اور وہ آپ کے آزاد کردہ غلام اور آپ کے عزیز تھے، آپ نے اس بات کو محسوس کیا کہ یہ نکاح شریعت کو قائم کرنے اور حکم الٰہی کی تنفیذ کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

اس نکاح کے سلسلے میں اس پر بھی گفتگو ہوسکتی ہے کہ یہ نکاح حضرت زینبؓ کی مرضی سے ہوا تھا یا ان کی مرضی کی پرواہ کئے بغیر ان کے اوپر مسلط کیا گیا تھا؟

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اور قدیم مفسرین کا بھی یہی خیال سامنے آتا ہے کہ حضرت زینبؓ نے حضرت زیدؓ کی اس پیش کش کی شدید مخالفت کی تھی :

(۱) تدبر قرآن: ۲۲۷/۶۔ (۲) الأعمال الكاملة لمحمد عبده: ۲۹۴/۵۔

رَوَى قَتَادَةُ وَابْنُ عَبَّاسٍ وَمُجَاهِدٌ فِي سَبَبِ نُزُولِ هَذِهِ الْآيَة : أن رسول الله صلى الله عليه وسلم خطب زينب بنت جحش ، وكانت بنت عمته ، فظنت أن الخطبة لنفسه ، فلما تبين أنه يريدها لزيد ، كرهت وأبت وامتنعت ، فنزلت الآية ، فأذعنت زينب حينئذ وتزوجته ، في رواية : فامتنعت وامتنع أخوها عبد الله لنسبها من قريش ، وأن زيداً كان بالامس عبداً ، إلى أن نزلت هذه الآية ، فقال له أخوها : مرني بما شئت ، فزوجها من زيد ۔ (۱)

حضرت قتادہ ابن عباس اور مجاہد نے اس آیت کا شانِ نزول یہ ذکر کیا ہے کہ'' آپ ﷺ نے زینب بنت جحش کو نکاح کا پیغام دیا، جو کہ آپ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، انھیں (حضرت زینب) کو یہ گمان ہو چکا کہ آپ نے یہ پیغام اپنے لئے بھیجا ہے، جب یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ پیغام حضرت زید کے لئے تھا تو انھوں نے ناگواری کا اظہار کیا اور انکار کر دیا، تو آیت نازل ہوئی، جس کی وجہ سے حضرت زینب نکاح کے لئے تیار ہو گئیں اور نکاح کر لیا، ایک روایت میں ہے کہ وہ بھی باز رہیں اور ان کے بھائی عبداللہ بھی ان کے قریشی النسب ہونے کی وجہ سے، جب کہ حضرت زید ابھی گذشتہ دنوں غلام تھے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی تو ان کے بھائی نے آپ ﷺ سے کہا آپ جیسا حکم دیں اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت زید سے نکاح کروا دیا۔

بعض لوگوں کی تعبیر سے لگتا ہے کہ یہ ایک طرح سے جبری شادی تھی، شیخ محمد عبدہ لکھتے ہیں :

فكأنه أرغمها على زواجه لما ألهمه الله من المصلحة لها وللمسلمين في ذلك ۔ (۲)

شیخ مراغی کے الفاظ ہیں :

وما رسخ في النفوس بحكم العادة لا يمكن التخلص منه إلا بإرادة قوية تسخر بسلطانها ، ولا تجعل لها حكما في الأعمال إذا كانت

---

(۱) تفسیر قرطبی: ۱۸۶/۱۴۔ (۲) الأعمال الكاملة لمحمد عبده: ۲۹۲/۵۔

المصلحة في خلاف ذلك ، ومن ثم ألهم الله رسوله أن يلغي هذا الحكم بالعمل كما ألغى بالقول في أحد عتقاه ، ومن ثمّ أرغم بنت عمته لتتزوج بزيد وهو متبناه ليكون هذا الزواج مقدمة لتشريع إلهي جديد ، (۱)

انسان جن چیزوں کا عادی ہوجاتے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بڑے طاقتور ارادہ کی ضرورت ہے جو عادت کو زیر کردے اور انسان اعمال میں عادت کا رہین منت نہ رہے، اگر عادت مصلحت شرعی کے خلاف ہو، اس وجہ سے اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ عادت کو عملاً ختم کریں، جس طرح قولاً اسے ختم کیا، اس وجہ سے آپ نے اپنی پھوپھی زاد بہن کا نکاح اپنے منھ بولے بیٹے سے کیا؛ تاکہ یہ نکاح نئی شریعت کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

تاہم مولانا امین احسن اصلاحی کا خیال ہے، اصل مخالفت حضرت زینب کی طرف سے نہیں؛ بلکہ ان کے خاندان والوں کی طرف سے ہوئی تھی، حضرت زینبؓ بآسانی راضی ہوگئی تھیں :

حضرت زید وحضرت زینب کے واقعہ کی جو تفصیل ہم نے اوپر پیش کی ہے اس سے یہ امر واضح ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی حضور ﷺ کے کسی فیصلہ کی مخالفت نہیں کی تھی، حضرت زینب کو جب حضور ﷺ نے حضرت زید کے لئے پیغام دیا تو ان کو معلوم تھا کہ یہ کوئی حکم نہیں؛ بلکہ ایک پیغام ہے، جس میں وہ اپنی پسند یا ناپسند کے اظہار کے لئے آزاد ہیں، بعد میں جب ان کو معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی خواہش یہی ہے کہ یہ رشتہ ہوجائے تو انھوں نے اس کو منظور فرمالیا۔(۲)

حضرت زینبؓ نے اللہ کے رسول کی تجویز کو فوراً قبول کرلیا ہو، یا غور وفکر اور پس وپیش کے بعد کیا ہو، اس سے قطع نظر یہ تسلیم کرنا تو لازم ہے کہ حضرت زینبؓ نے اس تجویز کو قبول کرکے اور اس پر عمل کرکے بہت زبردست عزیمت کا ثبوت دیا تھا، ان کی ہمت اور شجاعت قابل داد ہے، یہ وہ محاذ تھا جس پر جوہر شجاعت دکھانے کے لئے کسی خاتون کو ہی سامنے آنا تھا، یہ کتنی بڑی عزیمت کا کام تھا، اسے سوچ کر ہی اچھے اچھے مردوں کو پسینہ آجاتا ہے۔

حضرت زینب کا یہ کردار رہتی دنیا تک ان تمام بہادر اور جری خواتین کے لئے بہترین نمونہ ہے، جو معاشرہ کے جاہلی تصورات کے خلاف جنگ کرنے اور اس جنگ کی شدید ضربیں سہنے کے لئے خود کو پیش کریں۔

(۱) تفسیر المراغی: ۲۲/۱۳۔ (۲) تدبر قرآن: ۲۳۲/۶۔

حضرت زنیب اور حضرت زید کے نکاح کے خاتمے کا پس منظر

اس سلسلے میں مفسرین کے یہاں مختلف رایوں کا ذکر ملتا ہے، ہم بعض رایوں کا یہاں ذکر کریں گے :

پہلی رائے

اس بارے میں ایک رائے تو وہ ہے جو امام طبری نے اہل تاویل کی طرف منسوب کر کے ذکر کی ہے، اس رائے کے مطابق کسی موقعہ پر حضرت زینبؓ پر اللہ کے رسول کی نگاہ پڑ گئی، ان کے حسن و جمال سے آپ متاثر ہو گئے، اور آپ کے دل میں حضرت زینب کی محبت پیدا ہو گئی، جس کا علم حضرت زیدؓ کو ہو گیا، اور اس کے بعد حضرت زیدؓ نے حضرت زینب سے اللہ کے رسول کے حق میں دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا، وہیں اللہ نے حضرت زید کو حضرت زینب سے متنفر اور دور کر دیا، اور وہ ان کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں رہے، بالآخر نوبت طلاق تک جا پہنچی، تفسیر طبری کی عبارت یوں ہے :

يقول تعالیٰ ذكره لنبيه صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّم عتاباً من الله له (و) اذكر يا محمد (إِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِ) بالهداية (وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ) بالعتق، يعني زيد بن حارثة مولى رسول الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّم (أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ) و ذلك أن زينب بنت جحش فيما ذكر رآها رسول الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّم فأعجبته، وهي في حبال مولاه، فأُلقِي في نفس زيد كراهتها لما علم الله مما وقع في نفس نبيه ما وقع، فأراد فراقها، فذكر ذلك لرسول الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّم زيد، فقال له رسول الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّم: (أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ) وهو صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّم يحب أن تكون قد بانت منه لينكحها (وَاتَّقِ اللَّهَ) وخف الله في الواجب له عليك في زوجتك (وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ) يقول: وتخفي في نفسك محبة فراقه إياها لتتزوجها إن هو فارقها، والله مبد ما تخفي في نفسك من ذلك (وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ) يقول تعالیٰ ذكره: وتخاف أن يقول الناس: أمر رجلا بطلاق امرأته ونكحها حين طلقها، والله أحق أن تخشاه من الناس: وبنحو الذي قلنا في ذلك قال أهل التأويل ۔ (۱)

(۱) تفسیر طبری: ۲۰/ ۲۷۳۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے ﷺ کو تنبیہ فرماتے ہوئے ان کا ذکر کیا اے محمد! (جب آپ کہنے لگے اس شخص کو جس پر اللہ نے احسان کیا) ہدایت کے ذریعے (اور آپ نے احسان کیا) آزاد کر کے یعنی زید بن حارثہ آپ کے آزاد کردہ غلام کو (رہنے دے اپنے پاس اپنی بیوی کو اور اللہ سے ڈر) وہ اس وجہ سے کہ جیسا کہ گزر چکا ہے، آپ ﷺ نے زینب بنت جحش کو دیکھا تو وہ آپ کو بھلی معلوم ہوئی؛ حالاں کہ وہ آپ کے آزاد کردہ غلام کی بیوی ہیں، تو حضرت زید کے دل میں ان سلسلے میں ناخوشگواری پیدا کر دی گئی، اس وجہ سے کہ اللہ کو ان باتوں کا علم تھا جو آپ کے دل میں ہے، حضرت زید نے ان کو چھوڑنا چاہا اور اس کا ذکر آپ ﷺ کے پاس کیا تو آپ نے ان سے کہا کہ (اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رکھو) حالاں کہ آپ بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ ان سے الگ ہوجائے؛ تاکہ آپ ان سے نکاح کرلیں، (اور اللہ سے ڈر) اور اللہ کا خوف کر اپنی بیوی کے ان حقوق کے بارے میں جو تجھ پر واجب ہیں، (آپ چھپاتے تھے اپنے دل میں ایک چیز جس کو اللہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں) فرمایا: ''آپ اپنے دل ہی دل میں چاہتے ہیں کہ وہ ان کو چھوڑ دے؛ تاکہ آپ ان سے نکاح کرلیں، اور وہ ان کو چھوڑ کے رہیں گے اور آپ جو اپنے دل میں ان کے سلسلے میں دبائے ہوئے ہیں اللہ اس کو ظاہر کر کے رہے گا (آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں، آپ کو اللہ سے زیادہ ڈرنا چاہئے) اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ڈرتے ہیں کہ لوگ کہیں گے کہ آپ نے ایک شخص کو کہا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور جب اس نے طلاق دے دیا تو آپ نے نکاح کرلیا؛ حالاں کہ آپ کو اللہ سے زیادہ ڈرنا چاہئے اور اس جیسی بات دیگر مفسرین نے بھی کہی ہے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

اس رائے کو بہت سارے مفسرین نے اختیار کیا، تاہم اس رائے پر بعد کے متعدد مفسرین نے شدید تنقید بھی کی ہے، اور اس بات کو شانِ نبوت کے خلاف قرار دیا کہ اللہ کے رسول کے دل میں کسی دوسرے شخص کی منکوحہ سے محبت ہوجائے اور پھر اس کی طلاق ہوجانے اور پھر اس سے شادی کرلینے کا خیال پیدا ہوجائے، ابوحیان لکھتے ہیں :

وَلِبَعْضِ الْمُفَسِّرِينَ كَلَامٌ فِي الْآيَةِ يَقْتَضِي النَّقْصَ مِنْ مَنْصِبِ النُّبُوَّةِ، ضَرَبْنَا عَنْهُ صَفْحًا۔ (۱)

(۱) البحر المحيط في التفسير: ۸/۴۸۲۔

اس آیت کے سلسلے میں بعض مفسرین کی آراء ایسی ہیں جو شانِ نبوت کے منافی ہیں؛
لہٰذا ہم نے ان کو چھوڑ دیا ہے۔

خازن کے الفاظ ہیں :

هذا إقدام عظيم من قائله وقلة معرفة بحق النبي صلّى الله عليه وسلّم وبفضله ۔ (۱)

یہ بہت سنگین اقدام ہے، اس شخص کی جانب سے جو آپ کے فضائل اور رتبے سے ناواقف ہے۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں :

ذَكَرَ ابْنُ جَرِيرٍ ، وَابْنُ أَبِي حَاتِمٍ هَا هُنَا آثَارًا عَنْ بَعْضِ السَّلَفِ ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ ، أَحْبَبْنَا أن نضرب عَنْهَا صفحا لِعَدَمِ صِحَّتِهَا فَلَا نُورِدُهَا . (۲)

ابن جریر اور ابن حاتم نے اس ضمن میں بعض اسلاف کے اقوال کو ذکر کیا ہے؛ لیکن ان کی عدم صحت کی بنا پر ان کو ذکر نہیں کر رہے ہیں۔

ابن العربی نے تو اس رائے کی تردید بہت تفصیل اور بڑی طاقت کے ساتھ کی ہے، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ابن العربی سے قبل کے مفسرین کے یہاں اس رائے کو قبول عام حاصل تھا، ابن الجوزی نے اسے یوں ذکر کیا ہے :

وقد ذهب بعض العلماء إلى تنزيه رسول الله صلى الله عليه وسلّم من حُبِّها وإيثاره طلاقها ، وإن كان ذلك شائعاً في التفسير . (۳)

بعض علماء نے حضرت زینب سے محبت اور حضرت زید کو طلاق دینے پر اُبھارنے سے آپ کی ذات کو پاک قرار دیا ہے، اگرچہ یہ باتیں تفسیروں میں عام ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ طبری نے اس رائے کو اہل تاویل یعنی اس زمانے کے مفسرین کی رائے قرار دیا، ابن الجوزی نے اسے رائج تفسیر بتایا، اور یہی نہیں؛ بلکہ بعد کی بھی متعدد تفاسیر میں اسی رائے کو ترجیح دی گئی ہے، چنانچہ تفسیر جلالین میں بھی یہی رائے اختیار کی گئی :

(۱) تفسیر خازن: ۳/ ۴۲۷۔ (۲) تفسیر ابن کثیر: ۶/ ۴۲۴۔

(۳) زادالمسیر فی علم التفسیر: ۳/ ۴۶۷۔

و تخفي في نفسك ما الله مبديه مظهره من محبتها و أن لو فارقها زيد تزوجتها ۔ (۱)

تم ان باتوں کو اپنے دلو میں چھپائے ہو، جن کو اللہ ظاہر کرنا چاہتا ہے، یعنی حضرت زینب کی محبت کو کہ وہ اگر ان کو چھوڑ دے تو آپ ان سے نکاح کر لیں۔

دوسری رائے

اس رائے کے بالمقابل ایک دوسری رائے امام زین العابدین کے حوالے سے مفسرین کے درمیان ذکر کی جاتی رہی، اس رائے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہوا، ایک طرف تو اللہ کے رسول کو اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ حضرت زیدؓ اب حضرت زینبؓ کو طلاق دے دیں گے، اور حضرت زینبؓ سے آپ کا نکاح ہو جائے گا، دوسری طرف حضرت زیدؓ کے دل میں بات ڈال دی کہ وہ حضرت زینبؓ کو طلاق دے دیں، تفسیر خازن میں ہے :

وأصح ما في هذا الباب ماروي عن سفيان بن عيينة عن علي بن زيد بن جدعان قال : سألني زين العابدين علي بن الحسين قال ما يقول الحسن في قوله تعالىٰ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ قلت : يقول لما جاء زيد إلىٰ رسول الله صلّى الله عليه وسلّم فقال يا رسول الله إني أريد أن أطلق زينب أعجبه ذلك ، وقال أمسك عليك زوجك واتق الله فقال علي بن الحسين ليس كذلك فإن الله عز وجل ، قد أعلمه أنها ستكون من أزواجه و أن زيدا سيطلقها فلما جاء زيد قال : إني أريد أن أطلقها قال له : أمسك عليك زوجك فعاتبه الله تعالىٰ وقال لم قلت أمسك عليك زوجك وقد أعلمتك أنها ستكون من أزواجك وهذا هو الأولى والأليق بحال الأنبياء وهو مطابق للتلاوة لأن الله تعالىٰ أعلم أنه يبدي ويظهر ما أخفاه ولم يظهر غير تزويجها منه ۔ (۲)

---

(۱) تفسیر جلالین:۵۵۶۔

(۲) تفسیر خازن:۳/ ۴۲۷۔

اس بات کی سب سے صحیح روایت وہ ہے جس کو سفیان بن عیینہ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے، جس کو انھوں نے علی بن زید بن جدعان سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ زین العابدین علی بن حسن نے مجھ سے پوچھا کہ (آپ اپنے دل میں چھپاتے ہیں ایک بات کو اور اللہ کھولنا چاہتا ہے اور آپ ڈرتے تھے لوگوں سے اور آپ کو اللہ سے زیادہ ڈرنا چاہئے) اس آیت کے سلسلے ل میں حضرت حسن کی رائے کیا تھی، میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ جب زید بن حارثہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ میں زینب کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آپ کو ان سے، بہت حیرت ہوئی، آپ نے فرمایا ''اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رکھو اور اللہ سے ڈرو'' تو علی بن حسن نے فرمایا یہ بات ایسی نہیں ہے، اللہ رب العزت نے آپ کو پہلے ہی بتلا دیا تھا کہ وہ آپ کی زوجہ ہوں گی اور زید ان کو طلاق دے دیں گے، جب حضرت زید آئے اور یہ کہا کہ میں اس کو طلاق دینا چاہتا ہوں تو آپ نے کہا اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رکھو، جس کی وجہ سے اللہ نے آپ کو تنبیہ کی اور کہا کہ آپ نے یہ کیوں کہا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رکھو؛ حالاں کہ ہم آپ کو بتلا چکے ہیں کہ وہ بہت جلد آپ کی زوجہ ہوں گی اور یہی رائے انبیاء کے مرتبے کے موافق اور قریب ترین ہے اور اللہ کے اس فرمان کے مطابق بھی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا تھا کہ اللہ ان باتوں کو ظاہر کرے گا، جن باتوں کو آپ چھپاتے ہیں اور اللہ نے آپ سے ان کے نکاح کے علاوہ اور کوئی بات ظاہر نہ کی۔

امام ابن العربی نے اس دوسری رائے کی بھرپور وکالت کی ہے، وہ لکھتے ہیں :

وَ إِنَّمَا كَانَ الْحَدِيثُ أَنَّهَا لَمَّا اسْتَقَرَّتْ عِنْدَ زَيْدٍ جَاءَهُ جِبْرِيلُ : إِنَّ زَيْنَبَ زَوْجُك ، وَلَمْ يَكُنْ بِأَسْرَعَ أَنْ جَاءَهُ زَيْدٌ يَتَبَرَّأُ مِنْهَا ، فَقَالَ لَهُ : اتَّقِ اللهَ ، وَ أَمْسِكْ عَلَيْك زَوْجَك ، فَأَبَى زَيْدٌ إلَّا الْفِرَاقَ ، وَطَلَّقَهَا وَانْقَضَتْ عِدَّتُهَا ، وَخَطَبَهَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَىٰ يَدَيْ مَوْلَاهُ زَوْجِهَا ، وَ أَنْزَلَ اللهُ الْقُرْآنَ الْمَذْكُورَ فِيهِ خَبَرُ هُمَا ، هَذِهِ الْآيَاتُ الَّتِي تَلَوْنَاهَا وَفَسَّرْنَاهَا ، فَقَالَ : وَاذْكُرْ يَامُحَمَّدُ إِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْت عَلَيْهِ : أَمْسِكْ عَلَيْك زَوْجَك ، وَاتَّقِ اللهَ

فِي فِرَاقِهَا ، وَ تُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللهُ مُبْدِيهِ يَعْنِي مِنْ نِكَاحِكَ لَهَا ، وَهُوَ الَّذِي أَبْدَاهُ لَا سِوَاهُ ۔ (۱)

حقیقی بات یہ ہے کہ جب حضرت زینب زید کے ساتھ زندگی گزارنے لگیں تھیں، حضرت جبرئیل آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ زینب آپ کی بیوی ہوں گی، ابھی کچھ ہی وقت گذرا تھا کہ حضرت زید آئے اور آپ کے سامنے ان سے خلاصی طلب کرنے لگے، آپ نے ان سے کہا اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رکھو؛ لیکن حضرت زید تفریق ہی کے قائل تھے؛ لہٰذا انھوں نے ان کو طلاق دے دی اور عدت گذرنے کے بعد آپ نے اپنے مولی کے ہاتھوں اپنے نکاح کا پیغام بھیجا اور اللہ نے قرآن نازل کیا، جس میں یہی دونوں باتیں مذکور ہیں، جس کو ہم نے ذکر کیا ہے اور ان کی وضاحت کی ہے، فرمایا کہ یاد کرا ے محمد! جب آپ نے اس شخص سے کہا جس پر اللہ نے احسان کیا اور آپ نے احسان کیا، رہنے دے اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی اور اللہ سے ڈر، اپنی بیوی سے دوری اختیار کرنے میں آپ چھپاتے تھے، اپنے دل میں ایک چیز جس کو اللہ کھولنا چاہتا ہے، یعنی آپ کا ان سے نکاح سے اور جس بات کو اللہ نے ظاہر کیا یہ وہی تھی۔

تیسری رائے

ایک تیسری رائے بعد کے مفسرین نے اختیار کی، وہ یہ کہ حضرت زینبؓ کے مزاج میں تیزی تھی، اور ان کے دل میں اپنی بڑائی کا احساس تھا، جس کا وہ اظہار کیا کرتی تھیں، اور یہی بات بڑھ کر طلاق تک پہنچی، ابن کثیر کے الفاظ ہیں :

فَمَكَثَتْ عِنْدَهُ قَرِيبًا مِنْ سَنَةٍ أَوْ فَوْقَهَا ، ثُمَّ وَقَعَ بَيْنَهُمَا ، فَجَاءَ زَيْدٌ يَشْكُوهَا إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔ (۲)

میں ان کے پاس ایک سال یا اس سے کچھ زائد تھی، پھر ان دونوں کے درمیان اختلاف ہو گیا، جس کی شکایت حضرت زید آپ ﷺ کے پاس کرنے لگے۔

(۱) احکام القرآن لابن العربی: ۵۷۶/۳۔

(۲) تفسیر ابن کثیر: ۴۲۴/۶۔

علامہ ابن عاشور لکھتے ہیں :

وَاعْلَمْ أَنَّ الْمَأْثُورَ الصَّحِيحَ فِي هٰذِهِ الْحَادِثَةِ ، أَنَّ زَيْدَ بْنَ حَارِثَةَ بَقِيَتْ عِنْدَهُ زَيْنَبُ سِنِينَ فَلَمْ تَلِدْ لَهُ ، فَكَانَ إِذَا جَرَى بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا مَا يَجْرِي بَيْنَ الزَّوْجَيْنِ تَارَةً مِنْ خِلَافٍ أَدْلَتْ عَلَيْهِ بِسُؤْدُدِهَا وَغَضَّتْ مِنْهُ بِوِلَايَتِهِ فَلَمَّا تَكَرَّرَ ذٰلِكَ عَزَمَ عَلَى أَنْ يُطَلِّقَهَا وَجَاءَ يُعْلِمُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَزْمِهِ عَلَى ذٰلِكَ لِأَنَّهُ تَزَوَّجَهَا مِنْ عِنْدِهِ. (۱)

اور جان لیجئے کہ اس واقعہ میں جو سب سے صحیح بات مذکور ہے وہ یہ ہے کہ حضرت زینب، حضرت زید کے پاس چند سال رہیں؛ لیکن ان کے یہاں ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تو ان کے درمیان بھی اسی طرح نزاعات ہونے لگے، جس طرح عام طور پر میاں بیوی کے درمیان ہوا کرتے ہیں، وہ اس میں ان سے ترش روی سے پیش آتیں اور ان پر اپنی بڑائی جتلاتی، جب یہ معاملہ روز بروز بڑھنے لگا تو حضرت زید نے ان کو طلاق دینے کا پختہ ارادہ کرلیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے؛ تا کہ آپ کو اپنے ارادے سے باخبر کرسکیں؛ کیوں کہ ان سے نکاح آپ ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔

مذکورہ رایوں پر ایک نظر

پہلی رائے تو یکسر مسترد کردینے کے قابل ہے، اس رائے کی پشت پر جو روایات ذکر کی جاتی ہیں ان کو ناقابل اعتبار بتایا گیا ہے، ابن العربی کے الفاظ میں: ''وَهٰذِهِ الرِّوَايَاتُ كُلُّهَا سَاقِطَةُ الْأَسَانِيدِ'' اس پر مزید یہ اضافہ ضروری ہے کہ اسناد سے قطع نظر اللہ کے رسول کے مقام عالی سے ٹکرانے والی کسی بھی رائے یا روایت کو رد کرنے میں ہمیں تردد نہیں ہونا چاہئے، امام ابن العربی نے بالکل درست کہا ہے :

وَعَهِدْنَا إِلَيْكُمْ عَهْدًا لَنْ تَجِدُوا لَهُ رَدًّا أَنَّ أَحَدًا لَا يَنْبَغِي أَنْ يَذْكُرَ نَبِيًّا إِلَّا بِمَا ذَكَرَهُ اللّٰهُ ، لَا يَزِيدُ عَلَيْهِ ، فَإِنَّ أَخْبَارَهُمْ مَرْوِيَّةٌ ، وَأَحَادِيثَهُمْ مَنْقُولَةٌ بِزِيَادَاتٍ تَوَلَّاهَا أَحَدُ رَجُلَيْنِ : إِمَّا غَبِيٌّ عَنْ مِقْدَارِهِمْ ، وَإِمَّا بِدْعِيٌّ لَا رَأْيَ لَهُ فِي بِرِّهِمْ وَوَقَارِهِمْ ، فَيَدُسُّ تَحْتَ الْمَقَالِ الْمُطْلَقِ الدَّوَاهِي ، وَلَا يُرَاعِي الْأَدِلَّةَ وَلَا النَّوَاهِيَ ۔ (۲)

(۱) التحریر والتنویر: ۳۱/۲۲۔ (۲) احکام القرآن لابن العربی: ۴۷۶/۳۔

میں قسم کھا کے تم سے کہتا ہوں اور میری بات کا تمہیں کوئی انکار کرنے والا بھی نہیں ملے گا وہ کہ ہرایک کے لئے ضروری ہے کہ وہ آپ کا ذکر اسی انداز میں کرے، جیسا کہ اللہ نے کیا بغیر کمی بیشی کے تو ان کے مرتبہ کی شان کے خلاف جو منقول احادیث ہیں ان کا ذمہ دار دو شخص ہی ہوسکتا ہے ایک وہ کہ جو آپ کے مرتبے سے ناواقف ہو، دوسرا وہ انوکھا شخص جس کی رائے کا اعتبار نہ ہو۔

ہمارے بعض مفسرین جیسے طاہر بن عاشور نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر طبری کی رائے اور اس کی تائیدی روایتوں کو درست مان لیں تو بھی مقام نبوت پر کوئی آنچ نہیں آتی؛ لیکن یہ کوشش اپنے آپ میں غلط تھی، اور اسی لئے صاف رائیگاں گئی، جو بات واضح طور سے شان نبوت کے خلاف ہو اس کی سختی سے تردید کرنا چاہئے، نہ یہ کہ ان کی توجیہہ وتاویل کی کوشش کی جائے۔

دوسری رائے میں مقام نبوت کی رعایت کی گئی ہے؛ لیکن یہ اُلجھن باقی رہتی ہے کہ آخر حضرت زیدؓ نے حضرت زینب کو طلاق کیوں دی تھی اور اس کے ظاہری اسباب کیا تھے۔

تیسری رائے میں اسی الجھن کا جواب دینے کی اور طلاق کی ایک معقول وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مولانا مودودی کے الفاظ ہیں :

حضرت زینبؓ نے اگرچہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم مان کر ان کے نکاح میں جانا قبول کرلیا تھا؛ لیکن وہ اپنے دل سے اس احساس کو کسی طرح نہ مٹا سکیں کہ زید ایک آزاد کردہ غلام ہیں، ان کے اپنے خاندان کے پروردہ ہیں، اور وہ عرب کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی ہونے کے باوجود اس کم تر درجے کے آدمی سے بیاہی گئی ہیں، اس احساس کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں انھوں نے کبھی حضرت زید کو اپنے برابر کا نہ سمجھا، اور اسی وجہ سے دونوں کے درمیان تلخیاں بڑھتی چلی گئیں، ایک سال سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری تھی کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔(۱)

اس سے زیادہ سخت لہجے میں محمد عبدہ نے یہی بات لکھی ہے :

وبعد أن صارت زينب إلى زيد لم يلن إباؤها الأول (ولم يسلم قيادها بل شمخت) بأنفها وذهبت تؤذي زوجها وتفخر عليه بنسبها وبأنها أكرم منه عرفا وأصرح منه حرية. (۲)

(۱) تفہیم القرآن: ۱۰۰/۴۔ (۲) الاعمال الکاملۃ لمحمد عبدہ: ۲۹۴/۵۔

> حضرت زینب کا حضرت سے زید سے نکاح ہونے کے باوجود بھی وہ اپنے پہلے احساس کو بھلا نہ سکیں اور حضرت زید ان کو قابو میں نہ لا سکے تھے؛ بلکہ وہ ان پر اپنی برتری جتلاتی اور اپنے شوہر کو تکلیف پہنچانے لگیں اور ان کو اپنے نسب سے کم تر ہونے کا احساس دلاتیں، اس طور پر کہ وہ معاشرے میں ان سے معزز ہیں اور نسلاً آزاد ہیں۔

اس رائے سے حضور اکرم ﷺ کا دامن تو آلودہ ہونے سے بچ گیا؛ لیکن اس میں بھی سقم ہیں، ایک تو یہ کہ اس طرح حضرت زینب کی ایک بگڑی ہوئی تصویر سامنے آتی ہے، ظاہر ہے کہ حضرت زینب کے اوپر خاندانی برتری کے گھمنڈ کا الزام لگانے کے لئے جس قدر مضبوط اور نا قابل تردید دلائل درکار ہیں، وہ ہمارے پاس نہیں ہیں، ایسی صورت میں اس عظیم شخصیت پر خاندانی برتری کے گھمنڈ کا الزام لگانا درست نہیں ہے، جس عظیم خاتون نے خاندانی اونچ نیچ کے خلاف ایک شدید تاریخی جنگ میں سب سے آگے بڑھ کر اپنے جذبات کی قربانی دی ہو، اس کے اوپر اسی جذبے کا شکار ہونے کا الزام لگانا قرین انصاف نہیں لگتا ہے۔

دوسرا بڑا اشکال یہ ہے کہ اس طرح ہم کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت زید سے حضرت زینب کی شادی جس منصوبے کے تحت کی تھی وہ منصوبہ ناکامی کا شکار ہو گیا، اللہ کے رسول نے تو اس شادی کے ذریعہ دنیا کے سامنے انسانی برابری کا ایک عملی نمونہ پیش کیا تھا، اگر مذکورہ وجوہات کی وجہ سے وہ رشتہ ناکام ہوتا تو رشتوں کے سلسلے میں انسانی برابری کے اس تصور پر آنچ آتی ہے، جو اسلام پیش کرتا ہے، اور جس کا عملی نمونہ اللہ کے رسول نے پیش کیا تھا، آج بھی جو لوگ رشتوں کے سلسلے میں خاندانی اونچ نیچ کا تصور رکھتے ہیں، وہ رشتوں کے دوام واستقرار کا حوالہ دے کر اپنی بات کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم اگر یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت زید کی حضرت زینب سے شادی خاندانی اونچ نیچ کے خلاف ایک عملی اقدام تھا، تو ہمیں یہ ماننا چاہئے کہ اس رشتے کے ختم ہو جانے کا سبب دونوں کے بیچ خاندانی فرق نہیں رہا ہوگا۔

چوتھی رائے

مولانا امین احسن اصلاحی نے اس طلاق کی ایک اور وجہ تک پہنچنے کی ہے، وہ یہ کہ مدینے کے منافقوں نے ان کے نکاح کے خلاف ہنگامہ کر کے حضرت زینب کو بھڑکانے کی کوشش کی، اس فتنے کے نتیجے میں حضرت زید کو یہ احساس ہونے لگا کہ یہ شادی حضرت زینب کے لئے خوشی کا باعث نہیں؛ بلکہ اذیت کا سبب بن گئی ہے، اور یہ کہ حضرت زینب کو اس شادی کی وجہ سے روز روز طعنوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس لئے خود حضرت زینب کو پریشانی سے نکالنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ان کو طلاق دے دی جائے۔

مولانا کے الفاظ میں :

نکاح کے بعد منافقین اور منافقات نے فتنہ اُٹھایا کہ محمد (ﷺ) نے ایک معزز گھرانے کی ایک شریف خاتون کا دامن اپنے ایک آزاد کردہ غلام کے ساتھ باندھ دیا ہے، اس قسم کی معاشرتی اصلاحات کو عوام کا ذہن آسانی سے قبول نہیں کرتا، اس وجہ سے اس نکاح کے خلاف ایک مخالفانہ فضا پیدا ہوگئی، خاص طور پر منافقات نے حضرت زینب کو ورغلانے کی پوری کوشش کی، ان کو غیرت دلائی کہ یہ سخت ظلم ہے کہ ان کو ایک ایسے شخص کے حبالہ عقد میں دے دیا گیا ہے جو ابھی کل تک ایک زرخرید غلام تھا۔(۱)

مزید لکھتے ہیں :

واتق اللہ کے الفاظ سے یہ بات خود نکلتی ہے کہ حضور نے حضرت زید کے ارادہ طلاق کو محض ان کے شدت احساس پر محمول فرمایا، کوئی معقول وجہ اس اقدام کے لئے آپ نے نہیں پائی، او پر گزر چکا ہے کہ جب آپ نے ان سے یہ سوال فرمایا کہ کیا زینب کی طرف سے کوئی ایسی بات تمہارے سامنے آئی ہے جو شک پیدا کرنے کا موجب ہوئی ہے، تو انھوں نے صاف کہا کہ اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے، ان کو اگر کوئی شکایت تھی تو خود ان کے الفاظ میں بس یہ تھی کہ وہ میرے مقابل میں اپنے شرف خاندانی کے باعث تفوق کا احساس رکھتی ہیں، ظاہر ہے کہ مجرد یہ بات بیوی کو طلاق دینے کے لئے کافی نہیں ہے، اس میں حضرت زینب کے رویہ سے زیادہ خود حضرت زید کے شدت احساس کو دخل ہوسکتا ہے، بالخصوص اس فضا میں جو اس وقت منافقین ومنافقات نے پیدا کردی تھی، اس وجہ سے حضور نے ان کو خوف خدا یاد دلایا کہ وہ اس معاملہ میں جذبات سے مغلوب ہوکر کوئی قدم نہ اُٹھائیں بلکہ اللہ سے ڈریں؛ لیکن حضرت زید مخالفین کے اُٹھائے ہوئے طوفان سے متاثر ہوگئے اور اس تاثر میں زیادہ دخل ان کی شرافت اور حضرت زینب کے جذبات کے لحاظ کو تھا، انھوں نے محسوس فرمایا کہ میرے سبب سے حضرت زینب ہدف مطاعن بنی ہوئی ہیں، اس کا علاج یہی ہے کہ طلاق دے کر ان کو نکتہ چینوں کی زبان درازیوں سے نجات دلائی جائے۔(۲)

(۱) تدبر قرآن: ۴/ ۲۲۸۔ (۲) تدبر قرآن: ۴/ ۲۳۴۔

اس رائے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اللہ کے رسول، حضرت زینب اور حضرت زید تینوں کے بلند کردار کا خیال رکھا گیا ہے۔

پانچویں رائے

ایک رائے یہ بھی ہے کہ حضرت زید سے جب حضرت زینب نے شادی کی، اس وقت حضرت زید کی حیثیت اللہ کے رسول کے متبنیٰ کی تھی، متبنیٰ کے سلسلے میں ابھی شریعت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس لئے وہ اللہ کے رسول کے بیٹے کی طرح جانے جاتے تھے، یعنی حضرت زینب کی حیثیت اللہ کے رسول کی بہو کی تھی، اور روئے زمین پر وہ تنہا اللہ کے رسول کی بہو تھیں، یہ چیز ان کے لئے بہت بڑے شرف اور عزت کا باعث تھی، اس شرف کے احساس سے معمور ہوکر وہ مخالفت اور طنز وتشنیع کے بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرسکیں؛ لیکن اس کے بعد ان کو ایک بالکل ہی غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑا، سورہ احزاب کی آیت چہارم اور پنجم میں یہ اعلان کیا گیا کہ جن کو تم نے منھ بولا بیٹا بنایا ہے، وہ تمہارے بیٹے نہیں ہیں :

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ، اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۔ (۱)

اور اللہ نے نہیں رکھے کسی مرد کے دو دل اس کے اندر اور نہیں کیا تمہاری بیویوں کو جن کو ماں کہہ بیٹھے ہو، سچی مائیں تمہاری اور نہیں کیا تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے، یہ تمہاری بات ہے اپنے منھ کی اور اللہ کہتا ہے ٹھیک بات اور وہی دکھاتا ہے راہ، پکارو لے پالکوں کو ان کے باپ کی طرف نسبت کرکے یہی پورا انصاف ہے اللہ کے یہاں پھر اگر نہ جانتے ہو ان کے باپ کو تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور رفیق ہیں اور گناہ نہیں تم پر جس چیز میں چوک جاؤ، پر وہ جو دل سے ارادہ کرو اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان۔

---

(۱) الاحزاب: ۴، ۵۔

ان آیتوں میں موجود شریعت کے نئے حکم نے حضرت زید کو تو متاثر کیا ہی ہوگا، ساتھ ہی حضرت زینب کے لئے بھی یہ ایک بڑے صدمے کی بات تھی، وہ اب تک رسول پاک کی بہو تھیں؛ لیکن اب وہ آپ کی بہو نہیں رہی تھیں، اس صدمے نے آپ کو ایک طرح کے ڈپریشن اور اندرونی صدمے سے دوچار کردیا، علامہ ابوزہرہ نے اس کیفیت کو درج ذیل لفظوں میں بیان کیا ہے :

ومحمد صلى الله عليه وسلم كان قد تبنَّى زيد بن حارثة ، وتزوج زيد زينب على أنه ابنه صلى الله عليه وسلم ، فلما ألغي التبني بحكم الإسلام تململت به ، وتململ من كبريائها ، فأراد أن يطلقها ۔ (۱)

آپ ﷺ حضرت زیدؓ کو متبنیٰ بنالیا تھا اور حضرت زید کا نکاح حضرت زینب سے اس بنا پر ہوا کہ وہ آپ کے بیٹے ہیں؛ لیکن جب اسلام کے حکم سے تبنیت ختم کردی گئی تو وہ ڈپریشن کا شکار ہوگئیں اور ان کے تفوق سے حضرت زید ٹینشن میں آگئے اور ان کو دینے کا ارادہ کرلیا۔

اگر ہم منافقوں کی ان ریشہ دوانیوں اور فتنہ پردازیوں کو اپنے سامنے رکھیں، جس کا ذکر مولانا اصلاحی نے کیا ہے، ساتھ ہی حضرت زینب کو پیش آنے والی اس نئی صورت حال کو سوچیں جس کا ذکر علامہ ابوزہرہ نے کیا ہے تو طلاق کی وجہ سمجھنا بہت آسان ہوسکتا ہے۔

یہ بات بہت بنیادی ہے کہ طلاق کا اقدام حضرت زید کی طرف سے ہوا تھا، اور اللہ کی مشیت کے تحت ہوا تھا، اور اس کا ذرا سا بھی مطالبہ حضرت زینب کی طرف سے نہیں ہوا تھا، نہ تو حضرت زینب نے اللہ کے رسول سے کبھی اس نکاح کے سلسلے میں کوئی گلہ کیا، اور نہ ہی حضرت زینب نے کسی اور سے کوئی شکوہ کیا، حضرت زید کو تکلیف پہنچانے والی کوئی بات انھوں نے اپنی زبان سے کہی ہو، اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔

حضرت زینب کا اللہ کے رسول ﷺ سے نکاح اور اس کا پس منظر

اس نکاح کی وجہ تو بہت صاف صاف قرآن مجید نے خود بتادی ہے، اور مفسرین نے بھی عام طور سے اسی کو بیان کیا ہے، امام ابن کثیر نے لکھا ہے :

وقوله : لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا

(۱) زہرۃ التفاسیر: ۱/۲۶۔

قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا أَيْ : إِنَّمَا أَبَحْنَا لَكَ تَزْوِيجَهَا وَفَعَلْنَا ذَٰلِكَ ؛ لِئَلَّا يَبْقَى حَرَجٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ فِي تَزْوِيجِ مُطَلَّقَاتِ الْأَدْعِيَاءِ ، وَذٰلِكَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسلم كَانَ قَبْلَ النُّبُوَّةِ قَدْ تَبَنَّى زَيْدَ بْنَ حَارِثَةَ ، فَكَانَ يُقَالُ لَهُ : ''زَيْدُ بْنُ مُحَمَّدٍ'' فَلَمَّا قَطَعَ اللهُ هٰذِهِ النِّسْبَةَ بِقَوْلِهِ تَعَالىٰ : ''وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللهِ'' ثُمَّ زَادَ ذٰلِكَ بَيَانًا وَتَأْكِيدًا بِوُقُوعِ تَزْوِيجِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِزَيْنَبَ بِنْتِ جَحْشٍ لَمَّا طَلَّقَهَا زَيْدُ بْنُ حَارِثَةَ ۔ (۱)

اللہ کا ارشاد ہے: تا کہ نہ رہے مسلمانوں پر گناہ، نکاح کرلینا اپنے لے پالکوں کی بیویوں سے جب وہ تمام کرلیں ان سے اپنی غرض'' یعنی ہم نے آپ کے لئے ان سے نکاح کرنا جائز قرار دے دیا اور ہم نے اس کو کردیا؛ تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنے لے پالکوں کی مطلقہ سے نکاح کرنے میں کوئی حرج پیدا نہ ہو، وہ اس وجہ سے کہ آپ ﷺ نے نبوت سے قبل حضرت زید بن حارثہ کو متبنّیٰ بنالیا تھا، اسی لئے ان کو زید بن محمد پکارا جانے لگا تھا؛ لیکن جب اللہ نے اپنے اس فرمان کے ذریعہ اس نسبت کو ختم کیا کہ'' اور نہیں کیا تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے، یہ تمہاری بات ہے اپنے منھ کی اور اللہ کہتا ہے ٹھیک بات اور وہی دکھاتا ہے راہ، پکارو لے پالکوں کو ان کے باپ کی طرف نسبت کرکے یہی پورا انصاف ہے، پھر حضرت زینب سے آپ کا نکاح کراکے اس بات کو مزید مؤکد اور واضح کردیا، جب حضرت زید نے ان کو طلاق دے دیا تھا۔

مولانا مودودی لکھتے ہیں :

یہ الفاظ اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام نبی ﷺ سے ایک ایسی ضرورت اور مصلحت کی خاطر کرایا تھا جو اس تدبیر کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۶/۴۲۶۔

پوری نہ ہوسکتی تھی، عرب میں منھ بولے رشتوں کے بارے میں جو غلط رسوم رائج ہوگئی تھیں ان کے توڑنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اللہ کا رسول خود آگے بڑھ کر ان کو توڑ ڈالے؛ لہٰذا یہ نکاح اللہ تعالیٰ نے محض نبی کے گھر میں ایک بیوی کا اضافہ کرنے کی خاطر نہیں؛ بلکہ ایک اہم ضرورت کی خاطر کروایا۔(۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے رسول کے ساتھ حضرت زینب کے نکاح کی جو وجہ قرآن مجید نے بیان کی ہے، اس سے یہ صاف واضح ہوجاتا ہے کہ حضرت زینب کی طلاق کے پیچھے وہ سبب بالکل نہیں تھا، جس کو امام طبری وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

اسی بات کو سید قطب نے بہت زوردار اور واشگاف انداز میں کہا ہے :

وفي هٰذا ما يهدم كل الروايات التي رويت عن هذا الحادث والتي تشبث بها أعداء الإسلام قديما وحديثا ، وصاغوا حولها الأساطير والمفتريات ! إنما كان الأمر كما قال الله تعالىٰ : ''فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِنْها وَطَراً زَوَّجْناكَها ، لِكَيْلا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْواجِ أَدْعِيائِهِمْ إِذا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَراً''... وكانت هٰذه إحدى ضرائب الرسالة الباهظة حملها رسول الله صلّى الله عليه وسلّم فيما حمل وواجه بها المجتمع الكاره لها كل الكراهية ۔ (۲)

اس میں وہ تمام باتیں ہیں جو اس واقعہ سے متعلق ہرزہ سرائیوں کی نقب کشائی کرتی ہیں، جن کو قدیم وجدید دشمنانِ اسلام نے منسوب کیا ہے اور نہ جانے کیا کیا گڑھ لیا، کچھ کہا ہے واقعہ بس وہی ہے جو کلام الٰہی سے ثابت ہے'' تو جب زید اس عورت سے اپنی غرض تمام کرچکا ہم نے اس کو تیرے نکاح میں دے دیا؛ تاکہ نہ رہے مسلمانوں پر گناہ نکاح کرلینا اپنے لے پالکوں کی بیویوں سے جب وہ تمام کرلیں ان سے اپنی غرض'' یہ دوش رسالت پر ڈالا گیا ایک عظیم بوجھ جسے آپ نے اُٹھایا، اس کے لئے معاشرے کے گرم وسرد کو برداشت کیا یہ بھی ہے، (یعنی متبنّیٰ کا معاملہ)۔

---

(۱) تفہیم القرآن: ۴/ ۱۰۲۔

(۲) فی ظلال القرآن: ۵/ ۲۸۶۹۔

حضرت زینب کا عظیم کردار

اس موقعہ پر حضرت زینب کے عظیم کردار کو بھی عام انسانوں کے سامنے لانا ضروری ہے، اعلیٰ انسانی قدروں کی خاطر جدوجہد کرنے والے انسانوں کے لئے حضرت زینب کے کردار میں ہمت ونصیحت کا بڑا سامان ہے، افسوس کہ گھڑی ہوئی روایتوں اور کہانیوں کی کثافت میں وہ روشن کردار چھپ سا گیا۔

انسانی سماج کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جب کوئی معاشرتی برائی پورے انسانی معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہو، اور اس کی جڑیں انتہائی گہری ہو چکی ہوں، تو لوگوں کے دلی جذبات بھی اس سے وابستہ ہو جاتے ہیں، لوگ ان برائیوں کے شدید نقصانات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں؛ لیکن پھر بھی عقیدت ومحبت سے ان برائیوں کو اپنی عزیز تر روایات قرار دے کر سینے سے لگائے رہتے ہیں، ان کو ان برائیوں سے اتنا شدید قسم کا جذباتی لگاؤ ہوتا ہے کہ وعظ ونصیحت ان پر اثر انداز نہیں ہوتے، وہ ان غلط روایتوں کے ضرر رساں ہونے کے قائل ہو جاتے ہیں، پھر بھی ان بتوں کو توڑنے کی جرأت نہیں کر پاتے؛ کیوں کہ اس کے لئے معاشرے کی ریت کے خلاف قدم اُٹھانا پڑتا ہے، اور اس کی ہمت اچھے اچھے بہادر نہیں کر پاتے، لوگ کیا کہیں گے؟ یہ سوچ کر بڑے بڑے سورماؤں کے حوصلے جواب دے جاتے ہیں، ایسے میں اگر کوئی جواں مرد آگے بڑھ کر کسی بت کو توڑ دے تو پھر بت شکنی کا سلسلہ شروع ہونے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں، ایک مصلح کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہی ہوتا ہے کہ یا تو وہ خود روایت شکنی کے لئے آگے آئے، یا پھر اس کے لئے کچھ جیالوں کو تیار کرے۔

اللہ کے رسول ﷺ کا امتیاز یہ بھی ہے کہ مختلف برائیوں کو ختم کرنے کے لئے خود سب سے پہلے آگے بڑھے، اور جہاں ضرورت پڑی اپنے خاندان کو بھی آگے بڑھایا، خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر اللہ کے رسول نے اس کی شاندار مثال پیش کی، آپ نے جاہلیت کی ہر چیز کے ختم کرنے کا اعلان فرمایا، اور سب سے پہلے اپنے خاندان کے ایک خون اور اپنے ہی خاندان کے سود سے دست بردار ہونے کا اعلان کیا:

أَلَاكُلُّ شَيْءٍ مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَيَّ مَوْضُوعٌ ، وَدِمَاءُ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعَةٌ ، وَإِنَّ أَوَّلَ دَمٍ أَضَعُ مِنْ دِمَائِنَا دَمُ ابْنِ رَبِيعَةَ بْنِ الْحَارِثِ ، كَانَ مُسْتَرْضِعًا فِي بَنِي سَعْدٍ فَقَتَلَتْهُ هُذَيْلٌ ، وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ ، وَ أَوَّلُ رِبًا أَضَعُ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ ، فَإِنَّهُ مَوْضُوعٌ كُلُّه ۔ (۱)

(۱) صحیح مسلم: ۸۸۹/۲۔

آگاہ ہوجاؤ! جاہلیت کی ہر چیز میرے قدموں تلے روندی گئی ہے، جاہلیت کا خون ہدرقرار دے دیا گیا ہے اور اپنے خونوں میں سے میں ابن ربیعہ بن حارث کا خون سب سے پہلے ہدرقرار دیتا ہوں، جوکہ بنوسعید میں شیر خوار بچہ تھا، جس کو ہذیل نے قتل کردیا تھا اور جاہلیت کا سود ختم کردیا گیا، ہمارے سود میں سے میں سب سے پہلے عباس بن عبدالمطلب کے سود کو ختم کرتا ہوں وہ سب کا سب ختم کردیا گیا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ اس وقت کے معاشرے کی بہت ساری پرانی اور جڑ پکڑ چکی برائیوں اور غلط روایات کے خلاف آپ نے اعلان جنگ کردیا تھا، اور اس کام کے لئے آپ کو عملی نمونے پیش کرنے تھے، عملی اقدام بے حد پرخطر اور بڑا جان گسل ہوتا ہے، آپ نے اس کے لئے سب سے پہلے اپنی ذات کو پیش کیا، اور جہاں ضرورت پڑی اپنے اہل خانہ کو آگے بڑھایا، اللہ کے رسول، حضرت زید اور حضرت زینب کی مشترکہ داستان عزیمت کو بھی اس حوالے سے یاد کیا جانا چاہئے۔

اس وقت کے معاشرے میں ایک بہت بڑا مسئلہ اونچ نیچ کا تھا، غلامی خود ایک مسئلہ تھی؛ لیکن اس سے بھی زیادہ سنگین مسئلہ یہ تھا کہ اگر کوئی غلام آزاد کردیا جاتا تو اسے معاشرہ قبول نہیں کرتا تھا، اور اسے ایک معزز انسان کا مقام نہیں دیا جاتا تھا، غلاموں کو آزاد کرنے کی مہم تو اللہ کے رسول نے دور مکی کے ابتدائی دنوں سے ہی چھیڑ دی تھی، انسانوں کو آزاد دیکھنے کی خواہش آپ کی فطرت میں اس طرح رچی بسی تھی کہ نبوت سے پہلے ہی حضرت زید کو جو آپ کے حصے میں بطور غلام آئے، ان کو آزاد کرکے اپنا بیٹا بنالیا، اُم ایمن جو آپ کو بطور باندی وراثت میں ملی تھیں، ان کو بھی آزاد کردیا۔

آپ کی ترغیب کی وجہ سے غلاموں کو آزاد کرنے کا سلسلہ زور وشور سے جاری تھا، تاہم آپ کے سامنے بہت بڑا چیلنج آزاد کردہ غلاموں کو معاشرے میں برابری اور عزت کا مقام دلانا تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ ایک معزز خاندان کی آزاد خاتون کا نکاح ایک آزاد کردہ غلام سے کیا جائے، اور دنیا اپنی آنکھوں سے ایسا ہوتے ہوئے دیکھے، اس زمانے میں ایک معزز خاندان کی آزاد عورت سے نکاح کی جرأت کوئی آزاد کردہ غلام بھی نہیں کرسکتا تھا، اور اتنا بڑا جگر کسی خاتون کے پاس ہونا بھی مشکل تھا کہ وہ کسی آزاد کردہ غلام کی شریک حیات بننے پر آمادہ ہوسکے، اللہ کے رسول نے ایک طرف تو اس کار عظیم کے لئے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید کو تیار کیا، اور دوسری طرف اس دشوارترین مہم کے لئے آپ کی مردم شناس نگاہ انتخاب اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب پر پڑی اور آپ نے ان کو آمادہ کیا، اللہ کے رسول کی ترغیب پر دونوں تیار ہوگئے، اور اس طرح دونوں نے مل کر اس بارگراں کو اُٹھالیا، یہ کام اگر حضرت زینبؓ کے لئے دشوار تھا، تو خود حضرت زیدؓ کے لئے آسان نہیں تھا؛ کیوں کہ حالات کا مقابلہ

اور معاشرے کے ردعمل کا سامنا دونوں کومل کر کرنا تھا، اور دونوں نے کیا، معاشرے کی اس برائی کے خلاف اس زبردست جنگی اقدام کو ناکام بنانے کے لئے منافق مرد اور عورتوں نے محاذ بنالیا، اور حضرت زینب پر طعن وتشنیع کی بارش شروع کردی، اللہ کے رسول اور حضرت زید کے خلاف پروپیگنڈہ خوب خوب کیا گیا، منافق عورتوں نے خاص طور سے حضرت زینب کے حوصلوں کو پست کرنے اور ان کے مورال کو گرانے کے لاکھ جتن کئے؛ لیکن وہ ڈٹی رہیں، یہ عظیم مہم کامیاب ہوئی، خاندانی اونچ نیچ اور انسانوں کے بیچ بھید بھاؤ کا یہ بڑا بت پاش پاش ہوا، اور آزاد کردہ غلاموں سے آزاد اور معزز گھرانوں کی خواتین کے نکاح کا سلسلہ چل پڑا۔

حضرت زینب کا کردار اس مہم میں بہت عظیم تھا، خاندان قریش کی ایک معزز اور خوبصورت خاتون نے جس طرح خود کو ایک بڑی قربانی کے لئے پیش کیا، وہ انسانی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، آزادی اور مساوات کی قدر کرنے والوں کو اسے یاد رکھنا چاہئے، اس کو فراموش کرنا انسانیت کی ایک عظیم محسنہ کو فراموش کرنا ہوگا، اور سراسر انسانی قدروں کے احترام کے منافی ہوگا۔

بڑے ظلم اور ناانصافی کی بات ہوگی، اگر ہم اس عظیم خاتون کے بارے میں جو اونچ نیچ کے بت کو توڑنے کے لئے سب سے پہلے آگے بڑھیں، اور صبر وعزیمت کے ساتھ اس راہ میں شدید ضربیں سہیں، یہ کہیں کہ وہ خاندانی اونچ نیچ کے جاہلانہ تصورات سے آزاد نہیں ہوسکی تھیں، اور وہ اپنے شوہر پر اپنے بڑکپن کا اظہار کرتی تھیں اور وہ بدزبانی اور تحقیر کا رویہ اختیار کرتی تھیں، وہ تو اپنے شوہر کے ساتھ اتنی اچھی تھیں کہ خود حضرت زید کا بیان ہے:

''ما رأیت فیها الا خیرا'' (میں نے تو ان میں خیر ہی خیر پایا)۔

اس مہم کے دوران حضرت زید اور حضرت زینب کو ایک اور آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، اللہ کی طرف سے ہدایت آگئی، کہ منھ بولا بیٹا دراصل بیٹا نہیں ہوتا ہے، اس حکم سے سب سے زیادہ اگر کوئی متاثر ہوسکتا تھا، تو وہ حضرت زید اور اور حضرت زینب کی ذات تھی، منھ بولے بیٹے تو اس معاشرے میں اور بھی رہے ہوں گے؛ لیکن حضرت زید کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کے منھ بولے بیٹے تھے، اور حضرت زینب کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ اللہ کے رسول کی بہو تھیں، خود اللہ کے رسول کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، اور اس پہلو سے حضرت زید سے متبنیٰ والا تعلق آپ کے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا؛ تاہم اللہ کے حکم کے سامنے تینوں نے برضا ورغبت سر تسلیم خم کیا، اور عزیمت کا ایک اور مرحلہ طے ہوا۔

اس کے بعد ایک اور بہت ہی سخت امتحان سامنے آیا، ہوا یہ کہ اللہ کی طرف سے متبنیٰ کے سلسلے میں شرعی حکم کی تکمیل کا فیصلہ ہوا اور وہ یہ کہ جب متبنیٰ کی حیثیت بیٹے کی نہیں ہے، تو اس کی مطلقہ بیوی سے خود شادی کرنا بھی درست ہونا چاہئے، متبنیٰ کو نظریاتی طور پر بیٹا نہیں ماننا تو آسان تھا؛ لیکن اس کا یہ عملی مظہر قبول کرنا طبیعتوں

کے لئے بے حد دشوار تھا، خاص طور سے جب پورے معاشرے میں لوگ متبنیٰ کی بیوی کو بیٹے کی بیوی کی طرح حقیقی بہو سمجھتے آئے ہوں، ایسے میں بھلا کون مرد ایسی جرأت کا مظاہرہ کرکے معاشرے کی تنقیدوں کا مقابلہ کرسکتا تھا۔

اس سلسلے میں عملی اقدام زبردست قربانی اور غیر معمولی بہادری چاہتا تھا اور اس کے لئے بھی ایک نہایت جری خاتون کو جو کسی متبنیٰ کی چھوڑی ہوئی ہو سامنے آنا ضروری تھا، اور کسی بہت جری مرد کو جس نے ایسے متبنیٰ کو منھ بولا بیٹا بنایا ہو آگے آنا لازم تھا، اور یہ بھی ضروری تھا کہ یہ اقدام وہ کرے جس کا عمل لوگوں کے لئے نمونے کی حیثیت رکھتا ہو، یہ اتنا خطرناک اور دشوار اقدام تھا کہ سوچ کر ہی اوسان خطا ہونے لگتے ہیں، مخالفوں کی طرف سے یہ طعنہ کہ اپنی بہو سے نکاح کرلیا، کیسا دل کو چھید دینے والا اور روح کو مجروح کردینے والا تیر ہوسکتا تھا، شادی کرنے والے مرد کے لئے بھی اور شادی کرنے والی عورت کے لئے بھی۔

اللہ پاک نے اس بارگراں کو اُٹھانے کے لئے اپنے پیارے نبی کو اور اپنی پیاری بندی حضرت زینب کو منتخب کیا، جو اس سے پہلے کی آزمائش میں ثابت قدمی کے ساتھ کامیاب ہوچکی تھیں، اس نئی آزمائش میں حضرت زید بھی شامل رہے، اللہ پاک نے حضرت زید کے دل میں یہ بات ڈالی کی وہ حضرت زینب کو طلاق دیں، اور پھر اللہ کے رسول کو حکم دیا کہ وہ حضرت زینب سے شادی کرلیں، کتنا مشکل کام تھا، حضرت زید کے لئے حضرت زینب کو چھوڑنا، اور کتنا مشکل کام تھا اللہ کے رسول کے لئے اور حضرت زینب کے لئے یہ شادی کرنا، صورت حال کتنی مشکل اور نازک تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ پاک نے اس کام کو اپنی خاص نگرانی اور سرپرستی میں انجام دلایا: ''زوجنا کھا'' ایک چھوٹا سا جملہ ہے؛ لیکن اس کے اندر اللہ کی طرف سے مکمل اور خصوصی سرپرستی کا بے مثال تذکرہ پنہاں ہے، متعلقہ آیات کے پورے سیاق کو دیکھیں، کس طرح اللہ پاک نے خاص اس مقام پر نبی ﷺ کے مقام کی عظمت اور سیرت کی پاکیزگی کا دیر تک چرچا کیا ہے، اور اپنے پیارے رسول کو ''دع اذاھم'' کی تلقین کی ہے، منافقوں کی نکتہ چینیوں اور مخالفوں کی زبان درازیوں کے باوجود اللہ کی تائید ونصرت سے یہ مہم بھی کامیابی سے ہم کنار ہوئی، اللہ کے رسول کے ساتھ ساتھ حضرت زینب کی ہمت واستقامت کا ایک اور روشن باب مکمل ہوا، مخالفتوں کے طوفان اُٹھے، طنز وتشنیع کے سیلاب آئے، مگر اللہ کے رسول اور حضرت زینب کی ثبات قدمی کے سامنے کچھ نہیں ٹھہر سکا۔

ان آزمائشوں کے درمیان منافقوں نے ایک اور فتنہ انگیز شوشہ چھوڑا، انھوں نے ایک کہانی بنائی کہ نعوذ باللہ، اللہ کے رسول کو حضرت زینب سے عشق ہوگیا تھا، اور اسی وجہ سے آپ نے حضرت زینب اور حضرت زید کے نکاح کو ختم کرکے خود حضرت زینب سے نکاح کرلیا، اس سلسلے میں انھوں نے من گھڑت باتیں پھیلانا شروع کیں، یہ اللہ کے رسول اور خود حضرت زینب کے لئے بہت سخت آزمائش تھی؛ لیکن اللہ نے اس میں بھی انھیں سرخ رو رکھا، اور یہ فتنہ

بھی اللہ کے رسول اور حضرت زینب کے بلند کردار اور پاک سیرت کو ذرا داغ دار نہیں کر سکا اور دیکھتے دیکھتے سارا طوفان جھاگ کی طرح بیٹھ گیا، حضرت زینب اللہ کے رسول کی ازواج مطہرات میں شامل ہوئیں اور اس شان کے ساتھ شامل ہوئیں کہ تمام ازواج مطہرات کے لئے باعث رشک بن گئیں ''زوجنا کہا'' کا اعزاز رہتی دنیا تک کے لئے ان کا خصوصی امتیاز بن گیا، عز وشرف کا یہ شاندار تاج ان کے سر سے کوئی نہیں اُتار سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت کی عملی تطبیق کی خاطر اور غیر اسلامی روایتوں کے خلاف عملی محاذ آرائی کی راہ میں حضرت زینب کی قربانیوں کی کوئی نظیر اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔

افسوس صد افسوس حضرت زینب کا حقیقی کردار ہمارے سامنے صحیح طور سے نہیں آسکا، اس کے بجائے اسلام کے دشمنوں کی گھڑی ہوئی کہانیاں دوسری بہت ساری نامناسب اور نازیبا باتوں کی طرح ہماری روایتوں کے ذخیرے میں داخل ہوگئیں، اور دیکھتے دیکھتے مفسرین کے یہاں رواج پا گئیں، افسوس کہ جس جھوٹ کو سنے بغیر سختی سے رد کر دینا چاہئے تھا، وہ ہماری اہم ترین تفسیروں میں جگہ پا گیا۔

غیر معتبر بلکہ یکسر گھڑی ہوئی روایتوں میں اُلجھ جانے کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ حضرت زینب کا عظیم کردار نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، حضرت زینب نے معاشرے کی غلط روایتوں کے خلاف اس معرکے کی قیادت کی جو کسی بھی طرح بدر و احد کی جنگوں سے کم درجے کا نہیں تھا؛ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بسا اوقات تیغ وسناں والی جنگوں سے زیادہ مشکل اور خطرناک جنگ معاشرے کی برائیوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ ہوتی ہے، اس جنگ میں جو زخم لگتے ہیں، وہ نیزوں اور تلواروں کے زخموں سے کہیں گہرے ہوتے ہیں، آفریں صد آفریں اس بہادر اور جرأت مند خاتون کے لئے جس نے اس سنگلاخ اور پر خطر میدان میں فتوحات کی شاندار تاریخ رقم کی۔

درحقیقت عصر حاضر میں ہی نہیں؛ بلکہ عہد رسالت سے قیامت تک اسلام سے محبت کرنے والے مرد وخواتین کے لئے حضرت زینبؓ کے کردار میں بڑا سبق پنہاں ہے۔

• • •

حضرت عائشہؓ سے کم سنی کے باوجود رسول اکرم ﷺ کا نکاح

مولانا اشرف عباس قاسمی ◆

اُم المومنین صدیقۂ کائنات، حضرت عائشہ بنت ابی ابوبکر الصدیق، رضی اللہ عنہما و أرضاہما، ان پاکباز اور ستودہ صفات خواتین میں سے ہیں، جنھوں نے محبوب رب العالمین ﷺ کے فیض صحبت سے مالا مال ہوکر علم وفضل اور معرفت ودانش مندی کے وہ گہر لٹائے ہیں، جس کی ہمسری دنیا کی کوئی خاتون نہیں کرسکتی، اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں آیات نازل فرما کر آپ کے ذکر کو خلود عطا کردیا اور آپ کی عفت کے ایقان کو جزءِ ایمان بنادیا، زہد وورع اور دنیا سے بے رغبتی میں بھی اپنی مثال آپ تھیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ پاک نے جس طرح سرور دو عالم ﷺ کا نبوت ورسالت کے لئے انتخاب فرمایا تھا، اسی طرح آپ کی زوجیت ومصاحبت کے لئے بھی اعلیٰ صفات کی حامل ازواج مطہرات کو منتخب فرمالیا تھا؛ جن میں گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے حضرت عائشہؓ کو ایک خاص مقام اور امتیاز حاصل ہے۔

تعارف

آپ اُم المومنین، اُم عبداللہ، عائشہ بنت ابی بکر صدیق، رسول اکرم ﷺ کی زوجۂ مطہرہ اور اُمت کی سب سے بڑی خاتون فقیہ ہیں، آپ کی والدہ: اُم رومان بنت عامر ہیں آپ نے براہ راست رسول اکرم ﷺ کے علم کا ایک بڑا ذخیرہ نقل کیا، اپنے والد ابوبکر نیز عمر، فاطمہ، سعد، حمزہ بن عمرو اسلمی اور جذامہ بنت وہب سے آپ نے حدیث روایت کی ہے۔(۱)

◆ استاذ: دارالعلوم دیوبند، یوپی۔

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۲/۱۳۵۔

علم وفضل اور حدیث وفقہ میں امتیاز

ابن شہاب زہری فرماتے ہیں :

لو جمع علم عائشة إلى علم جميع النساء ، لكان علم عائشة أفضل ۔(۱)

حضرت عائشہ کے علم کا، جملہ خواتین کے علم سے تقابل کیا جائے تو عائشہؓ کا علم سب سے بڑھا ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی ذہانت وذکاوت اور سرعتِ حفظ کی دولت سے نوازا تھا، ابن کثیر فرماتے ہیں :

لم يكن في الأمم مثل عائشة في حفظها وعلمها وفصاحتها وعقلها ۔

سابقہ اُمتوں میں بھی حضرت عائشہ کی طرح حفظ وضبط،علم وفصاحت اور عقل میں کوئی خاتون نہیں تھی۔

عروہ بن زبیر کہتے ہیں :

ما رأيت أحدا أعلم بفقه ولا بطب ولا بشعر من عائشة ۔

فقہ میں،طب میں اور شعر میں حضرت عائشہ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔

حافظ ذہبی کہتے ہیں :

افقه نساء الامة على الاطلاق ، ولا أعلم في أمة محمد ، بل ولا في النساء مطلقاً امرأةً أعلم منها۔

اُمت کی خواتین میں بلاکسی استثناء کے سب سے بڑی فقیہ ہیں اور اس اُمت بلکہ دنیا جہاں کی خواتین میں مجھے ایسی خاتون نظر نہیں آتی، جو علم وفضل میں آپ سے بڑھی ہوئی ہو۔

آپ نے جو احادیث روایت کی ہیں ان کی تعداد حافظ ذہبی کے بہ قول دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) ہے، جن میں سے ایک سو ستر احادیث کی تخریج امام بخاری ومسلم نے مشترکہ طور پر کر رکھی ہے، جب کہ ۵۴ میں بخاری اور ۶۹ میں مسلم منفرد ہیں،(۲) اس حساب سے بخاری میں آپ کی دو سو اٹھائیس اور مسلم میں دو سو بتیس روایتیں ہیں۔

---

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۲/۱۴۱۔ (۲) سیر أعلام النبلاء: ۲/۱۳۹۔

زہدوعبادت

حضرت عائشہؓ کوعبادت سے بھی بڑا شغف تھا، اس کثرت سے روزے رکھتیں تھیں کہ آپ پر ضعف طاری ہوگیا تھا، زہداور دنیا سے بے رغبتی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عروہؓ کے بہ قول ایک بار آپ نے ستر ہزار دراہم صدقہ کردیئے؛ حالاں کہ آپ کے کپڑے پر پیوند لگے ہوئے تھے،اُم ذرہ کہتی ہیں :

عبداللہ بن زبیر نے حضرت عائشہ کے پاس دوتھیلوں میں تقریباًایک لاکھ دراہم بھیجے؛ لیکن شام ہوتے ہوتے اس طرح انھیں تقسیم کردیا کہ ایک درہم بھی نہیں بچ سکا کہ جس سے اس دن کے افطار کانظم ہو پاتا۔(۱)

رسول اکرمﷺ کی زوجیت میں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی قسمت کا ستارہ اس وقت اُوج ثریا پر پہنچ گیا، جب وہ دنیا کے سب سے پاکباز انسان، محسن انسانیتﷺ سے منسوب ہوئیں، رسول اکرمﷺ کا سب سے پہلا نکاح حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا، بہ وقت نکاح آپ کی عمر ۲۵ اور حضرت خدیجہ کی ۴۰ برس کی تھی، حضرت خدیجہؓ نہایت غمگسار اور اطاعت شعار بیوی تھیں، ہجرت سے تین سال قبل نبوت کے دسویں سال حضرت خدیجہ کی وفات سے آپ کو بڑا رنج ہوا، جانثار صحابہ نے اس کیفیت کومحسوس کرکے آپ کو نکاح ثانی کا مشورہ دیا؛ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعونؓ کی اہلیہ حضرت خولہ بنت حکیم نے آپ کے پاس آکر عرض کیا کہ آپ دوسرا نکاح کرلیں، آپ نے فرمایا: کس سے؟ خولہ نے کہا: بیوہ اور کنواری دونوں طرح کی لڑکیاں موجود ہیں، جس کو پسند فرمائیں اس کے متعلق گفتگو کی جائے، فرمایا: وہ کون ہیں؟ خولہؓ نے کہا: بیوہ تو سودہ بنت زمعہ ہیں اور کنواری ابوبکر کی لڑکی عائشہ، ارشاد ہوا: بہتر ہے تم اس کی نسبت گفتگو کرو۔

حضرت خولہؓ رسول اکرمﷺ کی مرضی پاکر حضرت ابوبکرؓ کے گھر آئیں اور ان سے تذکرہ کیا، جاہلیت میں دستور تھا کہ جس طرح سگے بھائیوں کی اولاد سے نکاح جائز نہیں، عرب اپنے منھ بولے بھائیوں کی اولاد سے بھی شادی نہیں کرتے تھے، اس بناء پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا: عائشہ تو آنحضرتﷺ کی بھتیجی ہے، آپ سے نکاح کیوں کر ہوسکتا ہے؟ حضرت خولہ نے آکر آنحضرتﷺ سے استفسار کیا، آپ نے فرمایا: ابوبکر میرے دینی بھائی ہیں اور اس قسم کے بھائیوں کی اولاد سے نکاح جائز ہے، حضرت ابوبکرؓ کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے قبول کرلیا۔

---

(۱) سیر اعلام النبلاء: ۳/ ۴۵۹۔

لیکن اس سے پہلے حضرت عائشہؓ جبیر بن مطعم کے بیٹے سے منسوب ہو چکی تھیں، اس لئے ان سے بھی پوچھنا ضروری تھا، حضرت ابوبکرؓ نے جبیر سے جا کر پوچھا کہ تم نے عائشہ کی نسبت اپنے بیٹے سے کی تھی، اب کیا کہتے ہو؟ جبیر نے اپنی بیوی سے پوچھا، جبیر کا خاندان ابھی اسلام سے آشنا نہیں ہوا تھا، اس کی بیوی نے کہا: اگر یہ لڑکی ہمارے گھر آ گئی تو ہمارا بچہ بددین ہو جائے گا، ہم کو یہ بات منظور نہیں۔(۱)

احادیث میں آیا ہے کہ نکاح سے پہلے آنحضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ ایک فرشتہ ریشم کے کپڑے میں لپیٹ کر آپ کے سامنے کوئی چیز پیش کر رہا ہے، پوچھا کیا ہے؟ جواب دیا کہ آپ کی بیوی ہیں، آپ نے کھول کر دیکھا تو حضرت عائشہؓ تھیں :

عن عائشة قالت : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : اريتک فی المنام مرتين ، اذا رجل يحملک فی سرقة حرير ، فيقول : هذه امرأتک ، فاكشفها ، فاذا هی انتِ ، فاقول : ان يكن هذا من عند الله يمضه ۔ (۲)

نکاح اور رخصتی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر

مشہور اور محقق قول یہی ہے کہ بہ وقت نکاح حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی اور بہ وقت رخصتی نو سال کی تھی۔(۳)

اگرچہ بعض حضرات نے اس قول کی تغلیط کی ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بہ وقت نکاح ۱۶ سال اور بہ وقت رخصتی ۱۸ سال کی تھیں، ہمارے دیار میں اس قول کے قائلین میں سر فہرست مولانا محمد علی اور مولانا حبیب الرحمٰن کاندھلوی صاحبان ہیں، مؤخر الذکر کا اس موضوع پر ''تحقیق عمر صدیقۂ کائنات'' کے نام سے مستقل رسالہ ہے؛ لیکن یہ قول غیر محقق اور نا قابل اعتناء ہے، اس کی متعدد وجوہ ہیں :

(۱) صحیحین کی احادیث اس بات پر متفق ہیں کہ بہ وقت رخصتی حضرت عائشہ ۹ سال کی تھیں۔

(۲) حضرت عائشہؓ نے خود ہی اپنی شادی کا واقعہ نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ :

إنها زفت إليه وهی بنت تسع سنين ولعبها معها ، ومات عنها وهی بنت ثمان عشرة ۔ (۴)

---

(۱) مسند احمد: ۶/۲۱۱، سیرت عائشہ: ۲۴۔
(۲) صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۵۰۷۸۔
(۳) بخاری، باب تزويج النبی عائشة وقدومها المدينة وبنائها بها: ۳۸۹۴۔
(۴) صحیح مسلم، حدیث: ۱۴۲۲۔

رُخصتی کے وقت ان کی عمر ۹ رسال تھی اور ان کی گڑیا ان کے ساتھ تھی اور جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا، اس وقت ان کی عمر ۱۸ رسال تھی۔

اور ظاہر ہے کہ خود صاحب واقعہ کی تصریح کو محض کمزور بنیادوں پر رد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور حضرت عائشہؓ جیسی قوت حفظ وفہم میں ممتاز راویہ کا خود اپنی عمر کے متعلق ایسی غلطی ہونا کہ اپنی گیارہ برس کی عمر کو چھ برس کی اور سولہ برس کی عمر کو نو برس کی اور اپنی پچیس برس کی بیوگی کو اٹھارہ برس کی عمر کی بیوگی کہہ دے، اعجوبۂ روزگار ہے۔

(۳) جو حضرات اٹھارہ سال کے قائل ہیں ان کے بہ قول حضرت عائشہؓ کی پیدائش چار سال قبل بعثت ہوتی ہے؛ حالاں کہ یہ قول محققین کی تصریح کے بالکل خلاف ہے؛ چنانچہ ذہبی کہتے ہیں: ''عائشة ممن ولدت في الإسلام'' اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ''وولدت يعني عائشة بعد المبعث بأربع سنين أو خمس سنين''۔(۱)

(۴) کتب سیرت میں وضاحت ہے کہ حضرت عائشہؓ کا انتقال ۵۷ھ میں بہ عمر تریسٹھ سال ہوا ہے اور یہ اس وقت درست ہوگا جب کہ بہ وقت ہجرت حضرت عائشہ کی عمر ۸ سال تسلیم کی جائے۔

(۵) ہشام پر طعن کرنے کے بجائے مسئلے پر اس پہلو سے غور کریں کہ حضرت عائشہؓ جس وقت رخصت ہوکر میکے لائی جاتی ہیں تو وہ جھولے پر سے اور کھیل سے اُٹھا کر لائی جاتی ہیں، ان کی ماں ان کا منھ دھوتی ہیں، بال برابر کر دیتی ہیں، چھوٹی سہیلیاں ساتھ ہوتی ہیں، یہاں آ کر بھی گڑیوں سے کھیلنے کا شوق باقی رہتا ہے اور یہ تمام واقعات احادیث میں بالتفصیل مذکور ہیں، سوال یہ ہے کہ آیا یہ ایک نو برس کی کم سن لڑکی کا حلیہ ہے یا سولہ برس کی پوری جوان عورت کا؟(۲) بہر حال دلائل سے یہ بات متحقق ہے کہ بہ وقت نکاح حضرت عائشہؓ کی عمر ۶ سال اور بہ وقت رخصتی ۹ سال تھی۔

مستشرقین کا اعتراض

اس پر مستشرقین اور متجددین کو سخت اعتراض ہے کہ ایک نو سالہ لڑکی کیسے کسی مرد کے قابل ہوسکتی ہے؟ اور وہ بھی جن کی عمر پچاس سے متجاوز ہو؟

نکاح بہ امر الٰہی تھا

اس کا سیدھا اور آسان جواب یہ ہے کہ یہ نکاح رسول اکرم ﷺ نے بہ امر الٰہی فرمایا تھا — جیسا کہ

(۱) الاصابۃ: ۸/۲۳۱۔ (۲) مسند طیالسی: ۲۰۵، دارمی: ۲۹۲، سیرت عائشہ: ۳۱۹۔

روایت میں تصریح گزر چکی ہے کہ خواب میں آپ ﷺ کو اس نکاح کی بابت بتلا دیا گیا تھا اور آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا تھا: ''إن یکن من عند اللہ یمضہ''۔

لیکن ظاہر ہے کہ آج کی مادہ پرست، دین بیزار دنیا کو اس جواب سے قناعت اور تسلی نہیں ہو سکتی، تو آیئے ہم اس کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں۔

اس عمر میں نکاح کا رواج تھا

دراصل نکاح ایک معاشرتی عمل ہے؛ بلکہ معاشرتی ضرورت ہے، اس لئے نکاح میں ہر جگہ کے معاشرے، وہاں کی تہذیب اور عرف و عادت کو بڑا دخل ہوتا ہے، اس تناظر میں ہمیں نظر آتا ہے کہ حضرت عائشہؓ جس معاشرے کا حصہ ہیں، اس میں کم سنی میں نکاح قطعاً معیوب نہیں؛ بلکہ متعارف اور رائج ہے۔

(۱) حضرت قدامہ بن مظعونؓ نے حضرت زبیرؓ کی نو مولود لڑکی سے اسی دن نکاح پڑھا دیا، جس دن وہ پیدا ہوئی۔(۱)

(۲) خود آنحضرت ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ کے کم سن لڑکے سلم کا نکاح حضرت حمزہؓ کی نابالغ لڑکی سے کیا تھا، (۲) بلکہ ترکمانی فرماتے ہیں: ''و زوج غیر واحد من الصحابۃ ابنتہ الصغیرۃ''۔(۳)

بلکہ نو، دس سال کی عمر اس زمانے اور اس معاشرے میں وہ عمر تھی، جس میں میاں بیوی کے تعلقات قائم ہو سکتے تھے؛ چنانچہ بخاری شریف میں حسن ابن صالح کا قول نقل کیا گیا ہے :

أدرکت جارۃً لنا جدۃً بنت احدی وعشرین سنۃ ۔ (۴)

ہمارے پڑوس میں ایک خاتون تھیں جو اکیس سال کی عمر میں دادی بن گئی تھی۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس جدہ کا نکاح صغر سنی میں ہوا تھا اور صرف دس سال کی عمر میں اس نے بچہ جنا تھا، اور یہی صورت حال اس کی بیٹی کی بھی رہی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ انھوں نے بھی ایک خاتون کو دیکھا ہے جو نو سال کی عمر میں بالغ ہو گئی تھی اور دس سال کی عمر میں اس کے یہاں بیٹی کا تولد ہوا، (۵) اس لئے فقہاء نے بھی رخصتی اور زفاف کے لئے کسی خاص عمر کی تحدید نہیں کی ہے؛ بلکہ اس کا مدار اس کی طاقت اور جسمانی ساخت پر ہے؛ چنانچہ ہدایہ میں ہے :

---

(۱) مرقاۃ: ۴۱۷/۳۔

(۲) احکام القرآن رازی: ۵۵/۲۔

(۳) ترکمانی علی البیہقی: ۶۷/۱، ۷۹۔

(۴) بخاری، باب بلوغ الصبیان وشہادتہم، کتاب الشہادات۔

(۵) دیکھئے: فتح الباری: ۳۱۲/۵۔

أكثر المشائخ على أنه لاعدة للسن في هذا الباب ، و إنما العدة للطاقة إن كانت ضخمة سمينة تطيق الرجال، ولا يخاف عليها المرض من ذٰلک ، كان للزوج أن يدخل بها و إن لم تبلغ تسع سنين۔

اکثر مشائخ کی رائے یہ ہے کہ اس باب (صغیرہ سے جماع) میں عمر کا کوئی اعتبار نہیں ہے ؛ بلکہ اعتبار طاقت وقوت کا ہے ، اگر بھاری بھرکم اور موٹی ہو ، مردوں کو برداشت کرلیتی ہو اور اس کے سبب مرض کا اندیشہ نہ ہو تو شوہر دخول کرسکتا ہے اگر چہ وہ نو سال کی بھی نہ ہو۔

اور خود حضرت عائشہؓ کے نکاح میں بھی یہ اہم حقیقت ملحوظ ہے؛ چنانچہ ان کا عقد اگر چہ چھ سال کی عمر میں ہو گیا تھا؛ لیکن رُخصتی کے لئے مزید تین سال انتظار کیا گیا، اور اس دوران ان کی والدہ اِس کا خاص خیال رکھتی تھیں اور مختلف غذاؤوں کے ذریعے اس کی تدبیر کرتی تھیں کہ جسم کسی قدر فربہ ہوجائے؛ چنانچہ حضرت عائشہؓ خود فرماتی ہیں :

أرادت أمي ان تسمنني لدخولي علىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم فلم أقبل عليها بشيئ مما تريد حتى اطعمتني القثاء بالرطب ، فسمنت عليه كأحسن السمن ۔ (۱)

میری والدہ رُخصتی سے قبل مجھے فربہ کرنے کی تدبیریں کیا کرتی تھیں ؛ لیکن ان کی تدابیر ناکام ہوجاتی تھیں ، ہاں جب انھوں نے مجھے ککڑی اور کھجور ملا کر کھلایا تو میں موٹی ہوگئی۔

اس لئے اس عرب معاشرے کو ہمارے اس معاشرے پر قیاس کرنا فضول ہے، جس میں کمسن لڑکیوں سے نکاح معاشرتی جرم سمجھا جاتا ہے۔

عرب معاشرے میں آج بھی یہ قابل قبول ہے

بلکہ آج بھی عرب معاشرہ اس کو قبول کئے ہوئے ہے ؛ چنانچہ العربیۃ نیٹ نے ۱ ار نومبر ۲۰۱۰ء کو ایک رپورٹ شائع کی تھی جس کا عنوان ہی تھا: ''صغيرات يفضلن كبار السن والمتزوجين'' (کم عمر لڑکیاں معمر اور شادی شدہ مردوں کو ترجیح دے رہی ہے) ، اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ذہنی سکون اور مالی منفعت کی خاطر

(۱) أبوداؤد، ابن ماجہ۔

بہت سی عرب لڑکیاں کبیر السن مردوں کو ترجیح دیتی ہیں، مثال کے طور پر ایک سولہ سالہ طالبہ کہہ رہی ہے کہ اسے اس پر اطمینان اور مسرت ہے کہ اس کا نکاح ایک چھیاسٹھ سالہ مرد سے ہونے جارہا ہے، ۲۰ سالہ ''حفان'' کا کہنا ہے کہ اس کی پانچ بہنیں ہیں، اور پانچوں کا نکاح شادی شدہ مردوں سے ہوا ہے اور وہ پانچوں آسودگی اور عافیت کی زندگی گزار رہی ہیں۔(۱)

اس لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ نکاح چوں کہ ایک معاشرتی عمل ہے، اس لئے اس کے مختلف پہلوؤں میں مقامی سماج ومعاشرہ کے عرف ورواج کا خاص خیال رکھا جائے؛ چنانچہ روایات سے ثابت ہے کہ حضرت عائشہؓ سے نکاح کا مشورہ سب سے پہلے ایک قریشی خاتون حضرت خولہ بنت حکیم نے آپ ﷺ کو دیا تھا، اگر کمسنی کا نکاح معاشرتی اعتبار سے معیوب ہوتا تو یقیناً وہ خاتون کبھی نہ آپ ﷺ کو اس کا مشورہ دیتیں اور نہ ہی حضرت عائشہؓ کی والدہ اُم رومان کبھی اس کے لئے آمادہ ہوتیں، اور کفار مخالفین کو بھی ایک موقع ہاتھ آجاتا اور آپ کی شخصیت کو داغدار کرنے اور آپ کے خلاف پروپیگنڈے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے؛ لیکن سب کو معلوم ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا؛ بلکہ حضرت عائشہؓ اس سے پہلے ہی جبیر بن مطعم کے بیٹے سے منسوب ہوچکی تھیں، بیٹے کی ماں کی طرف سے رشتے کا انکار کئے جانے کے بعد ہی حضرت ابوبکرؓ نے آپ ﷺ سے رشتہ منظور کیا تھا۔

موسم کا اثر

دوسری اہم بات یہ ہے کہ کمسنی کے نکاح کو معاشرتی طور پر قبول عام حاصل ہونے میں وہاں کی گرم آب وہوا کو بھی بڑا دخل ہے، جس کے نتیجہ میں لڑکیاں جلد مردوں کے قابل ہوجایا کرتی ہیں، خاص کر ایسی لڑکیاں جن میں ذہنی نشوونما کی صلاحیت ہوتی ہے قامت اور جسم کے اعتبار سے بھی وہ جلد بڑھتی ہیں، حضرت علامہ سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں :

> اس کم سنی کی شادی کا اصل منشاء نبوت اور خلافت کے درمیان تعلقات کی مضبوطی تھی، ایک تو خود عرب کی آب وہوا میں عورتوں کی غیر معمولی نشوونما کی طبعی صلاحیت موجود ہے، دوسرے عام طور پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جس طرح ممتاز اشخاص کے دماغی اور ذہنی قوی میں ترقی کی غیر معمولی استعداد ہوتی ہے، اسی طرح قد وقامت میں بھی بالیدگی کی خاص قابلیت ہوتی ہے، اسی کو انگریزی میں ''پری کوشیس'' کہتے ہیں، بہرحال اس کم سنی میں آنحضرت ﷺ کا حضرت عائشہؓ کو اپنی زوجیت میں قبول کرنا، اس بات کی صریح دلیل ہے کہ لڑکپن ہی سے ان میں نشوونما، ذکاوت، جودت ذہن اور نکتہ رسی کے آثار نمایاں تھے۔(۲)

(۱) دیکھئے: wwwalarbiya.net۔ (۲) سیرت عائشہ: ۲۵۔

حضرت عائشہؓ کا تأثر

اس مسئلہ پر اس پہلو سے بھی غور کیا جا سکتا ہے کہ خود حضرت عائشہ صدیقہؓ اس نکاح کو کس نگاہ سے دیکھتی ہیں، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کبھی اس نکاح پر ناگواری کا اظہار تو کجا، وہ اس کو اپنی بہت بڑی خوش بختی سمجھتی تھیں، ان کا ایقان تھا کہ وہ دنیا کی سب سے خوش قسمت بیوی ہیں اور کیوں نہ ہو جب کہ شوہر دنیا کے سب سے بہترین انسان، رحمت دو عالم ﷺ ملے تھے، اس کے ساتھ ہی وہ اپنی اس شادی کو انتہائی مبارک خیال کرتی تھیں، اور آپ کی شادی اور رخصتی دونوں شوال میں ہوئیں اس لئے آپ شوال ہی کے مہینہ میں اس قسم کی تقریبوں کو پسند کرتی تھیں، اور کہتی تھیں کہ "میری شادی اور رخصتی دونوں شوال میں ہوئی اور بایں ہمہ شوہر کے معاملہ میں مجھ سے خوش قسمت کون تھی"۔(۱)

حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری اور آپ کی مسرت کے حصول میں شب وروز کوشاں رہتیں، اگر ذرا بھی آپ کے چہرے پر حزن وملال کا اثر نظر آتا، بے قرار ہو جاتیں، رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں کا اتنا خیال تھا کہ ان کی کوئی بات ٹالتی نہ تھیں، ایک دفعہ عبداللہ بن زبیرؓ سے خفا ہوکر ان سے نہ ملنے کی قسم کھا بیٹھی تھیں؛ لیکن جب آنحضرت ﷺ کے نانیہالی لوگوں نے سفارش کی تو انکار کرتے نہ بنا، آپ ﷺ کے دوستوں کی بھی اتنی ہی عزت کرتی تھیں، اور ان کی کوئی بات بھی رد نہیں کرتی تھیں۔

علم کی اشاعت

حضرت عائشہؓ سے کم سنی میں نکاح کی متعدد مصلحتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے رسول اکرم ﷺ کی زندگی کا نصف حصہ جو عام نگاہوں سے اوجھل تھا وہ اُمت کے سامنے آگیا اور علم ومعرفت کے اعتبار سے مسلمانوں کو زبردست نفع پہنچا، علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں :

> عرب میں خود مردوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا تو عورتوں میں کیا ہوتا، جب اسلام آیا تو قریش کے سارے قبیلہ میں صرف سترہ آدمی لکھ پڑھ سکتے تھے، ان میں شفاء بنت عبداللہ عدویہ صرف ایک عورت تھیں، اسلام کی دنیوی برکتوں میں یہ واقعہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ نوشت وخواند کا فن بھی فروغ پاتا جاتا تھا، بدر کے قیدیوں میں جو نادار تھے آنحضرت ﷺ نے ان کا فدیہ یہ مقرر کیا تھا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، صفہ میں کم وبیش سو اصحاب داخل تھے ان کو دیگر تعلیمات کے ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا۔

---

(۱) صحیح بخاری، مسلم کتاب النکاح۔

ازواج مطہرات میں حضرت حفصہؓ اور حضرت اُم سلمہؓ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں، حضرت حفصہؓ نے خاص آنحضرت ﷺ کے حکم سے یہ فن شفاء بنت عبداللہ عدویہ سے سیکھا تھا بعض اور صحابیات بھی نوشت وخواند سے آشنا تھیں۔

آنحضرت ﷺ کی کثرت ازواج اور خصوصاً حضرت عائشہؓ کی اس کم سنی کی شادی میں بڑی مصلحت یہ تھی کہ اگر چہ آنحضرت ﷺ کے دائمی فیضان صحبت نے سینکڑوں مردوں کو سعادت کے درجہ اعلیٰ پر پہنچا دیا تھا؛ لیکن فطرۃً یہ موقع عام عورتوں کو میسر نہیں آسکتا تھا، صرف ازواج مطہرات اس فیض سے متمتع ہوسکتی تھیں اور پھر یہ نور آہستہ آہستہ ان ہی ستاروں کے ذریعے سے پوری کائنات نسوانی میں پھیل سکتا تھا۔

حضرت عائشہؓ کے علاوہ دوسری ازواج مطہرات بیوہ ہو کر آنحضرت ﷺ کے حبالۂ عقد میں داخل ہوئی تھیں، اس بنا پر ان میں حضرت عائشہؓ ہی خالص فیضان نبوت سے مستفیض تھیں، لڑکپن کا زمانہ جو عین تعلیم وتربیت کا زمانہ ہے، ابھی شروع ہوا ہی تھا کہ سعادت نے ظلمت اور نقص کمال کے ہر گوشہ سے الگ کر کے کاشانۂ نبوت میں پہنچا دیا کہ ان کی ذات اقدس، پُرنور اور کامل بن کر دنیا کی نصف لطیف آبادی کے لئے شمع راہ بن جائے۔(۱)

چنانچہ علمی حیثیت سے حضرت عائشہؓ کو نہ صرف عام عورتوں پر، نہ صرف اُمہات المومنین پر، نہ صرف خاص خاص صحابیوں پر؛ بلکہ چند بزرگوں کو چھوڑ کر تمام صحابہ رضی اللہ علیہم پر فوقیت عام حاصل تھی، صحیح ترمذی میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے :

ما أشكل علينا أصحاب محمد صلى الله وسلم حديث قط فسألنا عائشة إلا وجدنا عندها منه علما۔

ہم صحابیوں کو کوئی ایسی مشکل بات کبھی نہیں پیش آئی کہ جس کو ہم نے عائشہؓ سے پوچھا ہو اور ان کے پاس اس کے متعلق کچھ اہم معلومات ہم کو نہ ملی ہوں۔

عطا بن ابی الرباح تابعیؒ جن کو متعدد صحابہ سے تلمذ کا شرف حاصل تھا، کہتے ہیں :

كانت عائشة أفقه الناس و أعلم الناس و أحسن رأيا في العامة۔

حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ صاحب علم اور عوام میں سب سے زیادہ اچھی رائے والی تھیں۔

(۱) سیرت حضرت عائشہؓ: ۱۳۱۔

حفظ حدیث اور سنن نبوی ﷺ کی اشاعت کا فرض گو دیگر ازواج مطہرات بھی ادا کرتی تھیں، تاہم حضرت عائشہؓ کے رتبہ کو ان میں سے کوئی بھی نہیں پہنچی، محمود بن لبید کا بیان ہے :

كان أزواج النبي صلى الله عليه وسلم يحفظن من حديث النبي صلى الله عليه وسلم كثيرا ولا مثلا لعائشة و أم سلمة ۔
ازواج مطہرات ، بہت سی حدیثیں زبانی یاد رکھا کرتی تھیں ؛ لیکن حضرت عائشہؓ اور اُم سلمہؓ کے برابر نہیں۔

امام زہری کی شہادت ہے :

لو جمع علم الناس كلهم وعلم أزواج النبي صلى الله عليه وسلم فكانت عائشة او سعهم علما ۔
اگر تمام مردوں کا اور اُمہات المومنین کا علم ایک جگہ جمع کیا جاتا، تو حضرت عائشہؓ کا علم ان میں سب سے وسیع ہوتا۔

بعض محدثین نے حضرت عائشہؓ کے فضائل میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''خذوا شطر دينكم عن حميراء'' (اپنے مذہب کا ایک حصہ اس گوری سے سیکھو)، اس حدیث کو ابن اثیر ''نہایہ'' میں اور فردوس اپنی مسند میں (بتغیر الفاظ) لائے ہیں ؛ لیکن لفظاً اس کی سند ثابت نہیں اور اس کا شمار موضوعات میں ہے، تاہم معناً اس کے صحیح ہونے میں کس کو شک ہے۔(۱)

کم سنی میں نکاح، مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اس نکاح کے متعلق سب سے زیادہ شکوک وشبہات مستشرقین اور عالم نصرانیت نے پیدا کئے ہیں ؛ حالاں کہ اگر ہم نصرانیت کی اندرون خانہ تلاشی لیں تو یہ حقیقت واشگاف ہو جاتی ہے کہ مسیحی مصادر، مثلاً انسائیکلو پیڈیا آف کیتھولوجیک کے مطابق حضرت مریم کا نکاح جس وقت یوسف نجار سے ہوا، اس وقت ان کی عمر صرف بارہ سال اور یوسف نجار کی عمر نوے سال سے متجاوز تھی۔(۲)

ظاہر ہے یہ محض افسانہ ہے جس کا ہمارے نقطۂ نظر کے اعتبار سے حقائق سے کوئی واسطہ نہیں ؛ لیکن اس سے اتنا تو ثابت ہے کہ عیسائی چرچ اس کم سنی کو زوجین کی عمر میں اس قدر واضح فرق کے باوجود، نکاح کے مناسب خیال کر رہا ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اس عمر کی شادی اس وقت کی ثقافت تھی ، جو صرف عربوں میں نہیں ؛ بلکہ عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔

---

(۱) سیرت حضرت عائشہؓ: ۱۴۷۔ (۲) دیکھئے: www.newadvent.org۔

اسی طرح یہودی بڑی تعداد میں مدینہ منورہ میں رہتے تھے، وہ بھی آپ پر لعن طعن کے مواقع کی تاک میں رہتے تھے؛ لیکن کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ اس نکاح پر یہودیوں نے کبھی بھی تنقید کی ہو، یہ صاف اور صریح دلیل ہے کہ اس طرح کا نکاح اس وقت کے یہودی معاشرے میں بھی قابل قبول تھا۔

یورپی معاشرے میں کم سنی کے نکاح کا تصور

ایک تحقیق کے مطابق انیسویں صدی کے اوائل تک یورپی ممالک میں دس سال کی عمر میں شادی کا رواج معروف اور رائج رہا ہے۔(۱)

اسی طرح واشنگٹن پوسٹ میں سارہ بوڈمین کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں وہ مان رہی ہیں کہ اس دور میں بھی مغربی دنیا میں نو سال کی عمر میں جنسی تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔(۲)

اسی طرح بی بی سی کی سائٹ پر ایک رپورٹ ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ اسپین سے تعلق رکھنے والی ایک کمسن بچی نے اپنا پہلا بچہ محض دس سال کی عمر میں جنم دیا ہے اور اس کا خاندان اس پر بے انتہا مسرور ہے؛ بلکہ اس کی دادی کو بلا وجہ اس واقعہ کو میڈیا میں اہمیت دیئے جانے پر سخت تعجب ہے؛ کیوں کہ یہ اس معاشرہ کے لئے عام سی بات ہے۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ عقلاً یا عرفاً کسی بھی طرح یہ نکاح، ایسا نہیں ہے کہ جس پر واویلا مچایا جائے، اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ شریعت کم سنی میں نکاح کی دعوت دے رہی ہے؛ بلکہ ہماری گفتگو کا حاصل ہے کہ اگر خاص مصالح کے پیش نظر طرفین کی رضامندی سے اس طرح کے نکاح کی نوبت آتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

خلاصہ بحث

(۱) بہ وقت رخصتی حضرت عائشہؓ کی عمر کے سلسلے میں دو روایتیں ہیں: لیکن اٹھارہ سال والا قول روایت اور درایت کے اعتبار سے غلط ہے اور ۹ سال کی عمر کا قول ہی صحیح اور معتبر ہے، محض اس بنا پر اس قول کی تغلیط درست نہیں ہے کہ اسے ماننے کی صورت میں معاندین کا اشکال لازم آتا ہے، اس لئے اس عمر میں نکاح پر کسی قسم کی معذرت یا اظہار ندامت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) حضرت عائشہؓ اس سے پہلے جبیر بن مطعم کے بیٹے سے منسوب ہو چکی تھیں اور ایک خاتون یعنی حضرت خولہ بنت حکیمؓ نے سب سے پہلے آپ کو اس نکاح کا مشورہ دیا تھا، یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس وقت کے معاشرے میں زواج کے لئے یہ معروف طبعی عمر تھی، اور اس عمر میں نکاح کو معیوب بالکل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

---

(۱) دیکھئے وکی پیڈیا کی سائٹ: wiki\Ages of consent۔ (۲) دیکھئے: واشنگٹن پوسٹ: ۱۰رمئی ۲۰۰۶ء۔

(۳) عرب کا معاشرہ ایسا ہے کہ جس میں گرم آب وہوا کی وجہ سے نشوونما جس تیزی سے ہوتی ہے؛ وہ ہمارے یا کسی اور معاشرے سے بہت حد تک مختلف ہے۔

(۴) اس وقت بھی مغربی ممالک میں اس عمر میں جنسی تعلقات قائم ہوکر توالد وتناسل کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا، اور آج بھی بعض عرب معاشرے میں شادی شدہ، کبیر السن شوہروں سے نکاح کو افضل خیال کیا جاتا ہے۔

(۵) حضرت عائشہؓ سے کم سنی میں نکاح سے متعدد دینی تعلیمی اور تربیتی مصلحتیں وابستہ تھیں اور علم نبوت کا ایک اہم حصہ ان کے ذریعے اُمت تک پہنچ سکا۔

(۶) عیسائیت کے بنیادی ماخذ میں یہ مذکور ہے کہ حضرت مریم کا نکاح یوسف نجار سے اس وقت ہوا تھا، جب کہ وہ ۱۲ سال کی اور یوسف نجار نوے سال سے زیادہ کی عمر کے تھے، نیز یہود مدینہ جو قابل اعتراض اُمور کی تاک میں رہتے تھے، انھوں نے بھی کبھی اس حوالے سے آپ ﷺ پر انگلی نہیں اُٹھائی، جو اس امر کی صریح دلیل ہے کہ عیسائی اور یہودی معاشرے میں بھی یہ قابل قبول عمل تھا۔

(۷) آخری بات یہ ہے کہ خود حضرت عائشہ صدیقہؓ اس نکاح سے حد درجہ مطمئن ہیں، زوجین میں ایسا توافق اور مثالی محبت ہے، جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے، ایسا ہرگز نہیں کہ کبھی بھی ان کے کسی عمل سے اس نکاح پر ناراضگی یا خفگی محسوس ہوئی ہو؛ بلکہ وہ تو اپنی خوش قسمتی پر حد درجہ نازاں تھیں؛ حالاں کہ ایک موقع ایسا بھی آیا جب انھیں خود خالق کائنات کی طرف سے اختیار دیا گیا کہ چاہے تو وہ اس نکاح میں ہی رہیں اور اگر چاہیں تو طلاق لے لیں، دنیا کی بہاریں ان کی منتظر ہیں، رسول اکرم ﷺ نے اس خدائی فرمان کو پیش کرنے سے پہلے احتیاطاً یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم جواب دینے سے پہلے اپنے والدین سے مشورہ کر لینا؛ لیکن انھوں نے فوراً کہہ دیا: کیا میں آپ کے سلسلے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں گی؟ مجھے اللہ اور اس کے رسول ہی پسند ہیں، تو محبت واعتماد کی مضبوط بنیادوں پر قائم ایسے پاکیزہ نکاح کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا، اور طعن وتنقید کا نشانہ بنانا، حق وانصاف کا گلا گھوٹنا نہیں تو اور کیا ہے؟ اللہ پاک ہم سب کو فہم صحیح عطا کریں اور صراط مستقیم پر گامزن رکھیں۔ آمین

● ● ●

خواتین سے متعلق بعض تعلیماتِ نبوی اور غلط فہمیاں

(ٹیڑھی پسلی سے پیدائش، ناقصات العقل، گواہی، تعلیم کتابت)

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی ◆

عورتوں کے بارے میں دنیا ہمیشہ، نہایت اور عجیب وغریب، افراط وتفریط کا شکار رہی ہے، قدیم وجدید دونوں طرح کی جاہلیت میں وہ بعض مذاہب کی عبادت گاہوں میں دیوی کی حیثیت سے براجمان رہتی ہے اور لائق پرستش ہے؛ لیکن عملی زندگی میں اس کی حیثیت داسی سے بھی بدتر ہے، فکر وفلسفہ کے اعتبار سے وہ آج مردوں کے ہمدوش خیال کی جاتی ہے؛ لیکن حقیقت کی دنیا میں اس کی زندگی آج بھی قابل ترس ہے، بحیثیت عورت اور بحیثیت ماں، بہن، بیوی، بیٹی اس کی کوئی عزت نہیں ہے، اگر اسے کوئی مقام حاصل ہے تو وہ ''مرد بن'' جانے کے بعد، وہ مردوں کی طرح لباس پہننے لگے، ان جیسے کام کرنے لگے، گھریلو زندگی سے فرار اختیار کرلے تو وہ باعزت اور لائق فخر ہے، گویا کہ اس عورت کی عزت ہے جو جسمانی اعتبار سے عورت ہو؛ لیکن ذہنی اور فکری اعتبار سے مرد۔

لیکن کیا مرد کا روپ دھار لینے کی وجہ سے وہ واقعی مرد بن گئی؟ اس میں مردوں کی صلاحیت پیدا ہوگئی؟ حقیقت صرف یہ ہے کہ جس طرح سے کسی مرد کو عورت کے سانچے میں نہیں ڈھالا جاسکتا ہے، اسی طرح سے کسی عورت میں مرد کی صلاحیت پیدا نہیں ہوسکتی ہے؛ کیوں کہ دونوں کی صلاحیتیں بالکل جداگانہ ہیں، ایک ہی ماحول اور مقام میں پرورش پانے والے مرد وعورت کی طبعی اور نفسیاتی رجحان میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے، ایک نوبل پرائز یافتہ فرانسیسی مصنف ڈاکٹر الگزس کیرسل لکھتا ہے:

> مرد واور عورتوں کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں، وہ بنیادی نوعیت کے ہیں، یہ اختلافات ان کے جسم کی رگوں اور ریشوں کی ساخت کے مختلف ہونے سے پیدا ہوتے ہیں، عورت کے بیضہ دان سے جو کیمیاوی مادے خارج ہوتے ہیں، ان کا اثر صنف نازک کے ہر حصہ پر پڑتا ہے، مردوں اور عورتوں کے طبعی اور نفسیاتی اختلافات کا سبب بھی یہی ہے۔(۱)

◆ استاذ: جامعۃ الفلاح بلیریا گنج، اعظم گڑھ۔

(۱) عورت اسلامی معاشرے میں: ۲۷، از: مولانا سید جلال الدین عمری۔

اور ڈاکٹر لیمبروس گنا اپنی کتاب روح نسوانیت میں لکھتی ہے :

عورتیں اور مرد صرف طول وقامت، ہڈیوں کی ساخت اور عضلاتی بناوٹ کے اعتبار ہی سے مختلف نہیں ؛ بلکہ اس اعتبار سے بھی مختلف ہیں کہ وہ ہوا اور غذا کی ایک ہی مقدار جذب نہیں کرتے، ان کے امراض کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، ان کے ذہن اور اخلاقی رجحانات میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔(۱)

اور اس فرق کو تعلیم وتربیت اور ماحول کے ذریعہ ختم نہیں کیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ کسی انسان کی اسی صلاحیت کو کسب ومحنت اور تعلیم وتربیت کے ذریعہ ترقی دی جاسکتی ہے، جو اس میں موجود ہو اور جس صلاحیت کا سرے سے اس میں وجود ہی نہ ہو وہ تعلیم وتربیت یا کسی ذریعہ سے پیدا نہیں جاسکتی ہے، ڈاکٹر الکزس کیرسل لکھتا ہے :

مرد وعورت کا فرق محض جنسی اعضا کی خاص شکل، رحم کی موجودگی، حمل یا طریقہ تعلیم کے سبب نہیں ہے؛ بلکہ یہ اختلافات بنیادی قسم کے ہیں —— صنف نازک کی ترقی کے حامی ان بنیادی حقیقتوں سے ناواقف ہونے کی بنا پر سمجھتے ہیں کہ دونوں جنسوں کو ایک ہی قسم کی تعلیم، ایک ہی قسم کے اختیارات اور ایک ہی قسم کی ذمہ داریاں ملنی چاہئیں، حقیقت یہ ہے کہ عورت، مرد سے بالکل مختلف ہے —— عورتوں کو چاہئے کہ اپنی فطرت کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو ترقی دیں اور مردوں کی نقالی کی کوشش نہ کریں، تہذیب کے ارتقاء میں عورتوں کا بہ نسبت مردوں کے زیادہ حصہ ہے، اس لئے انھیں اپنے خصوصی فرائض سے پہلو تہی نہیں کرنا چاہئے۔(۲)

اور ڈاکٹر لیمبروس گنا تحریر کرتی ہیں کہ :

ترقی اور ارتقا اسی طرح ممکن ہے کہ مردوں اور عورتوں کے معاشرتی حقوق وفرائض تعین کرنے میں ان کے فروق واختلافات کو مدنظر رکھا جائے۔(۳)

عورت کی نفسیات، طبعی رجحانات اور فکری وعملی قوتوں کے حقیقت پسندانہ جائزہ سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اس کا دائرہ کار اندرون خانہ ہے اور گھر سنبھالنا کوئی معمولی درجے کا کام نہیں؛ بلکہ یہیں سے تہذیب وتمدن کی

(۱) عورت اسلامی معاشرے میں: ۲۷، از: مولانا سید جلال الدین عمری۔

(۲) علم جدید کا چیلنج: ۱۹۹، از: مولانا وحید الدین خاں، اور عورت اسلامی معاشرے میں: ۲۹، از: مولانا سید جلال الدین عمری۔

(۳) عورت اسلامی معاشرے میں: ۲۹۔

بنیاد پڑتی ہے، یہیں پر انسانیت کے کل پرزے ڈھالے جاتے ہیں اور یہیں پر سب سے زیادہ قیمتی سرمائے کی حفاظت کی جاتی ہے اور نسل انسانی کے نمائندے تیار ہوتے ؛ اس لئے اسلام کی نگاہ میں اُمور خانہ داری کی وہی اہمیت ہے جو مرد کے لئے کسبِ معاش کی ذمہ داری کی ہے، دونوں کی یکساں اہمیت ہے، اس لئے کسی کو حق نہیں کہ وہ احساس برتری میں مبتلا ہو اور نہ کسی کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ'' (جس طرح سے عورتوں پر کچھ ذمہ داریاں ہیں اسی طرح سے ان کے حقوق بھی ہیں) علوم عمران اور فلسفہ ونفسیات کے ماہر کانٹ کی رائے یہ ہے کہ :

> فطری قانون یہ ہے کہ عورتیں گھریلو زندگی کے لئے ہیں، اس قانونِ فطرت میں کبھی کوئی اہم تغیر نہیں ہوا ہے، اور یہی قانون صحیح ہے، ضروری ہے کہ عورتوں کی زندگی گھریلو ہو اور اسے خارجی کاموں سے آزاد رکھا جائے؛ تا کہ وہ اپنے فرائض زندگی کو انجام دے سکے۔(۱)

اور سماجیات کی نبض شناس ایڈالین کہتی ہے کہ :

> تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ گھر کے لئے اور بچوں کی تربیت ونگہداشت کے لئے ماں کا ہونا ضروری ہے، موجودہ اور زمانہ گذشتہ کے معاشرہ کی اخلاقی سطح کے درمیان یہ بڑا اور غیر معمولی فرق اسی بنیاد پر ہے کہ ماں نے اپنا گھر چھوڑ دیا ہے، اپنے بچوں سے غافل ہوگئی ہے۔(۲)

ٹیڑھی پسلی

گھریلو ذمہ داریوں کو سنبھالنے اور نسل انسانی کو پروان چڑھانے کے لئے تیز وتند جذبات کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ نسل انسانی کو پروان چڑھانا کوئی وقتی اور ہنگامی مشغلہ نہیں ہے؛ بلکہ ایک طویل اور دشوار طلب کام ہے، جسے محض عقل کے سہارے انجام نہیں دیا جاسکتا ہے؛ بلکہ اس کے لئے مخصوص جذباتی صلاحیت ناگریز ہے، جس کے ذریعہ عورت ان مشکل ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوتی ہے، عورت کی اسی مخصوص صلاحیت کو بعض حدیثوں میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :

> **المرأة کالضلع ان اقمتها کسرتها وان استعمتعت بها استعمتعت وبها عوج ۔ (۳)**

---

(۱) عورت اسلام کے سائے میں: ۳۶، از: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی۔

(۲) حوالۂ سابق: ۳۱۔ (۳) بخاری: ۵۱۸۴، صحیح مسلم: ۱۴۶۸۔

عورت پسلی کی طرح ہے، اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو ٹوٹ جائے گی، اور اگر اس سے فائدہ اُٹھانا چاہو تو اسی کیفیت کے ساتھ اُٹھا سکتے ہو۔

دوسری روایت میں ہے کہ :

استوصوا بالنساء خیراً فانهن خلقن من ضلع ۔ (۱)

عورتوں کے ساتھ خیر خواہی اور بھلائی کا معاملہ کرو؛ کیوں کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔

اور صحیح مسلم میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں :

ان المرأة خلقت من ضلع لن تستقیم لک علی طریقة ۔ (۲)

علامہ عینیؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ :

اس حدیث میں محض تمثیل کے طریقے پر کہا گیا کہ عورت کو پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔(۳)

اور علامہ محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ :

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے اخلاق میں کچھ کجی عیب نہیں ہے، جیسا کہ پسلی کا ٹیڑھا ہونا کوئی عیب نہیں ہے؛ لہٰذا مرد کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ عورتوں میں مردوں جیسے اخلاق تلاش کرے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک میں کچھ ایسی مخصوص صلاحیت رکھی ہے جو دوسرے میں نہیں پائی جاتی ہے۔(۴)

غرضیکہ یہ ''عورت پن'' کے لئے ایک ضروری وصف ہے، اسی سے نسوانیت کی تکمیل ہوتی ہے اور مہر واُلفت کے سوتے پھوٹتے ہیں، اور محبت و چاہت کے دیپ جلتے ہیں اور جس طرح دل وجگر کی حفاظت کے لئے پسلی میں کجی ضروری ہے، اسی طرح سے نسوانیت کی حفاظت کے لئے ایک طرح کی کجی ناگزیر ہے، اسے ختم کرنے کی کوشش کرنا نسوانیت کے آبگینے کو ٹھیس پہنچانا ہے، اس لئے مرد کو اس کی فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے شدت وسختی کے بجائے لطف ومحبت اور ہمدردی کا رویہ اختیار کرنا چاہئے، مذکورہ حدیث کا یہی پیغام اور مقصد ہے اور اس میں ایک فطری حقیقت کا بیان ہے، جس کو دوسرے لوگوں نے بھی دوسرے الفاظ میں ادا کیا ہے؛ چنانچہ میتھو آرنلڈ اس بات کو ان الفاظ میں کہتا ہے کہ ''عورت پر دل کی دلیل کام کرتی ہے نہ کہ دماغ کی''۔(۵)

---

(۱) بخاری:۵۱۸٦۔ (۲) صحیح مسلم:۱۴٦۸۔ (۳) عمدۃ القاری:۱۵/ ۲۱۳۔

(۴) تکملہ فتح الملہم:۷/ ۱۳٦۔ (۵) عورت — اسلام اور جدید سائنس:۱۱۲۔

بعض لوگوں نے اس طرح کی حدیثوں کو دیکھ کر یہ خیال کیا کہ عورت کی پیدائش پسلی سے ہوئی ہے؛ حالاں کہ صحیح حدیثوں میں اس طرح کی کوئی صراحت نہیں ہے؛ بلکہ پہلی حدیث میں تو صاف طور پر کہا گیا ہے کہ عورت پسلی کی طرح ہے اور دوسری حدیث میں بھی تشبیہ کا مفہوم زیادہ واضح ہے اور مطلب صرف یہ ہے کہ عورت کی فطرت اور بناوٹ میں پسلی جیسی کجی ہے، جیسے کہ قرآن میں تمام انسانوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ خلق الانسان من عجل، بعض لوگوں نے اس خیال کی تائید میں درج ذیل آیتیں بھی ذکر کی ہیں :

يَآَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۔ (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں کے ذریعہ بہت سے مرد وعورت دنیا میں پھیلا دیئے۔

ایک دوسری آیت میں ذکر فرمایا گیا :

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا۔ (الاعراف:۱۸۹)

وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا؛ تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔

ان آیتوں کی کی تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ وغیرہ کے حوالہ سے یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت حوا کو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے؛ لیکن اس طرح کی روایتوں کے بارے میں زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں، اس لئے کہ بائبل میں ہے کہ :

اللہ تعالیٰ نے آدم پر گہری نیند طاری کر دی اور وہ (آرام) سے سوگیا، تب اس نے (اللہ تعالیٰ نے) اس کی ایک پسلی نکالی اور اس کی جگہ پر گوشت بھر دیا اور اللہ تعالیٰ نے آد سے جو پسلی لی تھی اس نے ایک عورت بنایا اور اس کو آدم کے پاس لایا۔(۱)

یہ تمام تر تفصیلات روایتوں میں موجود ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہودیوں کے ذریعہ یہ بات مسلمانوں تک پہنچتی ہے اور پھر اسی کے ذریعہ مذکورہ آیتوں اور روایتوں کی تفسیر وتشریح کر دی گئی ہے؛ حالاں کہ اس کے برعکس روایتیں بھی موجود ہیں؛ چنانچہ حضرت ربیع بن انس کہتے ہیں کہ جس مٹی سے حضرت آدم علیہ السلام بنائے گئے اسی سے حضرت حوا پیدا کی گئیں، اس لئے کہ قرآن میں ہے کہ :

(۱) کتاب پیدائش، باب:۲، آیت:۲۲-۲۴۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ۔ (۱)

وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔

اور علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ امام باقر بھی اسی کے قائل ہیں۔(۲)

اور مذکورہ آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ اسی جنس سے اس کا جوڑا بنایا گیا اور اس مفہوم کی تائید متعدد آیتوں سے ہوتی ہے؛ چنانچہ قرآن میں ہے کہ :

وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَیْهَا ۔ (۳)

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں؛ تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا ۔ (۴)

جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لئے جوڑے پیدا کئے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا ۔ (۵)

اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری جنس سے تمہارے لئے جوڑا پیدا کیا۔

ان تینوں میں ''نفس'' سے مراد جنس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، اس لئے مذکورہ دونوں آیتوں میں بھی نفس سے یہی مراد ہے یعنی ان آیتوں میں تمام مردوں کی بیویوں کے سلسلے میں وہی لفظ استعمال ہوا ہے، جو سورۂ نساء میں حضرت حوا کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور ان آیتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا ہے کہ ہر مرد کی بیوی اس کے جسم سے نکالی گئی ہے؛ لہٰذا جس طرح سے دیگر عورتیں مردوں کی ہم جنس ہیں، اسی طرح سے حضرت حوا بھی ان کی ہم جنس تھیں، کہ اگر دونوں کو مثلاً آگ اور پانی جیسے الگ الگ جنس سے بنایا جاتا تو پھر موافقت نہ ہوتی اور پر سکون زندگی گذارنا مشکل ہوتا اور یہ ناممکن ہوتا کہ وہ دونوں مشترکہ جدوجہد سے نسل انسانی کو پروان چڑھائیں، اس معاملہ میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے، وہ حدیث کو بائبل کے بیان سے جوڑ دینے اور پھر اسی کی روشنی میں قرآنی آیتوں کی تفسیر کرنے کی وجہ سے ہو رہی ہے؛ حالاں کہ مذکورہ حدیث کا بائبل کے بیان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عقل میں کمی

عورت کے احساس میں نزاکت وذکاوت، وجدان میں لطافت اور جذبات میں شدت ہوتی ہے اور یہ

---

(۱) الانعام:۲، عمدۃ القاری:۱۵/ ۲۱۲۔　(۲) روح المعانی:۴/ ۱۸۱۔　(۳) الروم:۲۱۔

(۴) الشوریٰ:۱۱۔　(۵) النحل:۷۲۔

چیزیں اس کے خمیر میں شامل ہیں اوراس کے لئے نقص نہیں؛ بلکہ باعث کمال ہے، یہ اس کے لئے سرمایہ حیات ہے اورحیات انسانی کی بقا کے لئے ضامن ہے، اگراس میں جذبات کی فراوانی نہ ہوتونسل انسانی اورجان ناتواں کا وجود برقرار نہیں رہ پائے گا، اس کی یہی صفت ممتا کی زندہ اور دائمی صفات کا سرچشمہ ہے، اس لئے فریضۂ نسوانیت کی ادائیگی کے لئے عورت کے اندراس صفت کا ہونا ناگزیر ہے۔

جذبات کی فراوانی اورایثار ومحبت کی پیکر ہونے کی وجہ سے عورتوں میں مردوں کی طرح یکسوئی اور بیدار مغزی کی کچھ کمی ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جذبات میں جتنی شدت ہوگی، قوت فہم اورقوت یادداشت میں اسی درجہ کمی ہوگی؛ چنانچہ یہ عام مشاہدہ ہے کہ غصہ، انتہائی خوشی، اور شدت غم کے جذبات میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کم بلکہ بسااوقات ختم ہوجاتی ہے۔

عورت کی اس صفت کو بعض حدیثوں میں ''نقص عقل'' کہا گیا ہے، جس کا مقصد مردوں کو ان کی اس کیفیت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ہمدردی کا رویہ اختیار کریں اورجذبات سے مغلوب ہوکر اگر وہ کوئی بات کہہ دیں تو درگذر سے کام لیں، نیز ان کے جذباتی فیصلے کو اپنے اوپر مسلط نہ کریں؛ بلکہ اپنی عقل بھی استعمال کریں، علامہ اکمل الدین بابرتی نے مذکورہ حدیث کی روشنی میں عورتوں کی ذہنی صلاحیت کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے :

> انسانی قوتوں کو چار درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلا درجہ یہ ہے کہ سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت ہو، اسے عقل ہیولانی کہا جاتا ہے، یہ استعداد فطری طور پر ہر شخص میں پائی جاتی ہے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ جزئیات میں حواس کے استعمال سے بدیہی باتیں معلوم ہوجائیں اورجس کے نتیجے میں غور وفکر کے ذریعہ خالص فکری حقائق کا ادراک کرسکے، اس کو'عقل بالملکہ' کہا جاتا ہے اوراسی استعداد کی وجہ سے انسان شرعی احکام کا مکلف ہوتا ہے، تیسرا درجہ یہ ہے کہ بدیہی حقیقتوں سے جونظریات مستنبط ہوتے ہیں ان کے حصول کے لئے کسی کسب ومحنت کی ضرورت نہ ہو؛ بلکہ بے تکلف حاصل ہوجائے، اسے ''عقل فعلی'' کہا جاتا ہے، چوتھا درجہ یہ ہے کہ یہ نظریات اس طرح مستحضر ہوں کہ ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رہیں، اسے عقل مستفاد کہا جاتا ہے۔
>
> اورشریعت کا پابند ہونے کے لئے جس صلاحیت کی ضرورت ہے، وہ ''عقل بالملکہ'' ہے، اوراس درجہ کی عقل میں عورتوں کے اندر کسی طرح کی کوئی کمی نہیں ہوتی ہے؛ کیوں کہ ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ یہ جزئیات میں خواص کو

استعمال کر کے بدیہات کو پالیتی ہیں اور اگر کسی بات کو بھول جائیں تو یاد دلانے پر فوراً یاد کر لیتی ہیں، اگر اس صلاحیت میں کوئی کمی ہوتی تو اسلامی احکام کے سلسلے میں انھیں مردوں سے کمتر درجے کے احکام کا پابند بنایا جاتا؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، اس لئے نبی ﷺ نے ان کے بارے میں جو یہ کہا ہے کہ وہ عقل کے اعتبار سے ناقص ہوتی ہیں تو اس سے مراد عقل کا تیسرا درجہ یعنی عقل فعلی ہے۔(۱)

عورتوں کے سلسلے میں ماہرین نفسیات کا اتفاق ہے کہ وہ مردوں کی بہ نسبت زیادہ ذکی الحس، اور جذباتی ہوتی ہیں، اُلفت ومحبت، نفرت وعداوت، خوشی اور غمی ہر موقع پر وہ جذبات کا مظاہرہ کرتی ہیں، اور یہ جذبات اس کے دل و دماغ پر گہرے، دُور رس اور دیر پا اثرات چھوڑتے ہیں اور جہاں جذبات کی فراوانی ہو، وہاں کسی غیر معمولی رجحان کا پایا جانا کوئی بعید نہیں ہے؛ چنانچہ مشہور اشترا کی مصنف برودن لکھتا ہے :

عورت کا وجدان ہمارے وجدان سے کمزور، اس کی عقل ہماری عقل سے کمتر اور اس کے طبعی اخلاق ہمارے اخلاق سے مختلف ہیں —تم عورتوں پر اچھی طرح سے غور کرو تو تم دیکھو گے کہ اس میں افراط ہوگی یا تفریط۔(۲)

اور ڈاکٹر اجوس کونت کے بقول کہ عورتوں اور مردوں کی جسمانی قوتوں میں ایک تہائی کا فرق ہوتا ہے، عورتوں کا دل، مردوں کے مقابلے میں ۶۰ گرام چھوٹا ہوتا ہے اور مردوں کا مغز دماغ عورتوں کی بہ نسبت سو گرام بڑا ہوتا ہے، مردوں کے دماغی حجم کا تناسب اس کے جسم سے ایک اور چالیس اور عورتوں کا ایک اور چوالیس کا ہوتا ہے۔(۳)

واقعہ یہ ہے کہ فطرت کی تخلیقی اسکیم میں جذباتیت کا عنصر بلند پایہ مصلحتوں کی تکمیل کا ذریعہ ہے، عورت کو اس خیر کثیر سے اس لئے نوازا گیا ہے کہ اس کے بغیر خصوصی نوعیت کے حیاتی وظیفے کی ادائیگی ناممکن ہے؛ کیوں کہ بچے کی پرورش کے لئے عقل کی نہیں بلکہ تیز وتند جذبات کی ضرورت ہے، جو عورت کو ٹھنڈے دل ودماغ سے سوچنے ہی نہیں دیتے اور بچے کی ضرورت کی تکمیل کے لئے کسی سستی اور کوتاہی کے بغیر آگے بڑھنے پر آمادہ کرتے ہیں اور ایک ماں اپنے راحت وآرام کو قربان کر کے بچے کو سکون واطمینان پہنچانے کی کوشش کرتی ہے؛ بلکہ اپنے وجود کو داؤ پر لگا کر بچے کو بچانے کے لئے کوشاں رہتی ہے۔

---

(۱) العنایہ: ۷/۲۷۳۔

(۲) عورت —اسلام کے سائے میں: ۳۶، از: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی۔

(۳) حوالۂ سابق۔

اور اس طرح کی حدیثوں کا مقصد عورتوں کی حقارت نہیں ؛ بلکہ ان کی فطرت کا اظہار اور مردوں کو ان کے ساتھ حسن سلوک اور نرم روی کی تلقین وتائید کرنا ہے کہ ان کے ساتھ سختی اور درشتی کا معاملہ ان کی فطرت کے خلاف ہے، اگر ایسا کیا گیا تو اس کی شخصیت ٹوٹ کر بکھر جائے گی ،جس کا نتیجہ بے سکونی ، اضطراب اور سماج ومعاشرہ میں فساد کی شکل میں برآمد ہوگا۔

عورتوں کی گواہی

عورت کی نفسیاتی ساخت ، دائرہ کار ، زندگی کا محور اور معاشرتی ذمہ داریوں اور جذباتی عوامل کی وجہ سے عورتوں کے مخصوص مسائل کے علاوہ دیگر معاملات میں صرف ایک عورت کی گواہی کافی نہیں سمجھی گئی ہے ؛ بلکہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ دوسری عورت بھی شریک رہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۔ (۱)

اور اپنے دو مردوں کو اس پر گواہ بنالو اور اگر دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بناؤ، گواہ ایسے ہوں کہ وہ تمہاری نگاہ میں پسندیدہ ہوں، دو عورتیں اس لئے ہیں کہ اگر ایک بھٹک جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

اس آیت کی تفسیر میں سید قطب نے جو لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ شریعت نے گواہ کے لئے مردوں کو اس لئے رکھا ہے کہ مسلم سماج میں کاموں کی ذمہ داری عموماً مردوں کی ہوتی ہے، عورت کو اس سماج میں معاش فراہم کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی ، وہ معاش کے میدان میں آکر اپنی ممتا، نسوانیت اور سب سے بیش بہا انسانی سرمایہ کی حفاظت وتربیت کے اہم کام پر ظلم نہیں ڈھاتی ، یہ ظلم چند لقموں یا چند روپیوں کی خاطر ہوتا ہے ؛ لیکن جب دو مرد گواہی کے لئے نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنایا جائے گا ، اس کی وجہ خود قرآن میں مذکور ہے کہ ایک سے غلطی ہوجائے تو دوسری اسے یاد دلا دے گی۔

غلطی ہونے کے اسباب مختلف ہوسکتے ہیں، کبھی اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عورت معاملے کی تمام باریکیوں اور تقاضوں کا احاطہ نہیں کرپاتی اور اس کے ذہن میں وہ بات پوری طرح واضح نہیں ہوتی ، اس موقع پر دوسری عورت اسے یاد دلا دے گی ، غلطی ہونے کی دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ عورت کی فطرت میں انفعالیت اور جذباتیت ہے

---

(۱) البقرۃ:۲۸۰۔

اور یہ عورت اور بچے پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل وکرم ہے اور عورت کی اس فطرت کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ایک معاملے میں اس کی فطرت کچھ ہو اور دوسرے میں کچھ اور، گواہی کے معاملے میں انفعالیت سے پاک ہونے اور جذباتیت کے بغیر واقعات سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔(۱)

غرضیکہ صرف ایک عورت کی گواہی ناکافی ہونے کی دو وجہ ہے ایک یہ کہ اس کا دائرہ کار گھر ہے، اس سے اندرون خانہ کی ذمہ داریاں متعلق ہوتی ہیں، تجارتی اور کاروباری دنیا سے اس کا تعلق بہت کم ہوتا ہے، اس لئے باہر کی دنیا کے معاملات میں ان کے اندر دقیقہ رسی کی کمی ہوتی ہے، اس لئے ان کے مغالطہ میں پڑنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے؛ البتہ گھریلو اور عورتوں کے معاملات میں ان کا ذہن بہت تیز اور یادداشت بڑی اچھی ہوتی ہے، اس لئے اس طرح کے معاملات میں اس کی گواہی کی بڑی اہمیت ہے اور تنہا اس کی گواہی کافی ہے۔

دوسرے یہ کہ جذبات کی فروانی، معاملہ فہمی پر اثر انداز ہوتی ہے، جس کی وجہ سے واقعات کو اچھی طرح سمجھنا اور یاد رکھنا ان کے لئے مشکل ہوتا ہے؛ چنانچہ ماہرین نفسیات کا اس پر اتفاق ہے کہ خواتین میں کسی ایسی ذمہ داری کی صلاحیت قدرے کم پائی جاتی ہے جس میں ذہنی محنت، توازن واعتدال اور غیر جانب دارانہ فیصلے کی ضرورت ہو، ان کے اندر حقائق کے برعکس جذباتی فیصلے کا زیادہ رجحان پایا جاتا ہے، ان میں قوت فیصلہ کی کمی ہوتی ہے اور واقعات کے بیان میں ان میں مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی کی صفت غالب ہوتی ہے؛ حالاں کہ کسی معاملہ میں گواہی کے لئے ضروری ہے کہ واقعات کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے اور جذبات وتعصّبات سے بالا ہوکر مطالعہ اور مشاہدہ کیا جائے۔

ڈاکٹر ہارڈنگ اپنی کتاب "The Way of Allwomen" میں رقمطراز ہے کہ :

> عورتوں کے لئے مشکل مقام وہ ہوتا ہے جہاں ان سے کہا جائے کہ وہ کسی مسئلے کی جزئیات کو پوری صحت کے ساتھ بیان کریں۔(۲)

یہی وجہ ہے کہ عورتیں تعلیمی زندگی میں حساب وغیرہ میں بہت کم دلچسپی رکھتی ہیں، بعض لوگوں نے دونوں صنفوں کے تعلیمی رجحانات پر ریسرچ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عام طور پر لڑکے حساب، سیاسیات، معاشیات، سائنس اور تکنیکی علوم میں بہتر استعداد کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس کے برعکس لڑکیاں آرٹ، معاشرتی علوم، مذہب اور لسانیات سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں، ہائی اسکول کے متعدد گروپس پر نفسیاتی ٹیسٹ کرنے کے بعد سی، سی، مامگیز نے لکھا ہے کہ :

---

(۱) فی ظلال القرآن: ۷۸۲۔ (۲) دیکھئے: عورت — اسلام اور جدید سائنس: ۳۶۶، از: حکیم محمد طارق محمود چغتائی۔

لڑکوں میں تحقیق وجستجو، تخلیق وایجاد، اشیاء کی ماہیت کا ادراک، مہم جوئی، ذہانت، جرأت اظہار اور حقوق کے لئے جدوجہد کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، جب کہ لڑکیاں قدرے کمزور دل، لگے بندھے کام کاج، روایت پسندی، جذبہ ہمدردی اور جمالیاتی حسن میں لڑکوں سے آگے ہیں۔(۱)

اور ٹائمز آف انڈیا (۱۸؍جنوری ۱۹۸۵ء) میں یو، پی، آئی کے حوالہ سے ایک رپورٹ شائع ہوئی جس کے الفاظ یہ ہیں :

عورتوں کے مقابلے میں مردوں کے اندر اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اسے ترتیب دے سکیں اور عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں، یہ بات ایک روسی سائنس دان نے کہی، ڈاکٹر ولادیمیر کونودگوف نے تاس نیوز ایجنسی کو بتایا کہ مرد ریاضیاتی موضوعات پر چھائے ہوئے ہیں، اس کی وجہ ان کے اندر حافظہ کی خصوصیت ہے اور صنف قوی لسانی مواد کو ترکیب دینے اور استعمال کرنے میں زیادہ مشکل محسوس کرتا ہے۔(۲)

اور جب حیاتی طور پر عورت کی یادداشت میں کمی ہے تو ایک مرد کی جگہ پر دو عورتوں کی گواہی ضرورت کی بنیاد پر ہے، فضیلت کی بنیاد پر نہیں، اسی کے ساتھ یہ ذہن نشیں رہے کہ مرد میں یادداشت اور قوت فیصلہ کی صلاحیت ایک اضافی صفت ہے، اس کی وجہ سے اسے کلی فضیلت حاصل نہیں ہے، دوسری نوعیت کی اضافی صفت خود عورت میں موجود ہے، اللہ عزوجل نے ہر ایک کو بعض ایسی صلاحیتوں سے نوازا ہے جو دوسرے میں نہیں ہے، اس لئے کسی کو حقیر اور کمتر اور دوسرے کو برتر سمجھنا درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۔ (۳)

اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو، جو کچھ مردوں نے کمایا ہے، اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے، اس کے مطابق اس کا حصہ ہے اور اللہ سے اس کے فضل کی دُعا مانگتے رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

(۱) دیکھئے: عورت — اسلام اور جدید سائنس: ۳۶۶، از: حکیم محمد طارق محمود چغتائی۔
(۲) حوالۂ سابق: ۱۰۰۔ (۳) النساء: ۳۲۔

لہٰذا جسے جو ملا ہے اسے صحیح طریقے پر استعمال کر کے اللہ کی بندگی میں مشغول رہے اور انسانیت اور تمدن کی تعمیر میں اپنا مطلوبہ کردار ادا کرے اور اللہ عزوجل نے جس خاص کام کے لئے اسے پیدا کیا ہے، اس میں اپنے آپ کو لگادے کہ اسلام کی نگاہ میں رنگ ونسل اور جنس کی کوئی حیثیت نہیں ہے؛ بلکہ کامیابی وناکامی، فضیلت وبزرگی اور حقارت وپستی، فکر کی سلامتی اور عمل کی درستگی سے وابستہ ہے، اس لئے ایک عورت بھی مادی اور روحانی اعتبار سے ان تمام بلندیوں کو حاصل کرسکتی ہے، جہاں تک مرد کی رسائی ممکن ہے اور مرد وعورت کی ذمہ داریوں میں اور دائرہ کار میں جو فرق رکھا گیا ہے اس کی وجہ تقسیم کار اور انتظام ہے نہ کہ اعزاز اور امتیاز، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے :

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ (۱)

جس نے بھی ایمان کی حالت میں اچھا کام کیا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت تو ہم اسے پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ان کے بہتر کاموں کا ضرور اجر وثواب عنایت کریں گے۔

تعلیم کتابت

اسلام میں مرد وعورت کی تفریق کے بغیر ہر ایک کے لئے حصول علم کو ایک دینی فریضہ قرار دیا گیا ہے اور عورتوں کے لئے خصوصی طور پر تعلیم کی ترغیب دی گئی اور اس کی اہمیت بیان کی گئی ہے، تاکہ علم کے زیور سے آراستہ ہو کر وہ ایک بہتر ماں، بیوی، بہن اور بیٹی ثابت ہوں اور ایک اچھے خاندان کی تشکیل کرسکیں اور ان کے ذریعہ ایک صالح معاشرہ وجود میں آئے اور تعلیم کے سلسلے میں ان پر کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں؛ بلکہ مردوں کی طرح تمام مفید علوم کے دروازے ان کے لئے بھی کھلے ہوئے ہیں، حضرت شفاء بنت عبداللہ کہتی ہیں، وہ ایک دن حضرت حفصہؓ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ :

الا تعلمين هذه رقية النملة كما علمتيها الكتابة ۔ (۲)

جس طرح تم نے ان کو کتابت سکھائی ہے، کیوں نہ تم ان کو مرض نملہ کی دُعا سکھادیتی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں تمام علوم میں مردوں کی طرح بہت سی عورتوں کا نام بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور متعدد خواتین نے کتابت وخطاطی میں بھی نام پیدا کیا ہے۔ (۳)

اور جن روایتوں میں عورتوں کو فن کتابت سکھانے سے منع کیا گیا ہے، وہ بے اصل اور من گھڑت ہیں۔ (۴)

---

(۱) النحل: ۹۷۔ (۲) ابوداؤد: ۳۸۸۷، مسند احمد: ۲۷۰۹۵۔

(۳) دیکھئے: خواتین اسلام کی دینی وعلمی خدمات، از: قاضی اطہر مبارکپوری۔

(۴) دیکھئے: عون المعبود: ۱۰/ ۲۶۸، سلسلة الاحاديث الضعيفة: ۲۰۱۷۔

شیخ البانی نے مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

حق یہ ہے کہ کتابت وقرأت اللہ کی نعمتوں میں سے ایک اہم نعمت ہے اور دوسری نعمتوں کی طرح اس نعمت کا مقصد بھی یہ ہے کہ اسے اللہ کی اطاعت میں استعمال کیا جائے ـــــ لہٰذا والدین کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی بچیوں کو اس سے محروم رکھیں، بشرطیکہ اسی کے ساتھ انھیں اسلامی اخلاق وآداب سے بھی آراستہ کریں، جیسا کہ یہی حکم بچوں کے سلسلے میں ہے، اور اس معاملے میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور اصل ضابطہ یہ ہے کہ جو مردوں کے لئے واجب ہے، وہ عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے اور جو مردوں کے لئے جائز ہے، وہ عورتوں کے لئے بھی جائز ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے، جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''انما النساء شقائق الرجال'' (عورتیں مردوں کے برابر ہیں)، لہٰذا مرد و عورت کے درمیان کسی معاملے میں تفریق کرنا جائز نہیں ہے اور الا یہ کہ اس کے لئے کتاب وسنت میں کوئی صراحت ہو اور مذکورہ مسئلے میں اس طرح کی کوئی صراحت نہیں؛ بلکہ صراحت اس کے برخلاف ہے۔(۱)

● ● ●

(۱) سلسلة الاحاديث الصحيحة: ۱/ ۳۴۷۔

خواتین سے متعلق بعض ارشاداتِ نبوی ﷺ

(بیوی کی تادیب، عورت کی امامت، شیطان کا ساتھ)

ڈاکٹر فہیم اختر ندوی ◆

یوں تو سیرت نبوی ﷺ پورے اسلام کی عملی تشریح واظہار ہے، قرآن کریم کا عملی نمونہ بھی سیرت نبوی ﷺ ہی ہے، سیرت نبوی ﷺ کی تفصیلات اور قرآن کریم کا مجموعہ دونوں اس باہمی موازنہ کے لئے ہمہ وقت دستیاب ہیں؛ لیکن اس سلسلے میں ہمارے پاس ایک ایسی شہادت موجود ہے، جو اس لئے سب سے مستند اور معتبر ہے کہ وہ معاصر شہادت ہے اور ایسے فرد کی ہے جو سب سے زیادہ شریک واقعہ ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کی ذہین وفطین بیوی حضرت عائشہؓ کی شہادت ہے، وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں کردار وسیرت نبوی ﷺ کی بابت سوال کرنے والے کو تعجب آمیز لہجے میں قرآن کی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھتی ہیں کہ کیا اس نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟ ''کان خلقه القرآن'' (۱) (رسول اللہ ﷺ کے اخلاق تو سراپا قرآن ہیں)۔

اسلام کی تعلیمات اپنے الفاظ کے ساتھ اگر قرآن کی آیات اور حدیث کے متون میں موجود ہیں تو ان کی مراد ومفہوم اور تشریح وتعبیر سیرت نبوی ﷺ کے آئینہ میں دیکھی جاسکتی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود چند موضوعات ایسے ہیں جن پر سیرت نبوی ﷺ کے اندر مخصوص توجہ اور اہتمام نظر آتا ہے، خواتین اور ان سے تعلق رکھنے والے امور ومعاملات بھی ایسا ہی ایک موضوع ہے۔

'خواتین' انسانی سماج کا نصف حصہ ہیں، اس سماج کے لئے معلم انسانیت اور رحمت عالم ﷺ نے احکام وتعلیمات کا جو مجموعہ عطا فرمایا وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر باب اور اس کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ کا احاطہ کرتا ہے؛ تاکہ وہ مردوں کے ہمدوش رہ کر سماج کی بہتر تعمیر میں حصہ دار بن سکیں، یہ مجموعہ بہت بڑا، ہمہ گیر اور متنوع ہے اور ان کی وجہ سے صنف نازک کو دنیا میں عزت وسربلندی کے ساتھ وہ حقوق اور اختیارات ملے، جن سے انھیں محروم

◆ صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز: مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۴۶۰۱۔

رکھا گیا تھا، اس موضوع پر اسلامی حلقوں میں وسیع علمی ذخیرہ موجود ہے؛ لیکن اسلام کے عطا کردہ بعض احکام کی حکمتوں سے ناآشنائی کے نتیجہ میں ان کی بابت چند غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور سوالات پیدا ہوئے، ذیل کی سطور میں چند ایسے ہی امور کے تعلق سے خواتین کے احکام اور سیرت نبوی ﷺ میں ان کی توضیح وتطبیق پر نظر ڈالی جارہی ہے۔

بیوی کی تادیب

غلط فہمی سے جڑے ایسے ہی چند احکام میں ایک بیوی کی تادیب کا عنوان ہے، یہ مسئلہ اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ اس بابت قرآن کریم کی آیت وارد ہوئی ہے، جس میں مخصوص صورت حال میں بیوی کی تادیب کا حکم ہے، (۱) موجودہ مساواتِ مرد وزن کے ماحول میں اس قرآنی حکم اور اس کے پس منظر نیز اس کی صحیح نوعیت سے ناواقف کچھ کم علموں نے یہ سمجھ لیا کہ اسلام نے شوہر کے ہاتھ میں ڈنڈا تھما دیا ہے، جس سے وہ اپنی بیوی کی تادیب کرتے پھریں اور اگر شوہر ناہنجار وظالم ہو تو اسلام نے بیوی کو اس کی تادیب کا اختیار نہیں دیا ہے، پس یہ عورت پر ظلم ہے، جس کی گنجائش اس ترقی یافتہ زمانہ میں نہیں ہوسکتی ہے، بعض محتاط لوگوں نے یوں الگ راہ نکالنی چاہی کہ قرآن کا یہ حکم عرب کے اس جاہلی اور غیر متمدن سماج کے رواج کی عکاسی ہے، عرب کے قدیم سماج کے لئے تو یہ مناسب حکم تھا، اب یہ قابل عمل نہیں ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اس حکم قرآنی کی نوعیت پر اظہار خیال کریں، ایک بدیہی سوال ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ قرآن کی مکمل عملی تشریح ہے، اور قرآن کی ایک ایک آیت جو آپ ﷺ کے قلب اطہر پر نازل ہوئی، وہ آپ ﷺ کے پیکر عمل میں ڈھل کر سامنے آئی، قرآن کا کوئی چھوٹا سے چھوٹا حکم ایسا نہیں ہے جس پر رسول مقبول ﷺ نے پہلے خود عمل نہ کیا ہو، جب یہ بات پوری طرح طے شدہ ہے، تب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ بیوی کی تادیب کے اس قرآنی حکم پر رسول اللہ ﷺ نے کس طرح عمل کیا، اس حکم کا جو مفہوم اوپر ذکر ہوا اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں سب سے پہلے اس مفہوم کا نمونہ موجود ملتا، پھر تو آپ ﷺ کے دست مبارک میں ایسا ڈنڈا نظر آتا، جس سے آپ ﷺ اپنی بیویوں کی تادیب کررہے ہوتے، آپ ﷺ کی متعدد ازواج تھیں، جو مختلف مزاج اور ماحول سے تعلق رکھتی تھیں، آپ ﷺ کی زندگی ان کے تئیں قرآن کے اس حکم کی سراپا تعمیل ہوتی، تو کیا سیرت نبوی ﷺ میں بیوی کی تادیب کا عنوان اور مثال موجود ہے؟ سچی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سراپا رحمت پاکیزہ حیات میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے، آپ ﷺ کے اندرون خانہ کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات محفوظ ہیں، گھر کے اندر ازواج کے درمیان بعض باتوں پر نوک جھونک؛ بلکہ بعض باتوں پر آپ ﷺ کی

(۱) سورہ نساء، آیت نمبر: ۳۴۔

ناراضگی کے واقعات بھی موجود ہیں، لیکن ایسی ایک مثال موجود نہیں ہے کہ آپ ﷺ — نعوذ باللہ — ڈنڈا لے کر بیوی کی تادیب اور پٹائی کے لئے اٹھے ہوں، تفصیلات تو یہ بتاتی ہیں کہ آپ ﷺ اپنی تمام ازواج کے لئے بے انتہا محبوب شوہر اور سراپا محبت وشفقت تھے، ان کی خوبیوں کو سراہتے، ان کی تعریف کرتے، ان کے لئے محبت وخیرخواہی کا اظہار کرتے، ان کی خواہشات اور شوق کو پورا کرتے اور ان کے حق میں اپنی ذات کو نمونہ بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے، حدیث میں تو یہ ملتا ہے کہ: ''خیر کم خیر کم لاھلہ وانا خیر کم لاھلی'' (۱) (تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے حق میں تم سب سے بہتر ہوں) حدیث میں یہ ہے کہ حضرت صفیہؓ کے کھانے کی آپ خوب تعریف کرتے، خود زمین پر بیٹھ جاتے اور آپ کے گھٹنہ پر پاؤں رکھ کر آپ کی زوجہ اونٹ پر چڑھ جاتیں، صلح حدیبیہ کے نازک ترین موقع پر اپنی زوجہ حضرت اُم سلمہؓ سے مشورہ کرتے اور اس پر عمل کرتے، (۲) حضرت عائشہؓ سے محبت کا یہ عالم ہوتا کہ کھانے میں ہڈی پر اسی جگہ منھ لگاتے جہاں پر حضرت عائشہؓ منھ لگاتیں، ان کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ کرتے، انھیں اپنے پیچھے کھڑا کر کے گھنٹوں حبشیوں کا کھیل دکھاتے، حضرت خدیجہؓ جیسی بیوی کی ایک ایک ادا یاد کرتے، شکر گزاری کا اظہار کرتے، ان کی سہیلیوں کو بھی تحفے بھیج کر دلجوئی کرتے، آپ ﷺ کی تمام ازواج نے آپ ﷺ پر فخر کا اظہار کیا ہے اور آپ ﷺ کی محبتوں کے گن گائے ہیں، ایسے چند نہیں بے شمار واقعاتِ محبت ہیں جو سیرت نبوی ﷺ کے صفحات بکھرے ہیں، ناراضگی کے بعض واقعات بھی موجود ہیں؛ لیکن ان کا اظہار صرف الفاظ میں ہوا ہے، سیرت میں ایک بھی واقعہ ایسا نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے جو قرآن پر سب سے پہلے عمل کرنے والے تھے، زوجہ کی تادیب کے لئے لاٹھی، ڈنڈا یا مار پیٹ کا سہارا لیا ہو، اگر سیرت نبوی قرآن کی تشریح ہے تو اس تشریح میں بیوی کی وہ پٹائی نہیں ملتی جو اس قرآنی حکم سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کے اس حکم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بیوی کی پٹائی کی جائے اور اسے ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا جائے۔

قرآن کے اس حکم کا مطلب سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس سیاق کو دیکھیں جہاں یہ حکم آیا ہے، اور یہ دیکھیں کہ اس آیت کی تفسیر میں نیز احادیث میں اس کی کیا تشریح کی گئی ہے، سورۂ نساء میں جہاں اللہ نے ازدواجی زندگی کے بعض احکام بیان فرمائے ہیں، اس ضمن میں کہا گیا ہے کہ خاندان کا سربراہ اللہ نے مرد کو بنایا ہے، پھر مرد کے بعض اختیارات ذکر کئے گئے ہیں، اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ اگر زوجین کے درمیان نااتفاقی پیدا ہونے لگے تو پہلے مرد کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ افہام وتفہیم کا راستہ اختیار کرے اور گھر کے ادارہ کو صحیح ڈگر پر لائے، اگر اس کے بعد بھی

(۱) سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۳۸۹۵۔ (۲) الفصول فی السیرۃ: ۱۸۷۔

اختلاف برقرار رہے تو پھر دونوں طرف سے حکم طے کئے جائیں اور وہ اس اختلاف کا مناسب حل نکالیں، پس یہاں ازدواجی زندگی میں فیملی کے سربراہ کے ناطے مرد پر ادارہ چلانے کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔

دراصل کسی بھی ادارہ کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے اس کا ایک سربراہ طے کرنا ضروری ہوتا ہے، کسی ملک، کسی حکومت، کسی تنظیم اور کسی ادارہ کو اسی وقت چلایا جاسکتا ہے جب اس کا ایک سربراہ ہو، اسی لئے ملک کا صدر، حکومت کا وزیر اعظم، فوج کا کمانڈر اور تنظیم یا ادارہ کا چیرمین بنایا جاتا ہے، پھر اس سربراہ کو ادارہ چلانے کے لئے زائد اختیارات دیئے جاتے ہیں اور دوسروں پر اس کی تابعداری لازمی کی جاتی ہے، یہ روزمرہ زندگی میں ہر جگہ کا دستور ہے، اس کے بغیر ادارہ نہیں چل سکتا ہے، اب یہ سربراہ کوئی بھی ہوسکتا ہے؛ لیکن جو بھی سربراہ ہوگا، اس کے اختیارات زیادہ ہوں گے اور اس کی بات ماننی ضروری ہوگی۔

خاندان کے ادارہ کے لئے اللہ نے سربراہی کا حق مرد کو دیا ہے؛ کیوں کہ جس طرح اندرون خانہ کے مسائل اور بچوں کی پرورش کی نمایاں قابلیت مرد کے مقابلہ عورت میں زیادہ رکھی گئی ہے، اسی طرح پورے گھر کو چلانے اور بیرونی دنیا سے معاملات کرنے کی صلاحیت عورت کے مقابلہ مرد میں زیادہ رکھی گئی ہے، مرد کی اس سربراہی کے اختیارات میں یہ بتایا گیا ہے کہ دوسرے افرادخانہ اس کی بات مانیں، ازدواجی زندگی کی کامیابی اسی میں ہے، اگر بیوی شوہر کی بات نہیں مانتی ہے، جس کو قرآن کے الفاظ میں 'نشوز' کہا گیا ہے، توشوہر کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ پہلے سمجھائے، پھر اظہار ناراضگی کے لئے خواب گاہ الگ کرلے پھر ضرب سے کام لے، اگر بیوی اطاعت کرنے لگے تو پھر اس کو ستانے کا راستہ نہ ڈھونڈے، (۱) یہ ضرب کیا ہے؟ تفسیر کی کتابوں اور حدیث میں اس کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ رومال سے یا مسواک سے تنبیہ کریں، (۲) یہ گویا تنبیہ کا اظہار ہے نہ کہ پٹائی کا موقع؛ کیوں کہ ان ہی تشریحات میں یہ بھی واضح کردیا گیا ہے کہ کوئی ایسا طریقہ نہ اختیار کیا جائے جس سے جسم پر نشان آجائے یا چہرہ پر اثر ہو، یا جسم کے کسی بھی حصہ کو نقصان پہنچے، اس میں مرد کو تنبیہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، تکلیف اور نقصان پہنچانے کا نہیں۔

اس مفہوم کی مزید تشریح ایک واقعہ سے ہوتی ہے جو حدیث کی کتابوں میں موجود ہے، بعض مہاجر صحابہ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہماری عورتیں مردوں سے دب کر رہتی تھیں، مدینہ میں عورتوں کی دخل اندازی تھی، ہماری عورتیں بھی اس ماحول میں انہی کے نقش قدم پر چلنے لگیں، بعض صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے اس صورت حال کی شکایت کرکے ان کی تنبیہ کرنے کی اجازت مانگی، آپ ﷺ نے اجازت دے دی، تو اسی شب متعدد خواتین نے دربار نبوی ﷺ میں آکر اپنے شوہروں کے رویوں کی شکایت کی، صبح میں آپ ﷺ نے بتایا کہ متعدد عورتوں نے آج

(۱) سورہ نساء، آیت نمبر: ۳۴۔ (۲) تفسیر طبری، متعلقہ آیت، قول ابن عباسؓ، اور حدیث نمبر: ۹۳۸۸۔

شب اپنے شوہروں کی شکایت کی ہے، خدا کی قسم ایسے شوہر تم میں اچھے انسان نہیں ہیں ''لا تجدون اولئک خیارکم ''(۱) رسول کریم ﷺ کی زبان مبارک سے ایسے شوہروں کی یہ توصیف ایک بڑا تازیانہ تھی، اور آپ ﷺ نے واضح فرمادیا کہ اپنی بیویوں پر سختی کرنے والے نہ صرف اچھے شوہر نہیں بلکہ اچھے انسان نہیں ہیں، پس رسول اللہ ﷺ کا ذاتی طرز عمل جو ہر مسلمان کے لئے لازمی اسوہ ہے اور مذکورہ واقعہ میں صحابہ کرام کے رویہ پر آپ ﷺ کا جواب اس مسئلہ کو پوری طرح صاف کر دیتا ہے؛ لہٰذا قرآن کا یہ حکم عورت پر مرد کے کسی ظالمانہ اختیار سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتا ہے؛ بلکہ یہ صرف گھر کے ادارہ کو چلانے کی اس ذمہ داری کا بیان ہے جو اللہ نے مرد پر ڈالی ہے، اور اگر کسی گھر میں مرد ظالم وغلط کار ہے تو اس کی تنبیہ اور سزا کے دیگر تمام راستے کھلے رکھے گئے ہیں، شوہر کی تنبیہ کا اختیار عورت کو اسی طرح نہیں دیا گیا ہے جس طرح کسی بھی ادارہ کے سربراہ کی تنبیہ کا اختیار اس ادارہ کے ملازم کو نہیں دیا جاتا ہے، اور جس طرح رشتوں کے اندر چھوٹے کو بڑے کی تنبیہ کرنے مثلاً بیٹی کو ماں کی تنبیہ کرنے اور بیٹے کو باپ کی تنبیہ کرنے کا اختیار نہیں دیا جاتا ہے۔

عورت کی امامت

عورت کی امامت بھی ان نئے مسائل میں سے ایک ہے، جن پر موجودہ دور میں سوالات اُٹھائے گئے ہیں اور کم علمی کے نتیجہ میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسلامی لٹریچر میں 'امامت' دو معنوں میں استعمال ہوتی ہے، ایک نماز کی امامت اور دوسرے قوم کی امامت وسربراہی، پہلا مفہوم عبادات سے متعلق ہے اور دوسرے کا تعلق سیاسیات سے ہے، پہلے ہم سیاسیات کے میدان کی امامت پر بات کرتے ہیں۔

سیاست کے بارے اسلام نے کسی متعین نظام اور طریقہ کی تعلیم نہیں دی ہے، صرف ان ہی اُصولوں اور رہنما ہدایات کا ذکر کیا ہے جو کسی بھی اجتماعیت کے لئے ضروری ہوتی ہیں، مثلاً امر بالمعروف ونہی عن المنکر، عدل وانصاف کا قیام، جرائم پر گرفت، سزاؤں کی تنفیذ، عوام کی فلاح وبہبود، قانون کی نظر میں سب کی برابری، جوابدہی اور بیت المال کے اندر امانت داری وغیرہ، پھر سیاسی نظام صدارتی ہو کہ پارلیمانی، وفاقی ہو کہ وحدانی، الیکشنی ہو کہ نیابتی وتقرراتی، ہر نظام کی گنجائش ہے، دورِ خلافتِ راشدہ میں بھی انتخابِ خلیفہ کے مختلف طریقے رائج رہے، حضرت عثمانؓ کے انتخابِ خلیفہ کے وقت چھ رکنی کمیٹی کے کنوینر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے مدینہ میں بڑے پیمانے پر رائے شماری کی تھی، اور اِس میں گھروں کی پردہ نشین خواتین سے بھی رائیں لی گئی تھیں، حضرت شفاءؓ بنت عبداللہ کو خود رسول کریم ﷺ نے مدینہ کے بازار کی نگرانی پر مقرر فرمایا تھا، اور آپ ﷺ نے مکہ کے اہم سفر کے

---

(۱) سنن نسائی، حدیث نمبر: ۹۱۲۲۔

دوران صلح حدیبیہ کے نازک ترین موقع پر اپنی زوجہ حضرت اُم سلمہؓ کے مشورہ پر اقدام فرمایا تھا، ان اُمور سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاست خواتین کے لئے شجر ممنوعہ نہیں ہے، اور مردوں کی طرح خواتین بھی دیگر فرائض وآداب کی رعایت کے ساتھ ایسی ذمہ داریاں اُٹھاسکتی ہیں۔

بحث اس وقت اہمیت اختیار کرجاتی ہے جب امامت عظمیٰ یعنی ملک کی اعلیٰ ترین سربراہی کا مسئلہ درپیش ہو، حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں یمن کی ملکۂ سبا خاتون تھیں اور پیغمبر کے دربار میں اس کی حاضری اور قبول اسلام کا واقعہ قرآن نے نقل کیا ہے، بہرحال امامت عظمیٰ یعنی صدارت عالیہ کے منصب پر خواتین کی تقرری پر اہل علم کی رائیں مختلف ہیں، جو رائے اس منصب سے خواتین کو روکتی ہے، اس کے پیش نظر سماج میں خواتین کا زیادہ اہم کردار ہے جو بحیثیت نسل انسانی کی ماں کے خالق انسانیت نے انھیں عطا کیا ہے، ان کی تائید اس حدیث رسول ﷺ سے بھی ہوتی ہے کہ ''وہ قوم فلاح یاب نہیں ہوسکتی جس نے اپنا زمام اختیار کسی خاتون کو سونپ دیا ہو''۔(۱)

جہاں تک نماز کے اندر امامت کا مسئلہ ہے، اس مسئلہ پر یورپ وامریکہ میں زیادہ واویلا مچایا گیا ہے، جس کی گونج ان کے ہمنواؤں کے یہاں برصغیر وغیرہ میں بھی سنائی دیتی رہی ہے، اس مسئلہ کو یوں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسجدوں کے اندر مرد نماز کی امامت کرتے ہیں، عورتیں امامت نہیں کرتی ہیں، تو یہ مساوات کے خلاف ہے؛ چنانچہ امریکہ میں بعض خواتین نے مسجد کے اندر جاکر مرد وعورت کی مشترک نماز کی امامت انجام دی۔

دراصل اس مسئلہ میں کئی مسئلوں کو الجھا دیا گیا ہے اور عورت کی عزت اور اس کے وقار کے تحفظ کو غلط طریقہ سے اس کی عبادت اور مساوات کے مسئلہ سے جوڑ دیا گیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام میں عورت کو اسی طرح عبادت کا حق ہے جس طرح مردوں کو حق ہے، عورت کو بعض دوسرے مذاہب کی طرح عبادت گاہوں میں داخلہ سے کبھی نہیں روکا گیا ہے؛ بلکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں وہ مسجد نبوی کے اندر باجماعت نماز پڑھتی تھیں، اور اب تک اس پر عمل نہ صرف حرمین میں بلکہ پوری دنیا میں موجود ہے، عبادات کے سلسلہ میں مرد اور عورت کے درمیان ایک فرق اس طرح رکھا گیا ہے کہ مرد پر ایک ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور عورت کو اس ذمہ داری اور لزوم سے رخصت دی گئی ہے، وہ ذمہ داری یہ ہے کہ مرد پر پانچوں وقت کی روزانہ نمازیں مسجد کے اندر آکر جماعت کے ساتھ ادا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے؛ لیکن عورت کو اس پابندی سے رخصت دی گئی ہے کہ وہ مسجد میں بھی پڑھ سکتی ہے اور گھر کے اندر بھی، ذرا سوچئے! اگر عورت پر بھی یہ لازمی ہوتا کہ وہ روزانہ پانچوں وقت گھر سے نکل کر مسجد میں آکر جماعت ہی سے نماز پڑھے ورنہ اس کا ثواب گھٹ جائے گا اور اللہ کی ناراضگی ملے گی جس طرح مرد کے لئے ہے، تو اس سے عورت کو دشواری ہوتی یا آسانی؟ آج تو بہت سے نمازی مرد اس سہولت پر عمل کرنے لگ گئے ہیں کہ وہ گھر کے اندر نماز

(۱) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۴۲۵۔

پڑھ لیتے ہیں؛ حالاں کہ مردوں کو یہ سہولت نہیں دی گئی ہے، عورتوں کے لئے یہ سہولت دراصل اللہ کی جانب سے صنف نازک پر ایک بڑا احسان اور کرم ہے جس کا نمونہ عبادات اور فرائض کے مختلف احکام میں موجود نظر آتا ہے۔

عبادات کے سلسلہ میں شریعت کا ایک حکم یہ ہے کہ مردوں کی عبادتیں علاحدہ ہوں گی اور عورتوں کی علاحدہ؛ چنانچہ نماز کے اندر دونوں کی صفیں علاحدہ علاحدہ ہوں گی، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مسجد نبوی کے اندر ایسی ہی صفیں بنتی تھیں، اور آپ ﷺ نے اسی کی تاکید فرمائی تھی، (۱) یہ حکم بھی دراصل عورتوں کی سہولت اور آرام نیز ان کے تحفظ کے پیش نظر تھا، اسی لئے آپ ﷺ نے یہ بھی حکم فرمایا تھا کہ جماعت کی نماز ختم ہونے کے بعد مرد ٹھہریں رہیں، اور پہلے خواتین مسجد سے نکل جائیں، تب مرد باہر نکلیں؛ لہٰذا ایسی نماز اللہ کو پسند نہیں ہوگی جس میں مرد اور عورت خلط ملط ہو کر صف بنائیں، امریکہ میں ایسی ہی نماز پڑھی گئی تھی جو سراسر غلط ہے، عورتوں کے لئے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ضروری نہیں ہے؛ لیکن وہ جماعت میں شامل ہوسکتی ہیں، اگر وہ اپنی علاحدہ جماعت بنانا چاہتی ہیں تو ایسا بھی کر سکتی ہیں، اس کی بھی ممانعت نہیں ہے، فقہ کی کتابوں میں عورتوں کی باجماعت نماز کے مسائل تفصیل کے ساتھ موجود ہیں؛ لیکن ان پر لازم نہیں کیا گیا ہے کہ وہ کسی جگہ اکٹھی ہوں اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں، جیسا کہ مرد پر لازم کر دیا گیا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ جمعہ اور عیدین کی نمازیں جو جماعت کے بغیر نہیں ہو سکتیں، عورتوں پر فرض نہیں کی گئیں کہ اس کی وجہ سے ان پر وہاں آنے کی پابندی ہو جائے گی؛ البتہ ان نمازوں میں عورتوں کو شرکت کی ہمیشہ اجازت ہے۔

پس حاصل یہ ہے کہ مسجد کے اندر کی باجماعت نماز میں خواتین شریک ہوسکتی ہیں، جہاں ان کی صفیں مردوں اور بچوں کی صفوں کے بعد علاحدہ ہوں گی، خواتین اپنی مخصوص جماعت بھی بنا سکتی ہیں، جو ان کا اختیاری عمل ہوگا، ان کی مجبوری نہیں ہوگی؛ لیکن ایسی جماعت جس میں عورت امامت کر رہی ہو اور اس کے پیچھے مرد اور عورتیں نماز پڑھ رہی ہوں، اسی طرح ایسی جماعت جس میں صفوں کے اندر مرد اور عورت باہم ملے جلے اور خلط ملط ہو کر کھڑے ہوں، درست نہیں ہے؛ کیوں کہ نماز اللہ کے لئے پڑھی جاتی ہے، اور اللہ کے رسول ﷺ نے ایسی نماز کی تعلیم نہیں دی ہے۔

شیطان کی رفاقت

عورت کے بارے میں بڑے غلط قسم کے تصورات رائج رہے ہیں، یونان کے تعلیم یافتہ فلاسفہ نے بھی عورت کو انسانیت کے ارفع مقام سے نیچے رکھا، کئی مذاہب نے اسے گناہ کی جڑ اور شیطان کا آلہ قرار دیا، انسانی تاریخ میں اسلام نے قرآن اور حدیث کے صفحات پر پہلی مرتبہ عورت کے مقام انسانیت اور مقام عزت وحیثیت کو ثابت کیا اور عورت کو حقوق واختیارات دیئے، سیرت نبوی کے اندر اس سلسلہ میں تفصیلی ہدایات ملتی ہیں؛ لیکن

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۸۹۶۔

سیرت نبوی ہمیں خواتین کے تئیں ایک اور پہلو کی بابت آگاہی دیتی ہے اور اس آگاہی میں رہنمائی کا سامان ہے اور خواتین کے لئے خطرہ سے حفاظت کی بیداری بھی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آنے والے زمانہ میں آزمائش اور فتنہ کا ایک بڑا ذریعہ عورت ہوگی، (۱) گویا عورت کا استعمال کر کے طرح طرح کے فتنے پیدا کئے جائیں گے، اس ارشاد میں جہاں اس بات کا انکار نہیں ہے کہ فتنہ وآزمائش کے دیگر وسائل بھی کارکرد ہوں گے، وہیں اِس کی آگاہی ہے کہ خواتین کا منفی استعمال کرنے والے زیادہ ہوں گے، ظاہر سی بات ہے کہ اللہ کے احکام سے بغاوت، فحاشی کا پھیلاؤ، جنسی واخلاقی انارکی اور بے راہ روی کے کاموں کو فروغ دینا شیطان کا پسندیدہ کھیل ہے اور اس کی پوری ٹیم انسانیت کو تباہی کے غار میں ڈھکیلنے کے لئے جی جان سے لگی ہوئی ہے، شیطان کو اپنے ان کھیلوں میں خواتین کا استعمال زیادہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے؛ چنانچہ وہ اس بات کی تاک میں لگا رہتا ہے کہ کس طرح بنت حواء کو اپنے دام تزویر میں لائے اور پھر اس کے ذریعہ اپنا شکار کرتا پھرے، اگر عورت اپنی ذات کو اس کی بدنگاہیوں کا ہدف نہ بننے دے تو وہ محفوظ ہوجائے گی، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی خاتون باہر نکلے تو وہ جاذب نظر زینت کو پوشیدہ رکھے، اور نماز کے لئے بھی نکلے تو خوشبو کا استعمال نہ کرے؛ بلکہ اگر پھیلنے والی خوشبو لگی ہو تو اسے دھوڈالے؛ (۲) کیوں کہ اس طرح شیطان لوگوں کی توجہ اس خاتون کی طرف مبذول کرتا ہے اور غلط خیالات کی پرورش کراتا ہے، اسی تناظر میں یہ حدیث ہے کہ جب عورت باہر نکلتی ہے تو شیطان اچک اچک کر اسے دیکھتا ہے، (۳) یہی دراصل شیطان کی وہ رفاقت ہے جسے وہ فتنہ گری اور فحاشی کے لئے اپنے آلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے اس فتنہ اور اس کے آلہ سے آگاہ فرما کر خواتین اور مردوں دونوں کو اس سے محفوظ رہنے کی تعلیم دی ہے، اسلام جس نے خواتین کو عزت ووقار بخشا ہے، شیطان کے اس زبردست فتنہ سے اسے محفوظ رکھنے کے لئے خطرات کی نشاندہی کرتا ہے، اور اسے عزت وسربلندی کے مقام بلند سے نیچے گرنے نہیں دینا چاہتا ہے، فحاشی اور جنسی واخلاقی انارکی ہی شیطان کا مقصود ہے، اور اس کا نتیجہ وقتی لذت کے پردہ میں خطرناک استحصال وکسمپرسی، تشدد وزیادتی بلکہ قتل وغارت گری ہے، جس کا مشاہدہ موجودہ دنیا میں کھلی آنکھوں سے روزانہ کیا جارہا ہے، اس انجام تک پہنچانے کے لئے شیطان خصوصیت کے ساتھ عورت کو نئے نئے ناموں سے سبز باغ دکھاتا ہے، اور اپنے اس مشن میں عورت کو اپنا رفیق بناتا ہے، شیطان کی یہ رفاقت ہمیشہ تباہی اور بربادی ہی کے انجام سے دوچار کرے گی، حدیث شریف میں اس تباہی سے محفوظ رہنے کے لئے شیطان کی رفاقت سے اسے روکا گیا ہے۔

● ● ●

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۷۴۶۔ (۲) سنن نسائی، حدیث نمبر: ۹۳۶۲۔ (۳) سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۱۱۷۳۔

رُوداد
بین الاقوامی سیرتِ نبوی سیمینار

مولانا محمد عبید اختر رحمانی ◆

ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہوا اور انگریزوں نے حکومت وسلطنت کی باگ ڈور سنبھالی تو انھوں نے ایسا نظام تعلیم نافذ کیا جس کو پڑھ کر مسلمان اپنے دین ومذہب پر قائم نہ رہ سکیں اور انگریزی کلچر وتہذیب میں ڈھل کر دل ودماغ کے اعتبار سے وہ انگریز ہی بن جائیں، اس کے جواب میں چند درویش صفت اور خضر خصال بزرگوں نے اسلامی تعلیم وتہذیب کو برقرار رکھنے کے لئے نئے تعلیمی نظام کا اعلان کیا جسے ''مدرسہ'' کا نام دیا گیا'' نہ جانے ان اللہ والوں نے کس اخلاص، للّٰہیت اور قبولیت کی گھڑی میں مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی کہ یہ مدرسہ تحریک آگے چل کر ہندوستان کی سب سے مستحکم اور مضبوط تحریک بن گئی اور اب گاؤں گاؤں میں مدرسہ قائم ہے اور باوجود خامیوں اور کمزوریوں کے ان ہی مدارس کی بدولت آج بھی سیاسی خستہ حالی ومعاشی پست حالی کے باوجود دینی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمان بہت سے مسلم ملکوں سے بہتر حالت میں ہیں۔

مدارس پر ایک طویل عرصہ گذرنے کے بعد علماء نے محسوس کیا کہ اب ان مدارس سے ماضی کی طرح کے باصلاحیت علماء نہیں نکل رہے ہیں، اس وجہ سے مدارس میں مختلف علوم وفنون میں تخصصات (مہارت) کے شعبے قائم کئے گئے، جیسے تخصص فی الفقہ، تخصص فی الحدیث، تخصص فی الادب وغیرہ، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی جن کو اللہ نے عصر حاضر کے مسائل کو سمجھنے اور ان مسائل کا شرعی حل تلاش کرنے اور شرعی حل کو آسان زبان وبیان میں عوام تک پہنچانے کا خداداد ملکہ عنایت کیا ہے، انھوں نے وقت کی اس ضرورت کو سمجھا اور شوال 1420 ہجری، مطابق جنوری 2000ء میں المعہد العالی الاسلامی کا قیام عمل میں آیا، مقصد یہ تھا کہ مختلف علوم اسلامی میں افراد کار کو تیار کیا جائے اور باصلاحیت علماء کے مدارس سے نہ نکلنے کی ایک جو عام شکایت ہے، اس کا ازالہ کیا جائے، زمانہ شناس داعیوں کو تیار کیا جائے اور اس کے لئے ان کی تربیت کی جائے، علماء کو نہ صرف انگریزی زبان بلکہ جدید علوم سے بھی باخبر کیا جائے، ان سب کے ساتھ ایک تحقیق وتالیف کا شعبہ بھی قائم کیا جائے، جہاں اسلامی علوم وفنون پر تحقیق وریسرچ کا کام اعلیٰ پیمانے پر انجام دیا جائے، اور ان سب اُمور کے ساتھ عصری تعلیم یافتہ افراد کی دینی تعلیم وتربیت کا بھی بندوبست کیا جائے۔

◆ شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

معہد کے قیام کو بہت زیادہ عرصہ نہیں گذرا، محض پندرہ سال ہورہے ہیں؛ لیکن اس مختصر مدت میں معہد نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، اس پر بہت سے قدیم مدرسوں کو بھی حیرت، اور رشک ہے، یہاں اب تک ڈھائی سو سے زیادہ علمی وتحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں، جن کے صفحات تقریباً 80 ہزار ہوتے ہیں، ان مقالات میں سے 40 مقالات کی اشاعت ہوچکی ہے اور بقیہ کے لئے کوشش جاری ہے، کوشش یہ ہے کہ معہد کا اپنا ذاتی پریس ہو تاکہ مقالات کی اشاعت بغیر کسی وقفہ کے جاری رہے، خدا نے جس طرح دیگر عزائم کو شرمندۂ تعبیر کیا ہے اور خواب وخیال کو حقیقت کا رنگ پہنایا ہے، یہ خواب بھی انشاءاللہ جلد ہی شرمندۂ تعبیر ہوگا۔

معہد سے اسی قلیل مدت میں فتاویٰ ظہیریہ اور فتاویٰ سراجیہ پر تحقیقی کام ہوا ہے، فتاوی ہندیہ (فتاوی عالمگیری) پر تحقیق کا کام زور وشور کے ساتھ جاری ہے، یہ کتابیں جواب تک مخطوطات کی صورت میں محض چند کتب خانوں کی زینت تھیں، انشاءاللہ بانی معہد کی فکر اور طلبہ معہد کی تحقیق سے بہت جلد منظر عام پر آئیں گی، فقہ حنفی کی اہم کتاب ''بدائع الصنائع'' ہے، اس کتاب میں موجود احادیث وآثار کی تخریج کا کام بڑی دقت نظری سے انجام دیا جارہا ہے اور اُمید ہے کہ جلد ہی یہ بھی شائقین کے ہاتھوں میں ہوگی۔

معہد کے شعبہ جات کی تفصیل اس طرح ہے :

تخصص فی علوم القرآن۔

تخصص فی علوم الحدیث۔

تخصص فی الفقہ والافتاء۔

شعبۂ انگریزی تعلیم برائے فضلاء مدارس۔

شعبہ تحقیق وتالیف۔

تربیت اسلامک فائنانس (اسلامک بینکنگ، اسلامک انشورنس، اسٹاک ایکسچینج)۔

عصری تعلیم یافتہ افراد کی دینی تعلیم وتربیت کے لئے مختصر مدتی عالم کورس'' مدرسہ عبداللہ بن مسعودؓ''۔

دعوت وتبلیغ کے لئے دو شعبے ہیں

(1) سنٹر فار سپیس اینڈ ٹروُمیسیج۔

(2) ستیہ پرکاش (سوشل میڈیا برائے تعارف اسلام)۔

قرآن مجید سیمینار ۲-۴ر ربیع الاول ۱۴۳۲ھ، 6-8 فروری 2011

معہد کے قیام پر دس سال گذرنے کے بعد بانی وناظم معہد اور دیگر ذمہ داران نے قرآن مجید پر بین الاقوامی سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا، یہ فیصلہ بڑا ہی مبارک تھا، قرآن مجید سیمینار میں ملک وبیرون ملک سے علم

وتحقیق کی دنیا کے نامور افراد شریک ہوئے ، بالخصوص عالم اسلام کے نامور محدث شیخ محمد محمد عوامہ کی شرکت سے قرآن مجید سمینار کو چار چاند لگ گئے ،قرآن مجید سے متعلقہ موضوعات پر پُرمغز مقالات پیش کئے گئے ،ان مقالات نے جہاں عوام الناس وخواص میں قرآن مجید کی طرف توجہ کو عام کیا، وہیں قرآن مجید کی خدمت کے سلسلے میں نئی سمتوں کی طرف اشارہ بھی کیا،قرآن مجید سیمینار میں جن مرکزی عنوانات کے تحت مقالے لکھے گئے ،صرف ان کو ہی دیکھ کر سمینار میں پیش کئے گئے مقالات کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے :

قرآن مجید اور دیگر مذہبی کتابیں	:	7	مقالات
قرآن مجید اور جدید سائنس	:	13	مقالات
قرآن مجید کی تعلیمات عصری افکار کے تناظر میں	:	14	مقالات
قرآن مجید اور غلط فہمیاں	:	10	مقالات
ہندوستانی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم	:	4	مقالات
دینی مدارس وجامعات میں قرآن مجید کی تدریس	:	9	مقالات
عصری تعلیمی اداروں اور عوام الناس میں قرآن کی تعلیم	:	4	مقالات
قرآن مجید سے متعلق متفرق عنوانات	:	3	مقالات

سیرت نبوی سمینار ۱۲تا۱۴؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ، 21 تا 23 فروری 2016ء

قرآن مجید سیمینار کی طرح معہد کے قیام پر پندرہ سال گذرنے پر بانی وناظم معہد اور دیگر ذمہ داران نے سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا ،قرآن کے بعد بظاہر تو حدیث کا نمبر ہے اور حدیث پر سیمینار منعقد ہونا چاہئے ؛لیکن مناسب سمجھا گیا کہ قرآن کے بعد حامل قرآن (ﷺ) پر سمینار رکھا جائے ،دورِ حاضر میں سوشل میڈیا پر جس طرح پیغمبر اسلام کو ہدف طعن وتنقید بنایا جاتا ہے، اس کے لئے ضروری تھا کہ روایتی جلسوں سے ہٹ کر آنحضرت ﷺ کی سیرت پر ایک علمی وتحقیقی سمینار منعقد کیا جائے ،جس میں معترضین کے اعتراضات کا جواب بھی ہو اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات کی نشر واشاعت بھی اور آپ کا خوبصورت کردار بھی ہر ایک کے سامنے آسکے، اس مقصد کے لئے آپ ﷺ کی انسانیت نوازی کے پندرہ پہلوؤں پر 20 تا 24 صفحات پر مشتمل تحقیقی وعلمی کتابچے تیار کئے گئے، ان کتابچوں کی زبان آسان رکھی گئی ؛ تاکہ عوام سمجھ سکیں ، ہر بات مدلل اور باحوالہ لکھنے کا اہتمام کیا گیا، ان پندرہ رسائل کو فی الحال اُردو زبان میں شائع کیا گیا ہے ؛لیکن ارادہ ہے کہ ان کو انگریزی ، ہندی اور ہندوستان کی متعدد علاقائی زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کیا اور کرایا جائے ،مختلف اداروں اور تنظیموں نے علاقائی زبان میں ترجمہ اور اشاعت کا کام سعادت سمجھ کر اپنے ذمہ لیا ہے۔

سیرت نبوی پر سمینار کے انعقاد کے فیصلے کے بعد پہلا مرحلہ موضوعات کا انتخاب تھا، سیرت نبوی سمینار کے لئے چار مرکزی عنوانات منتخب کئے گئے اور ان چار مرکزی عنوانات کے تحت تقریباً چالیس موضوعات کا احاطہ کیا گیا۔

سیرت نبوی سمینار کے مرکزی عنوانات

حیاتِ طیبہ اور معاندین کے اعتراضات۔
پیغمبر اسلام ﷺ اور عصر حاضر کے مسائل۔
پیغمبر اسلام ﷺ اور دیگر مذہبی کتابیں۔
پیغمبر اسلام ﷺ اور غیر مسلموں کے اعترافات۔

قرآن مجید سیمینار کا تجربہ پیش نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کیا گیا کہ اس مرتبہ سمینار کا انعقاد معہد میں ہی عارضی ہال بنا کر کیا جائے؛ کیوں کہ شہر میں کسی فنکشن ہال میں سیمینار کا انتظام ایک وقت کے لئے تو مناسب ہوتا ہے؛ لیکن اگر متعدد نشستیں ہوں تو پھر شرکاء سمینار کی آمد ورفت اور انتظامات میں بدنظمی کا پورا امکان رہتا ہے، معہد میں مہمانوں کی گنجائش محدود تھی؛ لہٰذا صرف چیدہ چیدہ حضرات کو شرکت کی دعوت دی گئی اور معہد کے صرف ان ہی طلبہ کو شرکت کا دعوت نامہ بھیجا گیا جو 2011ء کے بعد کے فارغ ہوں، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے تعلیم کے نظم میں خلل نہ پڑنے کے لحاظ سے اساتذہ اور طلبہ معہد کو سیمینار کی تیاریوں سے آزاد رکھا اور ایک دو فرد پر جن کا تعلیمی نظام سے تعلق نہیں تھا، ان کو سمینار کی تیاری کی ذمہ داریاں سپرد کر دیں، اس تدبیر بلکہ حسن تدبیر سے طلبہ کی تعلیم متاثر نہیں ہوئی۔

سیمینار کی تیاری کا پہلا کام تو یہ تھا کہ جن حضرات کے ذمہ مقالہ نگاری کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے ان کو خط بھیج کر، ای میل کر کے اس کی اطلاع دی جائے اور پھر ان سے مقالات وصول کئے جائیں؛ خدا کا شکر ہے کہ اچھا یا بُرا جس حد تک بن آیا، راقم الحروف نے یہ کام انجام دیا، جوں جوں سمینار کی تاریخیں قریب آ رہی تھیں، سیمینار سے متعلق تمام افراد پر کام کا بوجھ بڑھ رہا تھا اور اس سے زیادہ سبھی کے دماغ پر یہ بوجھ تھا کہ خدانخواستہ کوئی بدنظمی نہ ہو جائے، کسی قسم کا ناخوشگوار واقعہ نہ پیش آ جائے، موسم کے تیور نہ بدل جائیں یا کوئی ارضی وسماوی آفت نہ آ جائے، دُعاؤں کا خصوصی اہتمام کیا گیا اور ناظم صاحب نے چند طلبہ کو اس کے خصوصی اہتمام اور سلسلہ وار اعتکاف پر مامور کیا۔

لیجئے دیکھتے ہی دیکھتے اب ۱۱ر جمادی الاولیٰ کی تاریخ آ گئی، آج شام کو حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی معہد کے سابق طلبہ سے خطاب کریں گے، اور کل سے سمینار کا آغاز ہے، اس موقع پر یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ طلبہ واساتذہ معہد نے پورے دل سے، پورے خلوص کے ساتھ کام کیا، جس کو جو ذمہ داری سپرد کی گئی، اس نے اسے سعادت سمجھ کر اس فریضہ کو انجام دیا اور کیوں نہ انجام دیتا، جس شخصیت پر سمینار ہو رہا تھا وہ شخصیت ہی ایسی بابرکت، رفیع القدر اور عالی مرتبت تھی اور اسی ذات گرامی کی نسبت ہمارے لئے وجہ افتخار، سرمایہ عز ووقار اور تمغۂ امتیاز ہے۔

اساتذہ معہد اور طلبہ معہد نے پورے خلوص اور ذمہ داری کے ساتھ اپنی اپنی ذمہ داریوں کو انجام دیا تھا، سب کا حال بلا مبالغہ یہ تھا کہ تھکان سے چور ہیں، بدن آرام کا طالب ہے؛ لیکن چہرہ بشرہ سے ایسا لگ رہا ہے کہ ابھی آرام کر کے آ رہے ہیں اور کام کرنے کے لئے پورے طور پر تیار ہیں، اساتذہ معہد اور طلبہ کی خلوص و جانفشانی سے مہمان اور شرکاء سیمینار متاثر ہوئے اور ہر ایک نے معہد کے طلبہ کی خدمت اور جاں سپاری کا اعتراف کیا، بالخصوص رفیق دارالمصنفین مولانا عمیر الصدیق ندوی صاحب بار بار کہتے رہے کہ معہد کے طلبہ نے ہماری بڑی خدمت کی ہے، خدا ان کو جزائے خیر دے اور صرف ایک مولانا عمیر الصدیق صاحب کی بات نہیں، ہر ایک یہاں سے یہی احساس لے کر اُٹھا، بعض حضرات کا تو احساس تھا کہ مدارس کے طلبہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہیں، اللہ نے مدرسہ والوں کو دولت اور مال ومنال سے محروم رکھا ہے؛ لیکن نیک بخت اور سعادت مند طلبہ کی صورت میں اللہ نے انھیں معنوی فرزند سعید عطا کر رکھا ہے، جو ان کی آرام و راحت کا نہ صرف پورا خیال رکھتے ہیں؛ بلکہ اساتذہ کے چشم و ابرو کے اشارہ کے منتظر رہتے ہیں اور یہ بڑی نعمت ہے؛ بشرطیکہ کسی کو اس کا احساس ہو، بہر حال اس موضوع کو یہیں پر ختم کرتا ہوں ورنہ بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی اور اصل موضوع یہیں رہ جائے گا۔

ملک و بیرون ملک سے مہمانوں کی تشریف آوری کا تانتا بندھا ہوا ہے، معہد کے در و دیوار جگمگا رہے ہیں، طلبہ، اساتذہ اور دیگر کارکنان تندہی سے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مصروف ہیں، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ایک سر ہزار سودا کے مصداق تمام ذمہ داریوں سے نپٹ رہے ہیں، نمٹا رہے ہیں، کبھی اہل علم سے ملاقات کر رہے ہیں تو کبھی کانفرنس کے انتظامات کو قطعیت دے رہے ہیں، کبھی کسی پروگرام میں رد و بدل کر رہے ہیں، کبھی کسی مضمون یا موضوع کی پروف ریڈنگ کر رہے ہیں، کسی سے فون پر بات کر رہے ہیں، غرضیکہ کے علمی و انتظامی تمام ذمہ داریاں اپنے سر پر لئے ہوئے ہیں۔

پروگرام سیرت نبوی سیمینار

پروگرام فضلاء معہد: ۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ، مطابق ۲۰ر فروری ۲۰۱۶ء، روز ہفتہ، بعد نماز مغرب۔

افتتاحی اجلاس: ۱۲ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ، ۲۱ر فروری ۲۰۱۶ء، یکشنبہ: ۹:۳۰ر بجے تا ۱:۳۰ر بجے۔

پہلی نشست: ۱۲ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ، ۲۱ر فروری، ۲۰۱۶ء، یکشنبہ، بعد نماز مغرب۔

دوسری نشست: ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ، ۲۲ر فروری، ۲۰۱۶ء، دوشنبہ، صبح ۹:۳۰ تا ۱۱:۳۰ بجے دن۔

تیسری نشست: ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ، ۲۲ر فروری، ۲۰۱۶ء، دوشنبہ، ۱۱:۴۰ تا ۱:۴۰ بجے دن۔

چوتھی نشست: ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ، ۲۲ر فروری، ۲۰۱۶ء، دوشنبہ، بعد نماز مغرب۔

اختتامی نشست برائے تجاویز ۲۳ر فروری ۲۰۱۶ء، سہ شنبہ، ۱۲ر بجے تا ۱:۳۰ر بجے دن، پارک ہوٹل

اجلاس عام: ۱۴ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ، ۲۳ر فروری ۲۰۱۶ء، سہ شنبہ، بعد نماز مغرب، مقام: ہاکی پلے گراؤنڈ، مانصاحب ٹینک، حیدر آباد۔

طلبہ سے خطاب

۱۱ر جمادی الاولیٰ کی شام سے قبل ہی طلبہ معہد پہنچ گئے ،مغرب کی نماز کے بعد معہد کے فضلاء وفارغین سے حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے خطاب کیا ، ان کا یہ خطاب دل کی آواز تھا ، اس لئے طلبہ کے دل میں جاگزیں بھی ہوا،حضرت مولانا نے طلبۂ معہد کوان کی ذمہ داریاں بتائیں اوران ذمہ داریوں سے وہ کس طرح عہدہ برآہو سکتے ہیں اس کے بھی طریقے بتائے ،حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ اپنی ذمہ داریوں کو اچھے سے انجام دینا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ برادران وطن سے ان کے رابطے وتعلقات اچھے ہوں ، خدمت خلق کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں ، مقامی زبانوں سے کماحقہ واقف ہوں ، اسلام کا قافلہ رواں دواں رہے ، اس کے لئے غیروں تک اسلام کی دعوت پہنچائیں ، ناواقفیت اور عدم آگہی کی بنیاد پر یا دیدہ ودانستہ اسلام پر جواعتراضات کئے جاتے ہیں ، ان کا جواب دیں اور شکوک وشبہات کا ازالہ کریں اور یہ تبھی ہوگا جب وہ اعتراضات کو جانیں گے اور اعتراضات کو سمجھیں گے ،حضرت مولانا نے اپنے خطاب میں طلبہ کو تاکید فرمائی کہ وہ دعوت دین ودفاع اسلام میں اپنی تقریر وتحریر میں نرمی کو راہ دیں ، مخاطب اور اس کی نفسیات کو سمجھیں ، ان سب کے ساتھ اعمال کا بالخصوص نوافل وتہجد کا اہتمام کریں ، معاصر اکابر علماء کا احترام کریں ، ان کے علم سے استفادہ کریں ، تعلق مع اللہ کو مضبوط کریں اور ضرورت پڑے تو عزیمت کی نئی داستان رقم کریں۔

مولانا کا خطاب حلاوت میں شہد شیریں ، نفاست ولطافت میں کوثر وتسنیم کی طرح نرم ونازک اور دلائل کے لحاظ سے فولاد کی طرح ٹھوس تھا ، سبھی کے دل پر مولانا کے خطاب کا اثر ہوا اور سبھی نے عہد کیا کہ وہ ان باتوں کا اپنی زندگی میں اہتمام کریں گے ، مولانا کا یہ پورا خطاب ''میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے!'' کے نام سے چھپ چکا ہے ، اس سے دیگر مدارس کے طلبہ اور عوام الناس بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔

رات کے کھانے میں خاص اہتمام تھا ، اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مہمانوں نے حیدرآبادی ضیافت کا لطف لیا اور یہ صرف رات کے کھانے کی ہی بات نہیں ہے ؛ بلکہ حضرت مولانا اور منتظمین نے شاید تہیہ کر رکھا تھا کہ مہمانوں کو حیدرآباد کی مرغوب ، لذیذ اور مقبول عام پکوان وڈشش سے متعارف کرایا جائے۔

فجر کا وقت ہو چلا ہے ، مؤذن نے اذان دی اور معہد کے طلبہ ، اساتذہ ، مہمان ، شرکاء سبھی نے موذن کی آواز پر لبیک کہا اور بستر چھوڑ کر خدا کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گئے ، کچھ نے سہ پہر کو اٹھ کر '' آہ سحر گاہی'' کی سنت ادا کی اور کچھ سیدھے فجر میں ہی اُٹھے۔

مؤذن مرحبا بروقت بولا
تیری آواز مکے اور مدینے

صبح سات سے آٹھ بلکہ ساڑھے آٹھ تک ناشتہ کا وقت تھا، ناشتہ کیا گیا، ساڑھے نو بجے سے افتتاحی اجلاس تھا، افتتاحی اجلاس میں ملک کے آسمان علم وفضل پر چمکنے والے آفتاب وماہتاب شریک تھے، ان سب کا بیک وقت ایک جگہ جمع ہونا قران السعدین اور ملک کی تاریخ کا ایک نیا باب تھا اور کیوں نہ ہوتا، یہ سمینار کتنی عظیم، بلند بابرکت اور رفیع المرتبت شخصیت کی نسبت سے ہورہا تھا، بھلا جس کے بارے میں خالق ومالک خود کہہ دے: ''ورفعنا لک ذکرک'' اب جس کے ذکر کو خود خدا بلند کرے تو اس کی بلندی کا اندازہ کوئی خاکی بھلا کیسے کرسکتا ہے؟ اس کے خیال کی پرواز خدا کی عطا کردہ بلندی تک کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ حوصلہ، یہ مجال، یہ طاقت کسی خاکی میں، خاک نہاد میں کیسے آسکتی ہے؟ اگر کسی کو اس کا خیال گزرتا ہے تو وہ جرأت بے جا اور جسارت ناروا کے سوا کچھ بھی نہیں، غالب نے بالکل صحیح کہا ہے:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

سیرت نبوی سیمینار میں شرکت کی دعوت جب حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب کو دی گئی تو انھوں نے فوری آمادگی کا اظہار کیا اور سیمینار کے لئے روانگی سے قبل تک حضرت مولانا سمینار میں شرکت کے لئے تہہ دل سے آمادہ تھے اور جب بھی ان سے حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی بات ہوئی تو انھوں نے ہمیشہ یہی فرمایا کہ میں اس سمینار میں ضرور شرکت کروں گا؛ لیکن سمینار سے عین قبل حضرت مولانا کی طبیعت خراب ہوگئی، جس کی وجہ سے حضرت سمینار میں شریک نہ ہوسکے، اسی طرح داعئ اسلام حضرت مولانا کلیم صدیقی صاحب بھی سمینار سے عین قبل ایک حادثہ کا شکار ہوگئے اور اس بناء پر وہ سمینار میں شریک ہونے سے اور شرکاءِ سمینار ان سے استفادہ سے محروم ہوگئے؛ لیکن خدا کے کام میں چارہ ہی کیا ہے اور صبر وشکر کے سوا زبان کو یارا ہی کیا ہے: ''وکان امر اللہ قدرا مقدورا'' اور یہ بھی ہے کہ: ''عسیٰ ان تکرھوا شیئا و ھو خیر لکم''۔

سمینار کا افتتاحی اجلاس

21رفروری، مطابق ۱۲رجمادی الاولی صبح ساڑھے نو بجے افتتاحی اجلاس کا آغاز ہوا، اسٹیج پر ملک وبیرون ملک کی قدآور علمی شخصیات موجود تھیں، سیاسی دنیا کے اہم نام تلنگانہ کے ڈپٹی چیف منسٹر محمود علی خان اور مجلس اتحاد المسلمین کے صدر اسد الدین اویسی بھی اسٹیج پر موجود تھے، قاری عبداللہ کلیمی صاحب کی تلاوت کلام پاک سے اجلاس کا آغاز ہوا، قاری عبداللہ کلیمی صاحب حیدرآباد شہر کے معروف اور مشہور قاریوں میں سے ہیں، آپ کی قرأت سے سماں بندھ گیا، جس میں سبھی عام وخاص ڈوبے نظر آئے، قاری عبداللہ کلیمی کی تلاوت کے بعد جس ذات گرامی کی نسبت سے یہ سمینار ہورہا تھا، اس کی خدمت میں ہدیہ نعت پیش کیا گیا، استقبالیہ کلمات سکریٹری المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد، ونظام انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی جناب محمد جعفر نے ادا کئے، اجلاس کی

صدارت، ہندوستان کے مشہور، موقر دینی ادارہ ندوۃ العلماء کے مہتمم ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی نے انجام دیئے، سب سے پہلے حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے سمینار کا کلیدی خطبہ پیش کیا، یہ کلیدی خطبہ طبع ہو چکا ہے۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنے کلیدی خطبہ میں اولاً نبوت کی ضرورت واہمیت کو پیش کیا، بعد ازاں نبی اکرم ﷺ کی انقلاب آفریں شخصیت کا مختصر تعارف کرانے کے بعد آپ ﷺ کے انقلابی کارناموں کی مختصر فہرست پیش کی، جیسے آپ نے تمام انسانوں کو اتحاد و یکجہتی کا درس دیا، علم کی حوصلہ افزائی فرمائی، دین و دنیا کی تفریق و تقسیم کو ختم کیا اور بتایا کہ یہ ایک دوسرے کا جزء اور تتمہ ہے اور اس کو اس طرح واضح فرمایا کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یعنی دین کے لئے دنیا چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے اور دنیاوی حقوق و ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے دین پر عمل کرنا ہی کمال ہے، عورتوں کے مظلوم طبقہ کو آپ ﷺ نے جو توقیر عطا کی اس کا بھی ذکر کیا اور مذہبی شخصیات کی بے احترامی سے روکنے کے لئے قرآن وحدیث میں جو تعلیمات بیان کی گئی ہیں اس کا بھی آپ نے مختصر مگر جامع طور پر بیان کیا، سب سے آخر میں آپ نے حیدرآباد شہر کی تاریخی اہمیت اور اس شہر میں دینی وعلمی کارناموں اور بالخصوص حیدرآباد میں سیرت نبوی پر ہونے والے کام کا مختصر طور پر ذکر کیا، ہم یہاں اس کا ایک پیرا گراف بطور تعارف اور مشتے از نمونہ ذکر کر رہے ہیں :

> حیدرآباد کو سیرت نبوی کی خدمت میں ایک نمایاں مقام حاصل رہا ہے، اُردو زبان میں سیرت کی سب سے مفصل کتاب (جس کو سیرت کا انسائیکلو پیڈیا کہنا بے جا نہ ہوگا) سیرت النبی (تالیف: علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی) کی ترتیب واشاعت میں حکومت حیدرآباد کا گرانقدر مخلصانہ تعاون شامل رہا ہے، خود حیدآباد نے ایک ایسے سیرت نگار کو وجود بخشا ہے جس نے مغربی زبان میں پیغمبر اسلام ﷺ کا سب سے مؤثر تعارف کروایا ہے اور مستشرقین کے ہی اُسلوب میں ان کی مغالطہ انگیزیوں کا پردہ چاک کیا ہے، میری مراد ڈاکٹر حمید اللہ سے ہے،...... غالب گمان یہ ہے کہ سیرت کے اُردو لٹریچر میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی ''النبی الخاتم'' یہیں لکھی گئی ہوگی جو عقل کی گرہوں کو کھولتی، اور قلب وروح کے پیمانہ کو عشق نبوی کی مئے جاں فزا سے لبریز کرتی ہے، جس کو پڑھ کر ہر بار حب نبوی کی آنچ تیز ہو جاتی ہے اور آنکھیں آنسوؤں سے وضو کرتی ہیں۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا یہ کلیدی خطبہ جہاں ایک جانب قیمتی معلومات اپنے اندر لئے ہوئے تھا، وہیں تحریر کی رنگینی ورعنائی بھی دامن دل کو اپنی جانب کھینچی تھی :

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

اس موقع پر جو حضرات باوجود دلی خواہش کے عذر کی بناء پر شریک نہ ہو سکے، ان کے پیغامات کو پڑھ کر سنایا گیا، قطر سے علامہ یوسف القرضاوی (جن کا نام علمی حلقوں کے لئے محتاج تعارف نہیں) نے سیرت نبوی سمینار کے لئے اپنا پیغام بھیجا، جسے مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی نے پڑھ کر سنایا، حضرت مولانا رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ) نے بھی اپنا پیغام روانہ کیا تھا، جسے معہد کے استاذ مولانا اعظم ندوی نے پڑھ کر سنایا اور اسی طرح دارالعلوم وقف دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا سالم قاسمی صاحب کا پیغام ان کے پوتے مولانا شکیب قاسمی نے پڑھ کر سنایا، مہمان خصوصی ریاست تلنگانہ کے ڈپٹی چیف منسٹر محمد محمود علی نے اپنے خطاب میں سیرت کے پہلو پر اجمالی روشنی ڈالی، انھوں نے کہا کہ :

> آج کے دور میں اگر مسلمان قوم ترقی کے میدان میں آگے بڑھنا چاہتی ہے تو اسے دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم میں بھی قابل رشک پیش رفت کرنی ہوگی، نئی نسل کو عصری تعلیم سے دور رکھ کر ان کے مستقبل کو کامیاب بنانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اگر ہم نسل کو کامیابی کے میدان میں آگے دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں انھیں حالات کے تقاضوں کی روشنی میں سینچنے اور سنوارنے کی کوشش کرنی ہوگی۔

جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا سید محمود اسعد مدنی نے موجودہ ملکی حالات پر کھل کر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ :

> پورے برصغیر میں جتنے مسلمان بستے ہیں، ان میں کا آدھا حصہ صرف ہمارے ملک میں آباد ہے، اور میں بڑی ذمہ داری کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان کا مسلمان دوسرے ممالک کے مقابل کہیں زیادہ پرامن ماحول میں ہے، موجودہ ماحول میں ہمیں اپنے ملک میں کئی حالات کا سامنا ہے؛ مگر میں کہوں گا کہ اس صورت حال کا بڑی دانشمندی سے جائزہ لے کر اپنے لئے مناسب سمت طے کرنی ہوگی، حکومت کے بدلنے سے حالات نہیں بدلتے؛ بلکہ اس کے لئے ہمیں خود اپنے حالات کو بدلنے کے لئے اپنے اخلاق و کردار کو سیرت وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کی فکر کرنی ہوگی۔

دارالعلوم وقف دیوبند کے مہتمم مولانا محمد سفیان قاسمی نے کہا کہ :

> آپ ﷺ کو خلق عظیم کی دولت سے نوازا گیا تھا اور یہی نہیں بلکہ آپ ﷺ کی پوری زندگی عفو ودرگزر اور محبت و بھائی چارگی کا عملی نمونہ تھی۔

مجلس اتحاد المسلمین کے سربراہ وممبر پارلیمنٹ اسدالدین اویسی جو اپنے شعلہ بیان خطاب کے لئے مشہور ہیں، انھوں نے سیرت نبوی کی اہمیت کے پیش نظر نہایت سنجیدگی اور متانعت سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ :

انسانی زندگی میں آئی تباہی وبربادی نبی کریم ﷺ کی اخلاقی تعلیمات کوفراموش کر دینے کا نتیجہ ہے، حکومت لوگوں کومختلف خانوں میں بانٹ کرلڑانے کی فکر نہ کرے، اس سے ملک میں عدم استحکام کی صورت پیدا ہوگی، اگر مسلمان متحد نہ رہے تو یہ ظالم حکومت کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکتی ہے۔

رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اہم ذمہ دار، مشہور محقق ڈاکٹر شیخ عبداللہ بن محمد غامدی نے پرمغز خطاب میں فرمایا :

آقا ﷺ دنیا کی تقدیر سنوارنے کے لئے آئے تھے اور انھوں نے اپنی تمام تر کوششیں انسانیت کی گیسوئے برہم کوسنوارنے میں صرف کی؛ لیکن آج پوری دنیا اسی ذات اقدس پر انگشت نمائی کی بدترین کوشش کررہی ہے، اسلام کے دشمن اور اللہ کے نبی ﷺ کے دشمن سوشل میڈیا کے ذریعہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات کومسخ کرنے کی کوشش کررہے ہیں؛ لیکن ہم علماء خواب خرگوش میں سوئے ہوئے ہیں، آپ اندازہ کیجئے کہ صرف فیس بک کے صارفین کی تعداد لاکھوں میں ہے، ایک بدطینت شخص ان ہی سماجی رابطوں کی ویب سائٹوں کے ذریعہ آقا ﷺ کی تعلیمات کومسخ کرکے پیش کررہا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ علماء سوشل میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ کی مدد سے نبی ﷺ کی مبارک تعلیمات کودنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کی کوشش کریں، اگر علماء اس میدان میں آگے نہیں آئے تو یہ پوری ملت اسلامیہ کے لئے عظیم خسارہ ہوگا، سماجی رابطوں کی ویب سائٹوں پر علماء کے گروپ ہونے چاہئیں جو اسلام اور نبی ﷺ کی روشن تعلیمات کو عام کریں۔

حضرت مولانا محمد ولی رحمانی نے اپنے مختصر خطاب میں بعض گوشوں کی اس غلطی کو واضح کیا کہ بعض لوگوں کو سیرت نبوی میں صرف صلح حدیبیہ ہی نظر آتی ہے اور سیرت کے دوسرے صفحات اور گوشے جو غزوہ بدر، غزوہ اُحد، غزوہ خیبر وتبوک اور موتہ اور سرایا وغیرہ کے ہیں، وہ بھول جاتے ہیں، ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ سیرت کے تمام گوشوں کو ذہن میں رکھیں اور سیرت کے کسی ایک صفحہ، واقعہ یا گوشہ کو اتنی اہمیت نہ دیں کہ بقیہ سیرت کی نفی ہو، یا ان کی اہمیت کم ہوجائے۔

ان حضرات کے علاوہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قومی نائب صدر مولانا کاکا سعید عمری، مولانا مفتی احمد دیولوی (گجرات)، جماعت اسلامی ہند کے سکریٹری مولانا رفیق احمد قاسمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر

شعبۂ دینیات ڈاکٹر سعود عالم قاسمی، جمعیۃ علماء جنوبی افریقہ کے صدر مولانا عباس علی جینا، دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث مولانا عبداللہ معروفی نے بھی خطاب کیا، اس موقع پر مولانا شاہ عالم گورکھپوری، مفتی اشرف عباس قاسمی، دارالعلوم حیدرآباد کے مہتمم جناب رحیم الدین انصاری، مولانا شکیب قاسمی، مولانا عتیق احمد بستوی وغیرہ اسٹیج پر موجود رہے، افتتاحی اجلاس کی صدارت دارالعلوم ندوہ لکھنؤ کے مہتمم ڈاکٹر سعیدالرحمٰن اعظمی نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی نے بحسن وخوبی انجام دی۔

اسی افتتاحی اجلاس میں کتابوں کی رسم رونمائی بھی انجام دی گئی، جن میں سیرت نبوی کے انسانیت نواز پہلوؤں پر پندرہ کتابچے بھی شامل ہیں، اس کے علاوہ اس موقع پر احکام فطرت، از: مولانا شکیل احمد رحمانی، نذر وقسم، احکام ومسائل، از: محمد رضوان فردوسی، آسان سیرت النبی، از: سید آصف الدین ایم اے، تذکرہ حضرت خواجہ حسن بصری، از: مولانا محمد ارشد ملی، Islamic Rhymes For Kindergarten رائٹر: جناب محمد اکبر علی خان (سب ایڈیٹر، روزنامہ منصف) ان کتابوں کی اسٹیج پر موجود موقر شخصیات کے ہاتھوں رونمائی انجام دی گئی۔

جیسا کہ مشرقی جلسوں کا خاصہ رہا ہے، سمینار وقت مقررہ سے تجاوز کر گیا، پندرہ منٹ کے وقفہ سے اذان وباجماعت نماز ہوئی، اس کے بعد ظہرانہ کا آغاز ہوا، افتتاحی اجلاس میں مہمانوں کی تعداد تقریباً 1500 تھی؛ لیکن کھانا کھلانے کا کام بخیر وخوبی انجام پایا، کھانا کھانے کے بعد سبھی مہمان وشرکاء سمینار آرام کرنے لگے۔

مقالات کی پہلی نشست، بعد نماز مغرب

اس نشست کا مرکزی عنوان پیغمبر اسلام اور غلط فہمیاں تھا، اس مرکزی عنوان کے تحت ۱۲ مقالے پیش کئے گئے، ان مقالات کے عنوانات اور مقالہ نگاروں کے نام ذیل میں درج ہیں :

عنوان	مقالہ نگار
(۱) کیا آپ ﷺ نے اسلام بزور طاقت پھیلایا؟	مولانا محمد کلیم صدیقی (خواندگی: مولانا محمد عاشق الٰہی ندوی)
(۲) عہد نبوی میں جہاد کا پس منظر	جناب اسلام الدین مجاہد
(۳) غزوہ بنی قریظہ	حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
(۴) جزیہ وغلامی کا مسئلہ	مولانا عمیر الصدیق ندوی
(۵) ہدم اصنام اور مذہبی مقدسات کا احترام	مولانا محمد مصطفےٰ عبدالقدوس ندوی
(۶) رسول اللہ ﷺ اور تعدد ازدواج	مولانا نورالحق رحمانی
(۷) حضرت زینبؓ سے نکاح	مولانا شوکت ثناء قاسمی
(۸) حضرت زینبؓ سے نکاح	مولانا محی الدین غازی فلاحی

(۹) حضرت عائشہؓ سے نکاح　　　مولانا محمد اشرف عباس قاسمی

خواتین سے متعلق بعض تعلیمات نبوی اور غلط فہمیاں

(۱۰) تعلیم کتابت، ٹیڑھی پسلی سے پیدائش، گواہی، ناقصات العقل　　　مولانا ولی اللہ مجید قاسمی

(۱۱) تادیب کی اجازت، امامت، شیطان کی رفاقت، مرد کے مقابلہ نصف دیت　　　مولانا فہیم اختر ندوی

(۱۲) خواتین کی عظمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک　　　مولانا طالب خان قاسمی

وقفہ سوال وجواب (۲۰ رمنٹ) : مقالات کی پہلی نشست کا آغاز تلاوت قرآن کریم اور سرور کائنات کی خدمت میں ہدیہ نعت پیش کرنے سے ہوا، اسٹیج پر اس نشست کے مقالہ نگار اور دیگر اہل علم وبزرگ شخصیات موجود تھیں، حضرت مولانا عتیق احمد بستوی اس نشست کی صدارت فرما رہے تھے، تمام مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے موضوعات پر پرمغز اور علمی وتحقیقی مقالات پیش کئے، بالخصوص مولانا غازی محی الدین صاحب کا مقالہ جو حضرت زینب پر تھا، اس نشست میں نمایاں اور انفرادیت کا حامل رہا اور انھوں نے حضرت زینب سے حضور ﷺ کے نکاح کے واقعہ پر منفرد انداز سے روشنی ڈالی اور بتایا کہ غلط اور بے بنیاد روایات کی روشنی میں حضرت زینب کا عظیم کردار دب گیا ہے، ضرورت ہے کہ حضرت زینب نے جس طرح اپنی ذات کی قربانی دے کر جاہلی معاشرے کے دو اہم رسم کو مٹایا یعنی غلام سے شادی کرنا اور منھ بولے بیٹے کی بہو سے شادی کرنا، اس کو نمایاں کیا جائے، اور اسی نشست میں حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی کا بھی مقالہ غزوہ بنو قریظہ پر تھا؛ لیکن وقت کی کمی سے آپ اپنا مقالہ پیش نہ کرسکے اور صرف مقالہ کے ذیلی عنوانات پر اکتفاء فرمایا، مولانا عتیق احمد بستوی نے آخر میں اہل علم حضرات علم وتحقیق کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ علم وتحقیق کے بہت سارے گوشے ایسے ہیں جس پر کام کرنے کی ضرورت ہے، نظامت: مولانا محمد اعظم ندوی (استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد) نے کی، نشست کے خاتمہ پر عشاء کی اذان دی گئی، نماز کے بعد رات کا کھانا کھایا گیا۔

22رفروری مقالات کی دوسری نشست

فجر کی نماز اور معمولات ووظائف سے فراغت کے بعد مہمانوں نے ذرا ٹہل کر اور گھوم پھر کر معہد کے اردگرد کا جائزہ لیا اور صبح کی خنک اور خوشگوار ہوا یا دوسرے لفظوں میں نسیم صبح کے لمس سے خود کو تر وتازہ کیا، اس موقع پر بے ارادہ قطب وقت حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے یہ اشعار زبان پر آرہے ہیں :

باد نسیم ! آج یہ کیوں مشک بار ہے
شاید ہوا کے رخ پر کھلی زلف یار ہے

ناشتہ سے فراغت کے تھوڑے وقفہ کے بعد سیمینار کے دوسرے دن کی پہلی نشست کا آغاز معہد کے شعبہ

انگریزی کے متعلم ثناء اللہ کی تلاوت قرآن سے ہوا، شعبہ فقہ کے متعلم تاثیر نبی نے اپنی پرسوز آواز میں نعت نبی سے سامعین کے دلوں کو معطر کیا، اس نشست کا مرکزی عنوان ''پیغمبر اسلام ﷺ اور دیگر مذہبی کتابیں'' تھا، اس نشست میں پانچ مقالات پیش کئے گئے، مقالات کے عنوان اور مقالہ نگاروں کے نام ذیل میں درج ہیں :

(۱) پیغمبر اسلام ﷺ اور ویدیں : جناب عبداللہ طارق (رام پور)

(۲) پیغمبر اسلام ﷺ اور گیتا : جناب عبدالرشید آگوان (دہلی)

(۳) پیغمبر اسلام ﷺ اور بائبل : مولانا اقبال احمد انجینئر (حیدرآباد)

(۴) پیغمبر اسلام ﷺ اور گروگرنتھ : جناب عبداللہ طارق (رام پور)

(۵) پیغمبر اسلام ﷺ اور بدھ مت : جناب سید مقصود احمد (ظہیر آباد)

دارالعلوم سبیل السلام کے استاذ حدیث اور معروف اسلامی اسکالر مولانا نثار حصیر القاسمی نے عنوان کا تعارف کراتے ہوئے اپنے تمہیدی کلمات میں فرمایا کہ زندگی کی ناہمواریوں، دنیا کی انارکی اور بے راہ روی کا واحد حل سیرت محمدی ﷺ سے وابستگی ہے، ہمیں فکر ونظر کا چراغ نبی اکرم ﷺ کے چراغ سے جلانا چاہئے، مولانا قاسمی کی تمہیدی گفتگو کے بعد'' پیغمبر اسلام اور ویدیں'' کے عنوان پر مشہور داعی جناب عبداللہ طارق (رامپور) نے اپنا مقالہ پیش کیا، انھوں نے چاروں ویدوں کی عبارتیں اور اشلوک پڑھ کر ثابت کیا کہ ہندو سناتن دھرم نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات اور آپ کی شخصیت سے ناآشنا نہیں ہے، ویدیں نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات سے ہم آہنگی رکھتی ہیں، ویدوں نے نبی ﷺ کا متعدد مقام پر بحیثیت رسول اور نبی ذکر کیا ہے، اس نشست میں دوسرے اہم موضوع یعنی پیغمبر اسلام ﷺ اور گیتا کے عنوان سے جناب عبدالرشید آگوان نے اپنا مقالہ پیش کیا، آگوان صاحب نے دعویٰ کیا کہ گیتا کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی تعلیمات اور گیتا کی تعلیمات میں ہم آہنگی ہے، انھوں نے مختلف اشلوک پڑھ کر گیتا اور قرآن کی ہم آہنگی کی مثالیں پیش کیں، اقبال احمد انجینئر (حیدرآباد) نے اپنے مقالہ پیغمبر اسلام اور بائبل میں دعویٰ کیا کہ بائبل میں تحریف کے باوجود دونوں عہد ناموں میں نبی کریم ﷺ کی نبوت کی تصدیق موجود ہے، اور بطور استشہاد دونوں عہد ناموں سے متعدد اقتباسات پیش کئے، پیغمبر اسلام ﷺ اور بدھ مت کے عنوان سے جناب سید مقصود احمد (ظہیر آباد) نے اپنا وقیع علمی مقالہ پیش کیا، انھوں نے گوتم بدھ کے عدم تشدد کی تعلیم کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بتایا کہ بدھ ایک مذہبی اصطلاح ہے، جس کے معنی رسول اور پیغمبر کے ہیں، بدھ کسی خاص شخصیت کا نام نہیں بلکہ یہ خدا کے فرستادہ کا مفہوم ادا کرنے کے لئے ہوتا ہے؛ چنانچہ گوتم بدھ نے خود کہا تھا کہ: ''میں تنہا بدھا نہیں ہوں؛ بلکہ میرے بعد بھی کئی بدھے آئیں گے، تم اپنے زمانے کے بدھا کی اتباع کرنا''

پیغمبر اسلام اور گروگرنتھ کے عنوان پر جناب عبداللہ طارق نے گفتگو کی انھوں نے گروگرنتھ اور صاحب کی اصطلاح

کی تشریح کی، اپنے صدارتی خطاب میں مشہور عالم دین اور گجرات کی ممتاز علمی دینی شخصیت حضرت مولانا عبداللہ کا پودروی (امین فلاح دارین ترکیسر) نے نئی نسل کے علماء اور نوجوان فضلا کی توجہ مذاہب کے مطالعے کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا کہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم دیگر مذاہب کی مقدس کتابوں سے براہ راست استفادہ کے اہل نہیں ہیں، اگر سنسکرت اور انجیل تورات وغیرہ کی زبان سیکھیں اوران کی مقدس کتابوں سے نبی ﷺ کے بارے میں بشارتیں اور پیشین گوئیوں کو نقل کریں تو دعوتی مہم میں کارآمد ثابت ہوں گے، انھوں نے بدھسٹوں کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بدھسٹوں کو گوتم بدھ کی تعلیمات کی روشنی میں یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ تم اپنے مذہب کا گلا خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ رہے ہو، مولانا کاپودروی نے برما، رنگون، سری لنکا اور دیگر ممالک میں بدھسٹوں کے ذریعے مسلمانوں پر ڈھائے جارہے مظالم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا یہ ضروری ہے کہ مسلم علماء بدھ دانشوران سے گفت وشنید کریں اوران سے ڈائیلاگ کا سلسلہ شروع کریں اورانھیں بتائیں کہ جو مذہب ایک چیونٹی کے قتل کو گوارا نہیں کرتا اس کے ماننے والوں کے لئے کیا یہ بات زیبا ہے کہ وہ انسانوں کے خون سے ہولی کھیلے، جناب صدر صاحب کی ہی دُعا پر دوسری نشست کا اختتام ہوا، نظامت کے فرائض مولانا محمد انصاراللہ قاسمی صاحب (استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد) نے انجام دیئے، تیسری نشست سے قبل لوگوں کی چائے اور بسکٹ سے ضیافت کی گئی اور نشست کے درمیان بھی لوگوں کو رضا کار پانی اور چائے اور بسکٹ پیش کرتے رہے۔

22/فروری مقالات کی تیسری نشست

مقالات کی تیسری نشست، دوسری نشست کے فوراً بعد ہی رکھی گئی، اس نشست کی صدارت مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے مہتمم مولانا حشیم صاحب نے کی، تیسری نشست کا مرکزی عنوان ''پیغمبر اسلام ﷺ اور غیر مسلموں کے اعترافات'' تھا، اس نشست میں پانچ مقالات پیش کئے گئے، مقالات کے عنوانات اور مقالہ نگاروں کے نام ذیل میں درج ہیں :

(۱) پیغمبر اسلام ﷺ، ہندوستانی دانشوروں کی نظر میں: ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی (دہلی)
خواندگی: مولانا شاہد علی قاسمی (استاذ معہد)
(۲) پیغمبر اسلام ﷺ مغربی دانشوروں کی نظر میں: ڈاکٹر سعود عالم قاسمی (علی گڑھ)
(۳) پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں ہندوستان کے غیر مسلم بھائیوں کی تالیفات: مولانا علیم الدین جائسی
(۴) پیغمبر اسلام ﷺ کی بارگاہ میں غیر مسلم شعراء کا خراج احترام: مولانا ڈاکٹر راہی فدائی باقوی
(۵) پیغمبر اسلام ﷺ کی امن پسندی اور مستشرقین کا اعتراف: مولانا سہیل اختر ندوی

تمہیدی کلمات مولانا پروفیسر عبدالمجید نظامی نے کہے، اس نشست میں جو اہم مقالات پیش کئے گئے ان میں ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی کا مقالہ ''پیغمبر اسلام ﷺ ہندوستانی دانشوروں کی نظر میں'' المعہد العالی الاسلامی کے استاذ مولانا شاہد علی قاسمی نے پیش کیا، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سے سمینار میں شریک نہیں ہوسکے؛ لیکن انھوں نے اپنا قیمتی مقالہ بذریعہ میل روانہ کیا تھا، اس نشست کا ایک اہم مقالہ ''پیغمبر اسلام ﷺ کی بارگاہ میں غیر مسلم شعراء کا خراج احترام'' ڈاکٹر راہی فدائی باقوی (بنگلور) نے پڑھا، انھوں نے متعدد غیر مسلم شعراء جن کا تعلق ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور شہروں سے ہے کے اشعار پڑھ کر سنائے، ڈاکٹر فدائی نے اپنے مقالے میں یہ صراحت کی کہ ردیف وقافیہ کے بندھن میں پروکر پیش کئے گئے اشعار محض احترام انسانیت کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں نہ کہ ان شعراء کے دل مومن کا آئینہ ہیں، عام طور پر لکھنے والے لکھ جاتے ہیں کہ ان شعراء کا دل بھی نور محمدی ﷺ سے منور ہے تبھی تو یہ اشعار ان کے قلم وزبان سے نکلتے ہیں؛ حالاں کہ اس میں مکمل سچائی نہیں ہے، اس نشست میں ڈاکٹر سعود عالم قاسمی (صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے ''پیغمبر اسلام ﷺ مغربی دانشوروں کی نظر میں'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور مغربی محققین کی دسیسہ کاریوں اور ان کی علمی بددیانتی کو آشکار کیا، انھوں کہا صرف ایک گوئٹے ہے جس نے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں مثبت باتیں تحریر کی، انھوں نے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کا ایک خوبصورت اقتباس بھی پڑھ کر سنایا، ان کے علاوہ مولانا علیم الدین اشرف جائسی (مولانا آزاد اردو یونیورسٹی حیدرآباد) نے ''پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں ہندوستان کے غیر مسلم بھائیوں کی تالیفات'' جب کہ مولانا سہیل اختر ندوی (کشن گنج) نے اپنا مقالہ ''پیغمبر اسلام ﷺ کی امن پسندی اور مستشرقین کا اعتراف'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا، سہیل اختر ندوی نے بتایا کہ یہ خیال کرنا کہ مستشرق متعصب اور اسلام دشمن ہوتا ہے، غلط ہے، مستشرقین کی اقسام ہیں، کچھ انصاف پسند ہیں، کچھ اسلام دشمن ہیں اور کچھ ذہنی تحفظات سے کام لیتے ہیں، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ بعض مستشرقین نے اسلام کی حقانیت ثابت ہونے پر اسلام بھی قبول کیا ہے، اس کے علاوہ انھوں نے بتایا کہ جہاں بہت سارے مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام کو جنگجوئی اور خونریزی کا طعنہ دیا ہے وہیں انصاف پسند مستشرقین نے اس الزام کی تردید کی ہے اور پیغمبر اسلام کی امن پسندی کا برملا اور کھل کر اعتراف کیا ہے، سیرت سمینار کے مقالات کی تیسری نشست میں امیر شریعت کرناٹک مفتی اشرف علی باقوی، مولانا شاہ عالم گورکھپوری، مفتی عبداللہ معروفی، مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، مولانا عتیق احمد بستوی، حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی وغیرہ اسٹیج پر موجود تھے۔

22/فروری مقالات کی چوتھی نشست

مقالات کی یہ نشست بے حد اہم تھی، نہ صرف اس وجہ سے کہ یہ سمینار کے مقالات کی آخری نشست تھی؛

بلکہ یہ کہ اس کا موضوع بھی بے احد اہم تھا، اس نشست کا مرکزی عنوان تھا ''عہد حاضر کے مسائل اور اسوۂ نبوی ﷺ''
اس مرکزی عنوان کے تقریباً ۹؍ اہم اور عصر حاضر کے سلگتے ہوئے مسائل پر مقالے پیش کئے گئے، سبھی مقالے کم وبیش بہت اہم تھے اور مقالہ نگاروں نے اپنی جانب سے تحقیق وتدقیق کی پوری کوشش کی تھی، ذیل میں مقالات کے عنوانات اور مقالہ نگاروں کے نام درج کئے جاتے ہیں :

(۱) ماحولیات کا تحفظ اور اُسوۂ نبوی ﷺ	:	مولانا ڈاکٹر حسنین احمد ندوی
(۲) اقلیتوں کے حقوق اور اُسوۂ نبوی ﷺ	:	مولانا سید ومیض احمد ندوی
(۳) مسلم اقلیت کے لئے اُسوۂ نبوی ﷺ	:	مولانا شکیب احمد قاسمی
(۴) تقسیم دولت اور اُسوۂ نبوی ﷺ	:	مولانا تنظیم عالم قاسمی
(۵) تعلیم اور اُسوۂ نبوی ﷺ	:	ڈاکٹر شہاب الدین سبیلی
	:	مولانا رفیع الدین رشادی
(۶) سیرت نبوی کی روشنی میں موجود حکمرانوں کو اسلام کی دعوت	:	مولانا الیاس ندوی
(۷) بنیادی انسانی حقوق اور حجۃ الوداع	:	مولانا عبد القوی صاحب
(۸) تعمیر سیرت اور اُسوۂ نبوی ﷺ	:	مولانا عبد الباسط ندوی
(۹) ٹکنالوجی کی حوصلہ افزائی اور اُسوۂ نبوی ﷺ	:	پروفیسر راشد نسیم ندوی

نشست کا آغاز تلاوت کلام پاک اور فداہ ابی وامی کی خدمت اقدس میں ہدیہ نعت پیش کرنے سے ہوا، تمہیدی کلمات مولانا شاہ عالم گورکھپوری نے ادا کئے، اس نشست کے صدر پروفیسر اسلم پرویز (شیخ الجامعہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی) تھے، نظامت کی ذمہ داری مولانا شہباز نسیم قاسمی (استاذ: المعہد العالی الاسلامی) کی تھی، جسے انھوں نے بحسن وخوبی انجام دیا۔

مولانا ڈاکٹر سید حسنین احمد ندوی نے عصر حاضر کے ایک اہم عالمی مسئلہ ماحولیات کے تحفظ پر اُسوۂ نبوی ﷺ کی روشنی میں گفتگو کی اور ثابت کیا کہ اسلام بھی ماحولیات کے تحفظ میں پیش پیش ہے اور اس کو وہ ایک ذمہ داری سمجھتا ہے، مولانا سید ومیض احمد ندوی (استاذ دار العلوم، حیدرآباد) نے اقلیتوں کے حقوق اور اُسوہ نبوی ﷺ پر مقالہ پیش کیا، جب کہ مولانا شکیب احمد قاسمی (دار العلوم وقف دیوبند) نے مسلم اقلیت کے لئے اسوہ نبوی پر مقالہ پیش کیا، دونوں صاحبان ذی علم نے اپنے مقالہ میں یہ ثابت کیا کہ اقلیتوں کے جن حقوق کا عہد حاضر میں ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے، وہ آنحضرت ﷺ نے چودہ سو برس پہلے طے کر دیا تھا اور مسلم اقلیتوں کو کس طرح اکثریتی معاشرہ میں زندگی گزارنی ہے اس کا نمونہ بھی حضور پاک ﷺ نے مکی زندگی میں پیش کر دیا ہے اور مدنی زندگی میں اس کے تعلق سے ہدایات دے دی ہیں۔

آج معاشرے میں ہرطرف تعلیم کا چرچا ہے،مسلم قوم کی تعلیمی پسماندگی میں نوحہ خوانی ہر چہار جانب ہورہی ہے(اگر چہ بیان بازی زیادہ اورکام اس سمت میں کم ہورہاہے،)مولاناڈاکٹرشہاب الدین سبیلی (ایفل یونیورسٹی) نے ’’تعلیم اوراسوۂ نبوی ﷺ‘‘ پراوراسی موضوع پرمولانارفیع الدین رشادی (ناظم جامعہ ارشادالبنات) نے مقالہ پیش کیا،دونوں حضرات نے اُسوہ نبوی سے ثابت کیا کہ تعلیم کی اسلام میں کیااہمیت ہےاورآنحضرت ﷺ نےتعلیم کوکیااہمیت دی ہے؟

آزادی کا نعرہ دورحاضر کا خوش کن نعرہ ہےاورانسانی حقوق کی آوازیں بلند کی جارہی ہیں؛لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پوری دنیامیں اگرکوئی چیز سب سے زیادہ پامال ہورہی ہےتووہ انسانی حقوق ہی ہیں،آنحضرت ﷺ کی پوری زندگی بنیادی انسانی حقوق کی حفاظت اوراس کی پاسداری میں گزاری اورنہ صرف قولاً؛بلکہ عملاًآپ ﷺ نےحقوق انسانی کی حفاظت فرمائی،بالخصوص آپ کا حجۃ الوداع کا جوخطبہ ہےوہ حقوق انسانی کی لازوال تعلیمات پرمشتمل ہے، مولاناعبدالقوی صاحب (ناظم جامعہ اشرف العلوم،حیدرآباد) نے’’بنیادی انسانی حقوق اورحجۃ الوداع‘‘ کے موضوع پرمقالہ پیش کیا،مولاناعبدالباسط ندوی نے’’تعمیر سیرت اوراُسوۂ نبوی ﷺ‘‘ کےاہم موضوع پراپنا قیمتی مقالہ پڑھا،ٹکنالوجی کوعصر حاضر کی دریافت اوردین سمجھا جاتا ہےاس موضوع پرپروفیسرڈاکٹر راشدنسیم ندوی (ایفل یونیورسٹی) نے’’ٹکنالوجی کی حوصلہ افزائی اور اُسوۂ نبوی ﷺ‘‘ کے عنوان پر مقالہ لکھا، اگر چہ وہ اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سےسیمینار میں شریک نہیں ہوسکے،مولاناالیاس ندوی (استاذ: جامعہ اسلامیہ بھٹکل) نے بتایا کہ حکمرانوں کودعوتی خطوط روانہ کرنا سیرت نبوی کاایک زریں باب ہے،اورعصر حاضر میں بھی اس کی ضرورت ہے کہ موجودہ حکمرانوں کواسلام کی دعوت دی جائے،انھیں دعوتی خطوط روانہ کئے جائیں۔

جناب صدر پروفیسر اسلم پرویز نےسمینار کےآخرمیں پرمغزخطاب کیااورقرآن کی روشنی میں علم کی اہمیت اورعلم کی دینی ودنیوی تفریق کوختم کرنے پر بات کی،ان کا یہ خطاب بڑا قیمتی،وقیع اوراہم تھا،مولانااشرف علی قاسمی (استاذ:المعہد العالی الاسلامی) نےکلمات تشکر ادا کئےاوراس طرح سمینار کی آخری نشست کابحسن وخوبی اختتام ہوا۔

اختتامی نشست برائے تجاویز ۲۳؍فروری ۲۰۱۶ء،مقام،پارک ہوٹل

عموماً ہوتا یہ ہے کہ مسلمانوں کے منعقدہ سمینار،کانفرنس اور جلسے جلوس وغیرہ محض اُردواخبارات کی زینت بن کررہ جاتے ہیں، ہندی اورانگریزی وعلاقائی زبانوں کےاخبارات میں اس کا تذکرہ کم ہی ہوپاتا ہے،جس کی وجہ سےمسلمانوں کےمطالبات،احتجاج کی گونج سرکاری افسران اورحکام تک نہیں پہنچ پاتی،اس میں جہاں ایک جانب قومی میڈیا کےتعصب کودخل ہے، وہیں مسلمانوں کی سہل انگاری اورقومی میڈیا کےنمائندوں کواپنےسمینار اورکانفرنسوں میں شرکت کی دعوت نہ دینے کا بھی قصور ہے،ضرورت ہے کہ ہم قومی میڈیا کےرجحانات کوسمجھیں

اورقومی میڈیا کے نمائندوں کو اپنے اجلاس میں شرکت کی بھرپور اور زوردار طریقے پر دعوت دیں ،قومی میڈیا کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے منتظمین سیرت نبوی سمینار نے قومی میڈیا کے لئے پارک ہوٹل میں علاحدہ طریقے پر کانفرنس کا انعقاد کیا،جس میں ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے علاوہ تلنگانہ اسٹیٹ کے ڈی جی پی ،آئی اے ایس ،آئی پی ایس افسران ،عیسائی پادری راجا راتھنام ،سکھ مذہبی رہنما نانک سنگھ نشتر ، بدھ مذہب کے رہنما سری کانت چندر اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے ملک و بیرون ملک کے دانشوران وعلماء شریک تھے ،اس خصوصی نشست کی صدارت بہار اُڑیسہ وجھارکھنڈ کے امیر شریعت مولانا سید محمد ولی رحمانی نے کی ۔

خصوصی نشست سے خطاب کرتے ہوئے مشہور داعی عبداللہ طارق نے تمام مذاہب کے رہنما اور اس کے پیروکاروں سے اپیل کی کہ ہم آپسی رواداری اور بھائی چارگی کو فروغ دینے کے لئے اپنے اپنے مذہبی تعلیمات کی روشنی میں مشترکہ بنیادوں پر متحد ہوں ،انھوں نے مزید کہا کہ ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام آسمانی کتابوں اور مذہبوں پر ایمان لائے ،انھوں نے دعویٰ کیا کہ ویدانت کی تعلیمات اسلام کی تائید کرتی ہیں ،اسی طرح بائبل کے دونوں عہد نامے پیغمبر اسلام ﷺ کی پیشین گوئیوں سے پُر ہیں ،اس نشست کو مخاطب کرتے ہوئے جنوبی افریقہ کے مشہور عالم دین اور جمعیۃ علمائے جنوبی افریقہ کے جنرل سکریٹری مولانا ابراہیم بھام نے فرمایا کہ اسلام کی تعلیم تمام مذہبوں اور مذہبی شخصیات کا احترام سکھاتی ہے ،انھوں نے قرآن واحادیث کی روشنی میں بتلایا کہ ایک مسلمان پر فرض ہے کہ وہ انسانی رواداری کے فروغ میں اپنا بھرپور کردار ادا کرے ،انھوں نے مزید کہا کہ اسلام کی نظر میں کسی بھی انسان کا ناحق خون بلکہ اسے معمولی تکلیف دینا بھی سخت گناہ کی بات ہے ، اسلام ہر موڑ پر تشدد اور دہشت گردی کی مخالفت کرتا ہے اور امن وسلامتی کی تلقین کرتا ہے ،انھوں نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات پر عمل کر کے مسلم اور غیر مسلم بھائیوں کے تعلقات بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں اگر پوری دنیا پیغام محمدی پر عمل پیرا ہو جائے ،مولانا بھام نے اس موقع پر حلف الفضول اور میثاق مدینہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ نبی ﷺ نے مکہ اور مدینہ میں غیر مسلم برادران وطن سے پرامن بقائے باہم کی بنیاد پر معاہدہ کیا تھا ۔

اس موقع پر میڈیا کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے رکن مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی نے داعش کو غیر اسلامی تنظیم قرار دیتے ہوئے سخت لفظوں میں دہشت گردی اور تشدد کی مذمت کی ،تاہم انھوں نے کہا کہ ضرورت ہے ان بنیادوں کی طرف توجہ دینے کی جو نوجوانوں کو تشدد کی راہ پر ڈھکیل رہی ہے ، جب ایک صحافی نے مولانا نعمانی سے سوال کیا کہ مسلم نوجوانوں کو دہشت گردی کے چنگل سے بچانے کے لئے آپ کی قیادت کیا کر رہی ہے تو مولانا نے کہا کہ ہم کانفرنسوں اور سیمیناروں اور بڑے بڑے جلسوں کے ذریعہ نفرت کی راہ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں ؛ لیکن افسوس ہے کہ قومی میڈیا ہمارا ساتھ نہیں دے رہی ہے ،اگر کسی جلسہ میں ہم پانچ لاکھ کی بھیڑ بھی جمع کر لیں تو قومی میڈیا ایک دو کالم کا کوریج بھی نہیں دیتی ؛ لیکن اگر اسلامی تعلیمات کے خلاف

چند نام نہاد لوگ جمع ہوکر دہشت گردی کی حمایت میں دو چار لفظ بھی بول دیں تو وہ میڈیا کے لئے بریکنگ نیوز ہوتی ہے اور ہفتوں اس پر ڈبیبیٹ جاری رہتا ہے، اور مسلمانوں کی شبیہ بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، میڈیا کو انصاف کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے اور اس دوہرے پن سے بچنا چاہئے، انھوں نے مزید کہا کہ میڈیا عدالت کا کام کرنے لگی ہے، جب کہ اس کا کام صرف حقائق کو اُجاگر کرنا ہے۔

سیمینار کے داعی عالمی شہرت یافتہ فقیہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ اور اسلامک فقہ اکیڈمی پہلے ہی داعش کی مذمت کر چکی ہے؛ لیکن جب تک انصاف کا صحیح توازن قائم نہیں ہوگا اور مظلوموں کو انصاف نہیں ملے گا، مسلم اسکالرس اور علماء کی اپیل کارآمد ثابت نہیں ہوگی، اس لئے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مظلوموں کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اپنا دستوری فریضہ ادا کرے، مولانا سید محمد ولی رحمانی نے اپنے صدارتی خطاب میں سیمینار کے داعی مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کو مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا کہ دنیا اگر تعلیمات نبی ﷺ پر عمل کرے تو دہشت گردی کا خاتمہ یقینی ہے، ہماری ذمہ داری ہے کہ موجودہ دور میں حضور ﷺ کی سیرت کا گہرا مطالعہ کریں اور اس کی معنویت کو سمجھیں، رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو اپنی زندگی میں اُتار کر انسانیت کی خدمت کا دل میں جذبہ پیدا کریں، چوں کہ سیرت نبی ہی خدمت کا بڑا ذریعہ ہے، انھوں نے مزید کہا کہ حضور ﷺ کی زندگی کے ہر پہلو کو اپنائیں جو انسانیت کے لئے نہایت ضروری ہے۔

واضح رہے کہ اس خاص نشست میں مخصوص دعوت نامہ کے ذریعہ سے ہی داخلہ ممکن ہوسکا، اس نشست میں شہر حیدرآباد اور ملک و بیرون ملک کے جن ممتاز دانشوروں نے شرکت کی، ان میں مولانا عباس علی جینا صدر جمعیۃ علما جنوبی افریقہ، مولانا محمد حشیم عثمانی مکہ مکرمہ، خواجہ نذیرالدین سبیلی ناظم جامعہ عائشہ نسواں حیدرآباد، مولانا غیاث الدین رحمانی مہتمم دارالعلوم رحمانیہ، اقبال احمد انجینئر، عبدالرشید اگوان دہلی، محمد عاصم قاسمی چیرمین طیب ٹرسٹ دیوبند اور تمام الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے نمائندے موجود تھے، نشست کا آغاز مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا اور اختتام پر معہد کے طلبہ نے ترانۂ ہندی پیش کیا۔

اجلاس عام ۲۳؍فروری ۲۰۱۶ء، مقام: ہاکی پلے گراؤنڈ، مانصاحب ٹینک

المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے زیر اہتمام سہ روزہ بین الاقوامی سیرت نبوی سیمینار کا اجلاس عام شہر کے ہاکی پلے گراؤنڈ مانصاحب ٹینک میں منعقد ہوا، اجلاس عام سے ملک اور بیرون ملک کے ممتاز علماء کرام اور دانشوران نے خطاب کیا، پرہجوم جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے اجلاس کے داعی عالمی شہرت یافتہ عالم دین فقیہ الامت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے دوٹوک اور بے باک انداز میں فرمایا کہ ایک مسلمان ہر مصیبت کو خندہ

پیشانی سے گوارہ کرسکتا ہے، وہ تختہ دار پر مسکراتے ہوئے چڑھ سکتا ہے، وہ اپنی جان کا نذرانہ ہنستے ہوئے پیش کرسکتا ہے؛ لیکن محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم پر حرف گیری برداشت نہیں کرسکتا، مولانا رحمانی نے کھلے اور واضح لفظوں میں کہا :

آج جو طاقتیں ہم سے مطالبہ کررہی ہیں ایسے ترانوں کا جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں، جس سے ہمارے عقیدت پر پر چوٹ پڑتی ہے، ہم کسی قیمت پر اسے برداشت نہیں کر سکتے ہیں، یہ ملک ہمارا ہے اور ہم اس کے برابر کے حصہ دار ہیں، ملک کا ذرہ ذرہ ہمیں محبوب ہے؛ لیکن یہ ہمارا معبود نہیں، ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ملک سے محبت کی تعلیم دی ہے، ہمیں ملک کی حفاظت کے لئے گردن کٹانے کا درس دیا ہے؛ لیکن ہم اس ملک کو سجدہ نہیں کر سکتے۔

اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اہم ذمہ دار شیخ ڈاکٹر عبداللہ بن محمد الغامدی نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہمارے لئے نقطہ اتحاد ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عام تھی، جس رحمت کے سائے صرف انسانوں، جانداروں کے لئے ہی خاص نہیں تھے؛ بلکہ اس کی رحمت بے جان پتھروں پر بھی محیط تھی، انھوں نے سیمینار کے منتظمین اور بطور خاص مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور مشہور اسلامی اسکالر مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہندوستان آمد کو اپنے لئے سعادت بتایا، انھوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ آپ کی زندگی چلتی پھرتی سیرت محمدی کی تصویر ہونی چاہئے، اگر ہم مسلمانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار پر اپنے کو ڈھال لیا تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں شکست نہیں دے سکتی، شیخ غامدی نے اپنی مصروف زندگی سے ہر روز کم از کم دس منٹ سیرت کی تعلیمات اپنے گھروں میں اپنے دفاتر میں یا جہاں کہیں بھی ہوں کے لئے وقف کرنے کی اپیل کی، مولانا خالد غازی پوری ندوی نے اپنے ولولہ انگیز خطاب کے دوران اُمتِ مسلمہ کو سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو سے واقف کرواتے ہوئے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والوں کو بخشا نہیں گیا، انھوں نے بتایا کہ حکمت عملی کے ذریعہ اقدام کی ضرورت ہے، انھوں نے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو لازمی کر لینے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ جب تک ہم سیرت کے آئینہ میں اپنی زندگی کو نہیں سنوارتے، کامیابی ممکن نہیں ہے، مولانا خالد غازی پوری ندوی نے کہا کہ سرزمین حیدرآباد پر اختلافات کے خاتمہ کو یقینی بنائیں اور دیوبندیت، بریلویت، سلفیت کے نام پر ہونے والے اختلافات کو ختم کیا جائے، طیب ٹرسٹ دیوبند کے چیرمین حافظ محمد عاصم قاسمی نے سیرت نبوی کو عملی زندگی میں لانے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں ہمیں خود احتسابی کی ضرورت ہے، غلط فہمیوں کی بنیاد پر جو آپسی دوریاں ہیں، اسے خدمت خلق کے اسٹیج سے کم کر سکتے ہیں، مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی نقشبندی نے اپنے خطاب کے دوران کہا کہ نفسیاتی اعتدال کی تربیت حاصل کرنے والی اقوام اطمینان کے ساتھ فیصلے کرتی ہے، کسی فرد بشر پر اتنے مصائب نہیں آئے جتنے نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر آئے ہیں؛ لیکن

نبی اکرم ﷺ نے کبھی مایوسی کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی خوفزدہ ہوئے، مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی نے اُمتِ مسلمہ کو مشورہ دیا کہ وہ غصہ یا خوفزدہ ہونے کے بجائے ہمت سے حالات کا مقابلہ کریں، اللہ سے تعلق کو مضبوط کرتے ہوئے اطمینان قلب حاصل کریں، دنیا میں مسلمانوں کے لئے اس وقت سخت ترین حالات ہیں؛ لیکن ان کے مقابلہ میں ہمیں برہمی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے؛ بلکہ حکمت وہمت سے کام لیتے ہوئے فیصلے کرنے چاہئے، اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے نیپال کے مشہور عالم دین اور جمعیۃ علمائے نیپال کے جنرل سکریٹری مولانا خالد حسین صدیقی نے کہا کہ اُمت کو اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا چاہئے یہی حکم محمدی ہے اور یہی اُسوہ نبوی ہے، انھوں نے بطور خاص علماء اور ائمہ سے دردمندانہ اپیل کی کہ وہ آپسی خلیج کو پاٹیں اور فروعی مسائل کو اپنے خطبات کا موضوع ہرگز نہ بنائیں، اجلاس عام میں شہر حیدرآباد اور اطراف حیدرآباد سے نسبت محمدی کی اور ذات نبی ﷺ سے اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک بھیڑ اُمنڈ پڑی تھی، محتاط اندازے کے مطابق 5000 سے زائد تھی اس کے علاوہ خواتین بھی بڑی تعداد میں شریک اجلاس تھیں، اس اجلاس عام میں جن اہم مقررین نے خطاب کیا اس میں حیدرآباد کے معروف دانشور اور اسلامی اسکالر اقبال احمد انجینئر، کشمیر کے بڑے عالم دین مولانا رحمت اللہ کشمیری، دارالعلوم دیوبند کے مولانا شاہ عالم قاسمی گورکھپوری، امیر شریعت بہار واُڑیسہ مولانا سید محمد ولی رحمانی، مولانا سعید الرحمٰن ممبئی، جنوبی افریقہ جمعیۃ علماء کے جنرل سکریٹری مولانا محمد ابراہیم بھام وغیرہ قابل ذکر ہیں، اس کے علاوہ امیر ملت اسلامیہ آندھرا پردیش مولانا شاہ جمال الرحمٰن مفتاحی، مولانا صادق محی الدین فہیم، مولانا حافظ خواجہ نذیر الدین سبیلی، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے شیخ حسام الشریف وغیرہ اسٹیج پر موجود تھے، آخر میں صدر اجلاس امیر شریعت کرناٹک مولانا مفتی اشرف علی باقوی نے اپنے مختصر خطاب میں فرمایا کہ رحمت للعالمین ﷺ کے اُمتی ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی حسن اخلاق اور کرم کا معاملہ فرمائیں، فروعی مسائل میں صحابہ کرام کو اپنا نمونہ بناتے ہوئے اختلاف سے حتی الامکان گریز کریں اور مضبوطی کے ساتھ اللہ کی رسی کو پکڑیں، اجلاس کا آغاز قاری عبداللہ کلیمی کی تلاوت قرآن کریم سے ہوا، جب کہ بارگاہ رسالت میں نذرانہ عقیدت مولانا خالد ندوی متعلم معہد نے پیش کیا، نظامت کے فرائض مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی رکن 'الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین' دوحہ قطر نے انجام دیا، اجلاس کا اختتام مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے مہتمم مولانا حشیم الدین عثانی کی رقت آمیز دُعا پر ہوا۔

مہمانوں کی روانگی

سیرت نبوی کا سمینار اختتام پذیر ہو چکا ہے، اب سمینار کا سب سے مشکل مرحلہ درپیش ہے، سمینار کی ابتداء میں یوں تو جوش وخروش رہتا ہے اور تمام مہمانوں کا استقبال بھرپور طور پر ہوتا ہے؛ لیکن آخر آخر میں حالت ایسی ہوجاتی ہے کہ کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہتا اور مہمان جب جانے لگتے ہیں تو بالکل کسمپرسی کی حالت ہوتی ہے، حضرت

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے معہد کے طلبہ کو اس سلسلے میں پہلے ہی خبردار کردیا تھا کہ جس محبت اور جوش سے ہم مہمانوں کو خوش آمدید کہیں گے، اسی گرمجوشی کے ساتھ ہم مہمانوں کو رخصت بھی کریں گے اور کسی بھی لمحہ کسی بھی مہمان کو یا سمینار کے مقالہ نگاروں کو، شرکاء کو یہ احساس نہیں ہونا چاہئے کہ انھیں پوچھنے والا کوئی نہیں، اور یہ کہ وہ روانگی کے وقت حیران و پریشان ہوں، طلبہ معہد نے حضرت مولانا کی بات کا پورا پاس ولحاظ رکھا اور تمام مہمانوں کو ان کے مقررہ اوقات پر ریلوے اسٹیشن اور ایئر پورٹ تک رخصت کرنے گئے اور مہمان بھی طلبہ کی محبت، جاں سپاری اور خدمت وخلوص کے معترف نظر آئے۔

حرفِ سپاس

ارشادنبوی ﷺ ہے: ''من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ'' جو بندوں کا شکرگزار نہیں، ان کے احسان کا معترف نہیں وہ خدا کا ناشکرا اور احسان ناشناس ہوگا، اسی ارشادنبوی کی تعمیل میں چندحروف لکھے جارہے ہیں، ہم بصمیم قلب ان تمام افراد اداروں اور تنظیموں کے شکرگزار ہیں جنھوں نے دامے درمے قدمے سخنے سیرت سیمینار میں تعاون کیا، سیمینار کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی پرخلوص کوشش کی اور جانی ومالی تعاون دیا؛ چوں کہ ایسے افراد کی تعداد کم نہیں ہے اور فرداً فرداً سبھی کا نام لینا مشکل بھی ہے اور نامناسب بھی، ایسے بھی انھوں نے یہ تعاون جس ذات کی رضا کے حصول کے لئے کیا، وہ ذات ان کے نام اور کام سے بخوبی واقف ہے، ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سیرت سیمینار سے وابستہ تمام افراد کو دین ودنیا میں سرخرو فرمائے اور ان کی تمام جائز تمناؤں اور ارادوں کو پوری فرمائے۔ آمین

آخری بات

اگر عصری پیمانے اور معیار کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سیرت نبوی سمینار کامیاب رہا، بیش قیمت موضوعات پر مقالے پڑھے گئے، سیرت نبوی پر کام کی نئی جہت اور سمتیں سامنے آئیں، سیرت نبوی کے نئے گوشے وا ہوئے؛ لیکن حقیقت میں سیرت نبوی سمینار کی کامیابی یہ ہوگی کہ لوگوں نے جن باتوں کو سنا ہے، اس کو اپنی زندگی میں لائیں، رسول اللہ ﷺ کے اخلاق وکردار پر عمل کریں اور ان کا نام نہیں؛ بلکہ ان کا اخلاق اور کردار بتائے کہ یہ مسلمان ہیں، ان کے معاملات اور لین دین بتائیں کہ یہ شریعت اسلامی پر عمل کرنے والا ہے۔

• • •